

دل کے داناؤں کے لیے، زندگی کی تصویریں

کراچی

پچی کہانیاں

March
2016

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پرائز نمبر 1

PDFBOOKSFREE.PK

☆ ”مسلم ہے“ قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ اہل اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سچی کہانیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانئ سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان / دانیال شمسی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رکن آل پاکستان نڈز بھیجے زسوامتی
رکن کونسل آف پاکستان نڈز بھیجے زایہ طرز

MEMBER
APNS
CPNE

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مذہب ایڈیٹری (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کرشل

ڈیفنس فیئر-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے * جلد: 33 - شمارہ: 03 * مارچ: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پہلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی ٹھیکل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



07 الفاظ کھو گئے
منزہ سہام



42 سترہواں مسافر
محمد سلیم اختر

ایک ایسے ڈرامیورکس خوف جتنی جسے تیز رفتاری پر خوب مہارت تھی مگر.....

68 گم شدہ چہرہ
شانی خامان

اس لڑکی کی لرزادہ دینے والی خوف جتنی جس کا چہرہ ہوائی مخلوق لگتی تھی

82 ہانڈی
شانستہ انور

اس معصومہ و شیرہ کی دہشت ناک کہانی جس کی اور کے نام کی موت مل گئی تھی

102 سرخ لیموں
محمد یوسف لغاری

اس نوجوان نے ایک ایسی لفظی کر ڈالی جس کا خمیازہ اسے تا عمر بھگتنا پڑا

122 دوسری دنیا کا عشق
منعم اصغر

اس دو شیرہ پر بچپن ہی میں ایک جن عاشق ہو گیا تھا مگر.....

08 احوال
کاشی جوهان

قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دل چسپ سلسلہ

51 معاف کردو
ضابشری

چھوٹی بہن پر کالا جادو کرادیے والے ایک شخص کا قصہ عبرت

72 بھوک
رضوانہ پرنس

اُس دو شیرہ کو اچانک ہی وہ بھوکے مل گئے تھے اور.....

87 ایک تصویر ایک کہانی
ذانیال شمسی

آکھ کے کمرے میں محفوظ ہو جانے والے سچی کہانیاں میں پہلی بار ہم ان مناظر کو اپ فراموش نہیں کر سکتے

112 سنیو لیے
علی حسنین تابش

حاسدوں کے شر سے نقلی ایک روح فرسا خوف جتنی

257 آٹھ کہانیاں اک کردار
فرح انیس

ایک دو شیرہ کے ساتھ پیش آنے والی پراسرار انہونیائیں

35 لائف بوائے
اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں اپنے اندر کہانی کے راز پنہاں رکھتی

62 روم نمبر 607
نفیسہ سعید

اٹلی میں پیش آنے والا قصہ کلام اللہ کی طاقت کا پیش غیر

79 عرشی کون تھی؟
نادیہ ملک

چار ماہ تک ایک ملازمہ کے درمیان وہ کس کے ساتھ رہے

88 ہم شکل
ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار ہم ان مناظر کو اپ فراموش نہیں کر سکتے

116 تمہارا ساتھ تھا
نازبہ بتول رضا

ان جنات کا قصہ خاص جوانوں کے دوست بن کر رہنا چاہتے تھے

257 تیر نیم کش
قارئین

قارئین کی جن جنہی کو آزما تا ایک دلچسپ سلسلہ

131 اک ہل میں سب کچھ
برہت ناز

ایک ایسا قصہ جو یقیناً آپ کی ٹھنڈا کر دے گا

150 کیسا یہ راز ہے
ارشد سہر جوهان

اللہ آدھشت کی کھانسی جسے اس کے ملازم نے ہام عروج عطا کر دیا

176 سب کچھ تیرا ہے
ارد خان

اس رات اگر وہ بکٹی میں بیٹھ کر اپنے دل کی بات کہتا ہے

186 مینا دے یا... مایا
سید فاروق مددنی

ایک کہانی جس سے مایا کی لبت مانت مانت رہی تھی

192 بادبان
اسمان اسحق

اس سال ملاحد ناول، جو زندگی کا ایک نئے جذبے کا سفر کرانے کا

224 زہر عشق
کاشی جوهان

دول اور رگوں میں ابو جہاد نے اسے مناظر سے بھر پور نیا سلسلہ

134 مہانتا ناگ
تحسین جویجو

قدرت کا عجیب رنگ دکھائی دہریلی دنیا سے امرت بھری تحریر

154 ہماری آدھوری کہانی
کشفاف اقبال

اُس ریڈیو آر جے کی جج جتنی جس کا ملن اس جہاں میں آدھوارہ گیا تھا

179 وہ بڑھیا کون تھی؟
سیدہ حجاب فاطمہ

تیز خوشبوؤں کی شوقین ایک دو شیرہ کی خوف جتنی

188 پچھل پیری
بینسیر احمد بھٹی

بہاول پور سے ایک خوف جتنی

206 متنی باجی
جاوید راہی

اُس عورت نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے شیطانی طاقتوں کو قابو کر لیا تھا

242 مسئلہ یہ ہے
ادارہ

آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

138 آدم خور
ملک صفدر عباس اعوان

اُس شخص کا قصہ جو آدم خور بن کر زندہ انسان کھاتا تھا

162 بھارت میں بلیک لسٹ
محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے 'سفر نامہ' بھارت

182 نجات
المناس فاطمہ امان

اس جائے فروش کا قصہ 'عجب' جس نے چالیس سال سے بکٹی روں کو

190 حلوہ کھاؤں گی
محمد اسامہ

اُس جوڑے کو خدا نے اولاد تو دی لیکن.....!

213 حسد کی آگ
ممتاز احمد

ٹرین سے ناگھیں کٹ جانے والا شخص آج بھی لوگوں کو پلیٹ فارم پر.....

252 ہائیڈ پارک
ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آدھو گوشہ جسے قارئین خود تریب دیتے ہیں



الفاظ کھو گئے

آج دوسری بار الفاظ ساکت ہو گئے ہیں۔ دل بچوں کی طرح بچل رہا ہے کہ کسی طرح وقت کا پیہر الٹا گھوم جائے وہ ہنستے مسکراتے چہرے دوبارہ واپس لاسکوں جو میری طاقت تھے۔ جن کے ہونے سے میں بالکل اسی طرح محفوظ تھی، جیسے تھیل کے دبیز غلافوں میں کوہ نور ہیرا..... جیسے سمندر کی تہہ میں موجود سیپ میں موتی..... میری ہر خوشی پر جن کے چہرے کھل جاتے تھے اور میری ہر پریشانی بتائے جو محسوس کرتے تھے۔ وہ دونوں چہرے منوں مٹی تلے کیسے جاسوئے۔ اب سر پر کھلا آسمان ہے اور پیروں تلے پختی ہوئی زمین..... ابو کے بعد بیجا ہی میری سب کچھ تھیں۔ میری ماں، میری دوست، میری غم گسار!! ان کے پاس جا کر میں اپنی ہر پریشانی ان کے حوالے کر کے ہلکی پھلکی ہو کر اٹھتی تھی۔ ہر انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں میں جب پریشان تھی تب اُن کے پاس جا کر ٹھہر گئی تھی اور وہ دو دن میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں ان ہی دونوں کو لے کر جیتی چلی گئی۔ شدید بیماری کے آیام میں جب وہ کسی کو بھی نہ پہچانتی تھیں تب کسی کے پوچھنے پر کہ ”بیجا بتائیں یہ کون ہے؟“ میرا ہاتھ تھام کر غور سے میری آنکھوں میں کچھ سیکنڈ دیکھا اور کہا ”منیزہ“ ہے۔ بس اسی دن انہوں نے مجھے مجھ سے ملوایا۔ میں اپنی اس پیاری سی خالہ کے احسانوں کا بدلہ تو کبھی نہیں اُتار سکتی مگر کوشش ضرور کروں گی۔ جو محبت، خلوص، رواداری، حسن سلوک اُن سے پایا وہ ان لوگوں کو ضرور لوٹا سکوں جو ان سے محبت کرتے ہیں۔ یا جن سے وہ محبت کرتی تھیں۔ اللہ میری بیجا کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مجھے اس نقصان عظیم کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

منزہ سہام

میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدارین کو ملک کو
ذیبادادہ پیش کیجیے

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

کویت	55 امریکی ڈالر	ایران	55 امریکی ڈالر
سعودی عرب	55 امریکی ڈالر	سری لنکا	55 امریکی ڈالر
یو اے ای	55 امریکی ڈالر	جاپان	55 امریکی ڈالر
مصر	55 امریکی ڈالر	لیبیا	55 امریکی ڈالر
یونان	55 امریکی ڈالر	ڈنمارک	55 امریکی ڈالر
فرانس	55 امریکی ڈالر	جرمنی	55 امریکی ڈالر
برطانیہ	55 امریکی ڈالر	ہالینڈ	55 امریکی ڈالر
ناروے	55 امریکی ڈالر	پولینڈ	55 امریکی ڈالر
امریکہ	65 امریکی ڈالر	کینیڈا	65 امریکی ڈالر
افریقہ	65 امریکی ڈالر	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالر

ذرا سا لکھ

آج ہی رابطہ کیجیے || 88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو!

ہم خدا کی بنائی شاہ کار تخلیق ہیں۔ ہم اشرف المخلوق ہیں۔ مگر اس اشرف مخلوق میں بھی کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں۔ جو قریب ہوں تو بھی اپنی ہوتی ہیں اور جو دور ہو جائیں تو اور بھی زیادہ اپنی ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک عظیم ہستی..... فاطمہ ثریا بیگم بھی تھیں۔ بچپان سے ہمارا تعلق روح ایسا ہے۔ وہ ہر اول دستے کی طرح ہمیشہ ہمارے آس پاس رہیں۔ اب ہماری بیگم ہم میں نہیں۔ ہم لاکھ خیال کو وجود دے کر انھیں ڈھونڈتے رہے۔ دعائیں پھونکتے رہے۔ مگر..... ملنے کے کہیں نایاب ہیں ہم بیگم چلی گئیں اور جاتے سے بھی بیگانے یوں موت کو گلے لگایا کہ سب عبادتیں تراشتے رہے اور بیگم نے نوری خلد پہن کر آسمانوں تک رسائی حاصل کر لی۔ وہ 11 فروری 2016ء کی جمعرات کا دن تھا۔ جس دن بیگانے زمین سے پردہ کر لیا۔

ساتھیو! دل جو وصل ہے لیکن بیگم کے دیے ہوئے حوصلے نے ہمیں ہمیں گریا ہے۔ اور پوری توانائیوں کے ساتھ محبت کے دیپ جلاتے ہم اپنے احوال کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کے محبت بھرے ناموں سے پہلے بھائی مجید احمد جانی سے کچھ کہتا ہے۔ بھیا! آپ بہت اچھا لکھتے ہو۔ کوئی شک نہیں۔ امید ہے کچھ گئے ہو گے۔ بات اگر لکھاری کی ہو تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر جب معتبر اشخاص اور ادارے الٹی اٹھانے لگیں تو سمجھیں کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ پیارے بھائی امید ہے جلد آپ اس بات کی وضاحت کریں گے۔ تب تک آپ سے معذرت! آپ ہماری بات یقیناً سمجھ گئے ہوں گے۔ محفل میں سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔ کوہاٹ سے ہمارے بہت عزیز ساسی سید ملازم حسین لکھتے ہیں۔ آپ سچی کہانیاں کا رسالہ ارسال کرتے ہیں۔ میرے لیے بڑی سہولت ہے جیل میں بعض اوقات ذاتی چیزوں کا حصول اور ضروریات نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ آپ کا بہت شکر ہے میری ارسال شدہ کہانی ”فراڈ کینی“ ماہ جنوری میں شائع ہوئی بہت عنایت۔ ماہ جنوری کا شمار بہت خوب صورت ہے کہانیاں جاندار اور دلچسپیوں کی حامل ہیں۔ احوال میں دوستوں کی اٹھکیلیاں، سب گینگٹوں کی طرح پائیدار چڑی ہیں۔ یہ سب آپ کی مدیرہ اعلیٰ اور تمام اشاف ممبران کی انتھک محنت، کاوشوں اور لگن کا نتیجہ ہے۔ کہانیوں پر تبصرے تفصیلی طور پر کرنے کے لیے بہت جی چاہتا ہے۔ لیکن کاشی چوہان صاحب کی تیز طرار اور رکات دار بیٹی سے ڈر لگتا ہے۔ مختصر اعراض ہے۔ منظرہ سہام صلیب کا ادارہ ”تجدید عہد وفا“ انسانی جذبوں کی عکاسی کرتی خوب صورت تحریر ہے۔ دل میں اترتی..... واقعی انعام کی مستحق، عشق زادے، محبت لافانی ہے، سوچ میں ڈوبی کہانی، گرہن لگا جیون، فرحت صدیقی، عبرت ناک، بہترین تحریر، انوکھا نشہ، ارم ناز، نہایت شاندار، میں نے کہا لکھنا نہ چھوڑنا ایک دن کامیاب لکھاری بنیں گی۔ انعام یافتگان میں آپ کا نام منہ بولتا ثبوت ہے۔ مبارک باد مجید احمد جانی، آپ کی بیان کردہ واردات نے بہت ڈکھی کر دیا۔ ”دیکھ میرا نصیب“ از قلم ممتاز احمد۔ بھارت میں بلیک لسٹ احمد دھام خوب لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت، خوب سے خوب تر سلسلہ دار کہانی

”زہر عشق“ کاشی چوہان کی خدمت میں میری طرف سے ایوارڈ..... ”میٹ رائٹر فار ایور“ ”وٹا شا“ اقبال بانو کے قلم سے شاندار۔ آخری دعا ”از فیضہ آصف خان، ان سونا گا بھی بازاروں میں کتنی معصوم اور مصیبت زدہ دو شیراز میں مکروہ بد قماش ہوں پرستوں کا نشانہ بنتی ہیں۔ معاشرہ خاموش۔ مجھے موت چاہیے، محمد سلیم اختر، تحریر شاندار ہے، ماشاء اللہ۔ وفا میں۔ اشفاق شاہین کے قلم کی کاٹ دار کہانی۔ دیگر کہانیاں بہت دلچسپ ہیں۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیریم کش، لائف بوائے بہت بہتر ہیں۔ آخر میں مجید احمد جانی، صائمہ مجید، ممتاز احمد، مور شاہد حسین، سونیا خان بہت مشکور ہوں کہ ہم جیسے پس زندان لوگوں کو دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ آپ کے لیے شکر یہ جیسے الفاظ پہنچ ہیں۔ خوش رہیں اجازت چاہتا ہوں۔

☆: پیارے بھائی! آپ کا تبصرہ اتنا خوب صورت ہے کہ میرے پاس لفظ نہیں۔ کہانیاں جلد شائع ہوں گی۔ آپ کی بھیجی ہوئی کہانی پر اسرار نہیں تھی۔ لیکن جلد شائع نہیں ہوگی۔

✉: بھابھاپور سے ہمارے سنے ساتھی عثمان بلوچ احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے میں ان تمام قلمی دنیا میں رنگ بھرنے والوں کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے اپنی محنت کی راہ اور سچ پر رواں دواں رہ کر ایوارڈ حاصل کیا۔ تعلق خاطر اور بلا کی محبت رکھنے والے، نزاہت افضال، ممتاز احمد، ارم خان، ڈاکٹر خادم حسین کھٹرا، سونیا خان، مجید احمد جانی اور جملہ احباب کا میں ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں ہمیں یاد رکھا۔ ”کراس ناٹنگ“ ٹھکانہ، انوکھا نشہ، شہید، یاد رکھیے گی دنیا وہ بلی کا بچہ، دیکھ میرا نصیب، علان، جدانہ ہوں گے، ہم شکل اور زہر عشق، شعور، بلندی، اور..... ارادوں کو چھتکی بننے والی تحریروں میں۔ کاشی بھیا! آخر میں آپ کو محبت بھرا اور پیارے سبب السلام، زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ تک اجازت۔

☆: اچھے عثمان! محبت کے جام کو جام جم کرنے پر تمہارا شکر یہ! احوال کی رونق تو تم سب ہی ہو پیارا! بس باقاعدہ رہا کرو۔

✉: گوشتے احوال کی نذر یہ تبصرہ کر رہی ہیں۔ غزالہ زہت فاطمہ، عرض کرتی ہیں۔ میرا نام غزالہ زہت فاطمہ ہے۔ میں سچی کہانیاں کراچی کی اشاعت سے۔ جب انکل سہام مرزا اور دانش دیوئی انکل بقید حیات تھے۔ پھر حالات نے کچھ آٹھویں چلا دیں کہ میرا بہت کچھ حالات کی آگ میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ میں اپنا سب کچھ بھول گئی۔ صرف سچی سچی راکھ اور دہلی دہلی چنگاریوں کی گرمی سے میری سانسیں چل رہی ہیں۔ ہوا یوں کہ میں چند روز قبل رسالوں کی ایک دکان پر گئی تو سانسے ریک پر پڑا سچی کہانیاں کراچی مجھے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے خرید لیا۔ بڑھنے سے پتا چلا کہ منظرہ سہام مرزا کی زبردات رسالہ بڑے نام بھام سے چل رہا ہے۔ مزید سننے اور قابل لوگ ان کی معاونت کر رہے ہیں۔ رسالہ خود بتاتا ہے کہ جناب کاشی چوہان، دانیال کشی اور ذین کی جیسے ذہین نوجوان اس کی ٹوک پلک سنوارتے ہیں۔ میں نے بھی بہت سی کہانیاں لکھی تھیں جن میں سے کچھ نے انعامات بھی حاصل کیے۔ ہامناہہ دوشیزہ بھی میں میری ایک دو کہانیاں چھپی تھیں۔ زیر نظر کہانی میں نے چند سال پہلے ہی سچی اب کہانی کی صورت میں آپ کو ارسال کر دی ہوں۔ دیکھیں ٹی لسل اسے کسی نظر سے دیکھتے ہیں۔

☆: بہت محترم غزالہ جی! یقین کیجیے جب پرانے ساتھی پھر سے ہماری طرف آتے ہیں تو الگ ہی رنگ بنتا ہے۔ آپ کے موتیوں سے الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ نے ہم سے دور رہ کر ہمارے ساتھ کس بلا کی زیادتی کی ہے۔ ہمیں آپ کی محبت کی حرارت کی اپنے کام کو بہتر طور پر سر انجام دینے کے لیے از حد ضرورت ہے۔ وعدہ کیجیے کہ اب آپ ہم سے ناٹائیں توڑیں گی۔

✉: ٹھابوں کی ٹکری، چوکی سے ہمارے ساتھی محمد تم عباس میوانی شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اشتہارات نظر انداز کرتے احوال کی پر رونق بزم میں حاضر ہوا۔ جہاں پھول، ہلکیاں مسکراتی دل بھاتی نظر آئیں۔ نئے مہمانوں کو خوش آمدید

ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں...

ہمتیں مجتمع تھیں

آہ!

وہ اک سایہ تابندہ

فاطمہ ثریا بجیا.....

جس کی اک ذرا سی سخن فہمی سے

’کارواں راہ بھول جاتے تھے‘

بس!

’ہم تمہارے ہیں‘ کہہ کر

ہمارے ہو جاتے تھے!.....

آج!

وہ درخشش ستارہ

زمین چھوڑ کر

آسمان کا ہوا

بجیا..... اب ہم میں نہیں

وہ! اک رشتہ جاں بلب

جس کے ہونے سے.....



اناللہ وانا الیہ راجعون

1930ء-2016ء

یعنی امتیاز عاصم، شہر قمر، باقی کاشی بھائی یہ سب مہکتے پرانے پھول کدھر غائب ہیں۔ کاشی بھائی مجھے غصے سے مت گھوڑے چلیز میرا کوئی دوش نہیں۔ پچھلے ماہ تین تاریخ کو اس بھرہ کو ارسال کر دیا تھا مگر کھایا اسے محکمہ ڈاک۔ احوال کی محفل میں بابا مجید جانی (بابا جی آپ کے ایکسٹنٹ کانس کر افسوس ہوا، خدا آپ کو صحت کاملہ دے۔ اور آپ کی اسٹوری۔ آف۔ اپنے ہوس دار عیب کو چھپانے کی خاطر معصوم کا انتہائی سفاکی سے قتل وکلوے کرنا رالایا، آئی صلیحہ (اللہ تعالیٰ آپ کی ولی مراد پوری کرے گا میں بہت دعا گو ہوں۔ ملیں سوگت پھلیاں دس ہیں اب) سدرہ انور علی، کنزہ ملک، واقعی جاندار مخلص والا تبصرہ تھا۔ بھائی ملازم حسین شیرازی میری اسٹوری کی پسندیدگی کا شکریہ۔ (اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔ اسٹوری اچھی تھی) خادم حسین کھیز، ارم ناز، راشد لطیف، علی حسین تابش، ممتاز احمد، ٹھکانہ شاہد رفیق اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ وقفا سنا (کہانی جہالت کی عکاس ہے) اشتقاق شاہین کی اچھی اسٹوری تھی۔ زہر عشق واہ بھی واہ، ہر قسط نیارنگ دکھارہی ہے۔ ایک لڑکی اور اب تین امیدوار، کیا کرتا ہے کاشی بیٹا نے دیکھتے ہیں۔ اپنی اپنی بات، نزہت ناز (ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق قیاس کرتا ہے) باقی بڑھی نہیں تو تبصرہ کیا۔ ایوارڈ کی سب کو مبارک!۔

ملکہ: لو پھولوں کی مگر کی کے شہزادے اب خوش ہو جاؤ۔ تبصرہ بہت تاخیر سے ملا لیکن..... شکر ہے پھر بھی مل ہی گیا۔
 [۱۰]: ہمارے بہت پیارے لکھاری محمد ابو ہریرہ بلوچ، بہاول نگر سے لکھتے ہیں۔ پچھلے ماہ احوال کی محفل میں شرکت نہ کر سکا۔ وجہ محکمہ ڈاک ہے کیونکہ بر وقت تبصرہ بھیج دیا تھا۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ (اس بار بھی ایسا ہی ہوا، چلیے کوئی بات نہیں) دعا گو ہوں کہ نیا سال سب کے لیے خوشی اور امن کا باعث ہو۔ شمارہ کافی تاخیر سے ملا وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ اچھا نہیں۔ ٹائٹل گرل کا انتخاب عمدہ رہا۔ جن احباب نے یاد کیا ان کا شکر گزار ہوں۔ خصوصاً سہیل صاحبہ، ایم اشتقاق، سلیمان شہیر، سدرہ انور علی، ارم خان، نصیر فضل، نعیم اللہ، ڈاکٹر خادم حسین، کنزہ ملک، مجید احمد جانی، راشد لطیف، بھائی صائمہ مجید، سونیا خان، ممتاز احمد، ان سب نے اسٹوری کو پسندیدگی کی سند سے ہمکنار کیا خوش ہوئی۔ سدرہ انور علی، کنزہ ملک، ممتاز احمد، مجید احمد جانی کے تبصرے پسند آئے۔ امتیاز عالم، شہر قمر کو بی بی آر مد پر خوش آمدید۔ کہانیوں میں سیما غزل نے امریکہ سے دکھ بھری داستان لکھ کر رالایا۔ فرحت صدیقی لندن سے گرہن لگا جیون لیے نظر آئیں۔ کاشی بھائی ہماری مبارک باد لندن پہنچا دیں۔ بہت عمدہ لکھا بہترین کہانی۔ ایڈیٹر اور اسٹیج مشق زادے۔ آپ بھی مبارک بادی کے سچے ہیں۔ اس کے علاوہ شاہد رفیق سہو کی ٹھکانہ، ارم ناز صاحبہ کی انوکھا نشہ، اشتقاق شاہین کی وقفا سنی، صائمہ بشیرہ بی کا پچھ، اپنی اپنی بات، نزہت ناز صاحبہ، مجید احمد جانی، یاد رکھی گئی۔ دیکھ میرا نصیب ممتاز احمد کہانیاں پسند آئیں۔ قسط دار کہانیاں ہم شکل، زہر عشق بھی زبردست جارہی ہیں۔ تیرنیم کش میں ساتھیوں کے انتخاب پسند آئے۔ اب انشاء اللہ پھر حاضری ہوگی اور مسلسل ہوگی۔ خدا حافظ۔

ملکہ: پیارے ہریرہ! لو تمہارا تبصرہ بھی لیٹ ہو گیا۔ اس ماہ تو پرچہ وقت پر مل گیا نا۔
 [۱۰]: جہانیاں سے عرصے بعد یہ آمد ہے ہمارے سامنے ملک صفدر عباس اعوان کی۔ لکھتے ہیں۔ ڈیزسز کاشی چوہان..... آداب! جنوری کی ایک شدید سرد اور دھند سے لپٹی۔ سپر میں کچی کہانیاں کے آنے کی اطلاع ملی۔ دل چل اٹھا۔ مگر اتنی سردی میں باہر نکلتا قدرے مشکل امر تھا۔ دل نے شرمندہ کیا کہ نہیں کراچی سے یہاں تک چلا آیا ہے۔ اور تم کچھ منٹ کی مسافت نہیں طے کر سکتے۔ شاپ چاہیے۔ رسالہ ملا تو ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں میں گرمی سی آنے لگی۔ رسالہ پڑھنے کی ابتدا کی اشتہارات کو یکسر انداز کرتے ہوئے آٹنی منزہ سہام کے ادارہ پر چاہیے۔ ان کا ادارہ میں موجودہ دور کی عکاسی ہی ہوتی ہے۔ احوال کی محفل میں انٹری ماری۔ پرانے اور نئے احوالوں کو ہمارا سلام۔ میڈم تحسین صاحبہ کے والد گرامی کانس کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم بھی وہ لمحے بھول نہیں پائیں گے جب ہمارے بابا جانی دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ واپس رسالہ کی طرف آتے ہیں۔ سلسلہ وار

سانحہ ارتحال

ہمارے دیرینہ رفیق، کوآرڈینیشن آفیسر APNS محمود احمد کی اہلیہ گزشتہ دنوں رضائے الہی سے انتقال کر گئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز دھک کی ان گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے اور لواحقین کے لیے صبر کی استدعا ہے۔

✽: ہماری بہت اچھی بہن نازیہ بتول رضا، کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اتنا اچھا پر اسرار نمبر شائع کرنے پر مبارکباد۔ منترہ سہام مرزا کا تجدید عہد وفا آنکھیں نم کر گیا۔ یہ ایک سال قبل 16 دسمبر کو جو سانحہ ہوا وہ آج بھی خون رلا کرتا ہے اور غم ہمیشہ تازہ رہے گا۔ دوشیزہ رائٹر ظہیرا نے کی تصویریں دیکھیں بہت اچھا لگا، دراصل ایک لکھاری کو مان اور محبت کے سوا کچھ اور چاہیے بھی نہیں، یہ شخصیت بہت قیمتی ہیں۔ میں بے حد مشکور ہوں کہ ممتاز احمد جیسے لکھاری نے میری کہانی قدرت کو سراہا، اس کے علاوہ شازید گل، سدرہ انور، سلیمان شبیر، مجید احمد جانی، صائمہ مجید، مسز نوید ہاشمی، سنبل کٹڑہ ملک اور عثمان بلوچ آپ سب کا بے حد شکریہ کہ آپ سب نے میری ناسی کی کاوش کو سراہا اور مجھے حوصلہ دیا۔ تمام نئے اہلوانوں، قاریوں اور لکھاریوں کو خوش آمدید۔ آخر میں تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد۔ بالخصوص ایم اے راحت، احمد سجاد باہر، اقبال بانو، ممتاز احمد، ارم ناز اور جاوید راہی صاحب کو ڈھیروں مبارکباد بتول۔ اللہ پاک آپ کو احوال کا مہیا بل عطا کرے آمین۔ ماہ جنوری کی تینوں انعام یافتہ کہانیاں زبردست رہیں سیماء غزل، فرحت صدیقی، ایشیہ اور یسین جی کیا خوب لکھا اس کے علاوہ ٹھکانہ، مجھے موت چاہیے بھی اچھی لگیں باقی اچھی نہیں تھیں مگر زہر عشق بہت زبردست ہے۔ اچھا اب اجازت آپ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✽: آئی جی انہیں آپ کی محبت کی اشد ضرورت ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں اور ہاں ہو سکے تو احوال میں ضرور یاد رکھا کریں۔

✽: کراچی سے ہماری لکھاری ساتھی منزل خان لکھتی ہیں۔ جنوری کے شمارے میں سنبل، ایم اشفاق بیٹ، افضل، نعیم اللہ، شانوار تبسروں کے ساتھ احوال میں شامل تھے۔ سدرہ انور علی اور ممتاز احمد آپ کی دعا میں مددگار ہوئی ہیں، بہت شکریہ آپ کا۔ سلیمان شبیر، خادم حسین، کٹڑہ ملک، مجید احمد، راشد لطیف، صائمہ مجید تبصرہ لکھنے کے لیے تہ دل سے مشکور ہوں۔ ”جی کہانیاں“ رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو ڈھیروں مبارکباد۔ ہدائت ہوں گے، کہ ربن لگا جیون، محبت موت چاہیے، علاج، وفا کیسی، پشیمان، وہ بلی کا بچہ، وٹا سا، آخری دعا، دیکھ میرا نصیب، بہت اچھی تحریریں ثابت ہوئیں۔ جبکہ عشق زادے، انوکھا نش، کیا سے کیا ہو گیا، اسنیپ چیکنگ، اچھی سیماء، آخری چوری بھی خوب صورت تحریریں تھیں۔ باقی مستقل سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے ساتھ اگر زندگی اور کاشی بیانیہ وفا کی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔ اللہ آپ سب کو اپنی حفظ و آمان میں رکھے۔

✽: احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن روبینہ ناز روبی کی رضا آباد، فیصل آباد سے۔ نئے سال کا شمارہ حسین رنگوں سے مزین سرورق کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز چمک گئیں۔ ہم بھی اس سانحے کو کسی لمحے نہیں بھولتے۔ بھائی ایک نیا صدمہ پیاری آپتی محترمہ مرحومہ گل ملک صاحبہ کی موت کا، آہ!! اللہ پاک اُن کی جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپنی رضوانہ کوثر صلیبہ کی والدہ کے لیے بھی دعائے مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کی دعا۔ ممتاز احمد صاحب حب معمول بہترین تحریر کے ساتھ تھی۔ ”یاد

کہانیوں میں پہلے زہر عشق ہی صرف پڑھ پایا ہوں۔ کاشی بھیا کہانی میں پر سرایت اور پنس اتنا ہے کہ دل کی دھڑکن بے ترتیبی ہونے لگی تھی۔ یہ قسط تو ختم ہوتی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم شس بہترین سلسلے ہیں۔ دسمبر کے سلسلہ ہائیڈ پارک میں عظمیٰ ٹھکور کے ٹھنڈے ہاتھ ہمیں تو خوب پسند آئے۔ اب اجازت۔

✽: دسک، سیالکوٹ سے ہماری لکھاری ساتھی ہم سیکڑہ صدف ایک طویل عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں! ریڈ لپ اسٹک سے بھی سرورق کی ماڈل بہت پیاری تھی۔ پھر منترہ سہام کے ”تجدید عہد وفا“ نے دل میں پانچل مجاوی۔ رضوانہ کوثر کی والدہ کے انتقال کا پڑھ کر دل دھکا ہوا۔ گل آپ کے دنیا سے جانے کا پڑھ کے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب آئیے احوال کی طرف۔ کاشی چوہان اس قدر خوب صورت جوابات دینے پر عمدہ خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شامل ہوتے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ سیماء غزل تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ کوثر خان، اشفاق شاہن اور محمد سلیم اختر نے بہت خوب لکھا۔ انوکھا نش، ارم ناز نے ایک دھشتی رگ کو چھیڑا۔ آخری دعا، فیصلہ آصف میری پیاری دوست اور قابل رائٹر نے کمال کر دیا۔ بہت خوب صورت کہانی ہے۔ ایم ارشد وفانے بھی ٹھیک ہی لکھا اور کاشی چوہان کا ناول زہر عشق کی تو بات ہی چھوڑو۔ تجنی بھی تعریف کرو کم ہے۔ بہت شاندار ناول ہے۔ غرض خوب صورت سلسلوں سے مزین ”جی کہانیاں“ آپ کی ٹیم کے عمدہ انتخاب کی درخشاں مثال ہے۔ اب اجازت۔ خدا مزید چار چاند لگائے ہمارے سچی کہانیاں کو۔

✽: پیاری نیم جی! آپ جیسے پیارے لوگ اتنے طویل عرصے بعد حاضری لگائیں گے تو احوال کی رونق ماند پڑ جائے گی۔ کچھ تو خیال کریں۔

✽: جبکہ 58 شمسی، سرگودھا سے فیصل ندیم بھی لکھتے ہیں۔ نئے سال کا پہلا شمارہ بیکر کو ہی مل گیا تھا۔ نائل میں لڑکی اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ نئے سال کی مبارکباد دے رہی ہے۔ اس کے بعد ورق پلٹتے ملتے منترہ سہام مرزا کے ادارے پر جا پہنچا۔ تجدید عہد وفا، کوثر پڑھا اور حقیقت ہم سب کو پاکستان کی خاطر یہ عہد کرنا ہے کہ دشمن کو ملک پاکستان سے بچکا کر ہی دم لینا ہے۔ احوال میں نئے آنے والے قارئین کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں شمر، قمر، امتیاز عاصم امید ہے کہ آئندہ بھی احوال میں ملاقات کریں گے۔ راشد لطیف، کٹڑہ ملک، سونیا خان تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بھائی مجید احمد جانی صاحب آپ نے ہمیں یاد کیا۔ احوال میں آپ کی محبت ہے کہ بندہ ناچیز کو یاد رکھا۔ اس کے علاوہ مور شاہد، ممتاز بھائی، روبینہ ناز، ڈاکٹر خادم کھیرا، ملازم شیرازی کو سلام۔ تمام ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ جہان ہوں گے ہم، ربن لگا جیون، عشق زادے، زبردست کہانیاں ہیں۔ ٹھکانہ، مجھے موت چاہیے زبردست ہیں۔ روگ، علاج، انوکھا نش، ارم ناز، حیران کر دینے والی تحریریں پہلی بار پڑی ہے۔ کراس ٹکنگ، وفا کیسی بھی اچھی ہیں۔ ہم شکل ایم اے راحت کا سلسلہ بہترین جا رہا ہے۔ پشیمان، جمیرا قریشی، یاد رکھیے دنیا، مجید احمد جانی، جرم کی کہانی نے حقیقت میں بہت کچھ سونے پر مجبور کر دیا۔ اپنی جی بھی دیکھی نہیں۔ بہترین کہانی ہے۔ دیکھ میرا نصیب، ممتاز احمد، عبرت سے بھرپور کہانی ہے۔ ویلڈن بھیا۔ کاشی چوہان کا زہر عشق زبردست مراحل میں ہے۔ صائمہ تبصرہ بلی کا بچہ، مالک سے وفاداری کی بہترین مثال ہے۔ سید ملازم حسین شیرازی، فراڈ، کیا کہنے جناب اللہ تعالیٰ آپ کی قید و بند کی صعوبتوں کو آسان فرما۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

✽: اچھے فیصل! بس اسی طرح احوال میں شامل رہا کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم مصروف ہو مگر ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اپنوں ہی کو فراموش کر ڈالو۔

رکھے گی دنیا، محض ایک سیدھی سادی تحریر تھی جسے قلم کار صاحب نے گھما پھرا کر پڑھنے والوں کے لیے الجھا کر رکھ دیا مجھے تو ایسا ہی لگا۔ (قارئین رائے میں آزاد ہیں) آخری چوری اچھی لگی۔ 'اجنبی مسیحا' بھی خوب تھی۔ آخری دعا انداز تحریر دلکش تھا مگر کہانی کچھ کچھ افسانوی رنگ لیے ہوئے تھی۔ 'فرڈا کینی' عبرت ان کے لیے، جو دن رات راتوں امیر ہونے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ 'دنا سنا' اچھی تحریر تھی اور واقعی اس بیچ رسم کے کی گھر اجڑے ہیں۔ اس رسم کو ختم ہی ہو جانا چاہیے۔ 'اپنی اپنی بات' میں قلم کارہ کیا سمجھانا چاہتی تھیں، کچھ واضح نہ ہو سکا۔ 'پشیمان' متاثر کن تھی۔ وہ ہمیں سنبھل جائیں جو انجان راستوں پر چلتے ہوئے کچھ نہیں سوچتیں۔ 'لوکھا نشہ' حسب معمول ارم ناز انوکھی اور دلکش تحریر کے ساتھ آئیں۔ 'علاج' بھی خوب لگی۔ 'روگ' مجھے موت چاہیے، 'ٹھکانہ'، 'گرہن لگا جیون' پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا، ذکیہ کو چاہیے تھا کہ اپنے حالات سے سمجھوتا کرتی اور اپنی خوش گواری زندگی کو یوں رکھوں گی نذر نہ کرتی۔ اگلے ماہ کے لیے اجازت بشرط زندگی۔

☆ پیاری بہن! قاری اور لکھاری اپنی رائے میں آزاد ہے۔ بچا کیا۔ آپ کی رائے کا احترام کرتے ہوئے آئندہ خیال رکھیں گے۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔
[۴] عمارہ ناز پہلی بار ہمارے احوال میں شریک ہو رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ میرا تعلق ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل کمالیہ کے ایک پسماندہ گاؤں سے ہے۔ شاعرہ ہوں اور میرا کلام مختلف میگزینز میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کئی کہانیاں میری نظر سے گزر راجب مطالعہ کیا تو دل کو بھرا گیا اور بہت پسند آیا۔ بہت معیاری اور عمدہ ڈائجسٹ ہے کیونکہ جہاں ملک کے مایہ ناز اور اچھے رائٹرز شاندار کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وہیں پرکاشی چوہان بھائی کی محنت اور لگن نے اسے چار چاند لگائے ہیں تو دل سے آپ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ احوال بہت خوب صورت سلسلہ ہے، جس میں پیار بھرے خطوط اور مزے مزے کے تبصرے ہوتے ہیں۔ 'زہر عشق' بہت لاجواب اور اپنی مثال آپ ہے۔ ممتاز احمد صاحب سرگودھا والے کی لکھی پلیٹ فارم کہانیاں تو بہت اچھوتی اور منفرد ہوتی ہیں۔ جنہیں میں بڑے شوق سے سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ ماہ جنوری میں شائع ہونے والی کہانی 'دیکھ میرا نصیب' تو بہت شاندار، نصیحت آموز اور عبرت انگیز کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ ارم ناز بہت اچھی رائٹر ہیں، بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ 'لوکھا نشہ' بہت اچھی کہانی تھی۔ مجید احمد جانی صاحب کی کہانی بھی بہتر تھی۔ انکل سلیم اختر، جاوید راہی صاحب بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں صائمہ شیری کی کہانی 'وہ بلی کا بچہ' اچھی کہانی تھی۔ باقی سب رائٹرز کی تخلیقات بھی اچھی تھیں۔ میں چونکہ شاعرہ ہوں تو سب کی شاعری غور سے پڑھی۔ روبینہ ناز روبی، رضوانہ کوثر، صائمہ بشیر کے انتخاب بہت اچھے لگے، پسند آئے۔ اگر آپ نے اور پڑھنے والوں نے ویلکم کیا تو حاضر ہوتی رہا کروں گی۔

☆ عمارہ جی! خوش آمدید! اب ہم نے تو آپ کو ویلکم کر کے اپنا فرض نبھایا اب آپ کی آمد ہر ماہ ہونی چاہیے۔ وعدہ نبھانے کی اب آپ کی باری ہے۔

[۵] حبیب الرحمن، سینٹرل جیل، لاہور سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی! آپ نے یاد کیا ہے اس لیے میں حاضر ہوں۔ میری لکھی ہوئی کہانی اگر ٹھیک ہے تو حکم کریں میں آپ کو مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھ کر بھیجتا رہوں گا۔ امید ہے کہ آپ رشتہ ٹھیک کرنا جانتے ہیں۔ باقی آپ کے پہلے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اپنے دل سے کیا پوچھوں بے وفاؤں سے ڈر لگتا ہے کیونکہ ایک چہرے پر کئی چہرے سجالتے ہیں لوگ۔ کاشی بھائی! آپ کو میں نے لکھا تھا کہ آپ کثیر تعداد میں سے صرف ایک کا پی سالانہ مجھے گفت کر دیا کریں لیکن آپ نے..... اب آتے ہیں رسالے کی جانب تو جناب پہلے احوالیوں کی محفل میں۔ لوجی آپ سب کو نئے سال کے دوسرے ماہ کی مبارکباد باہا باہا۔ ابھی پہلے مجھے تھوڑی بیٹنی کی جگہ تو دو۔ راشد لطیف توں تھوڑا جیاناں ہو جا۔ بس پاؤں رکھنے کی جگہ بنا دو بیٹھن واسطے

طویل کہانی نمبر

ہمارے قارئین طویل کہانیوں کے دلدادہ ہیں۔ قارئین کی پُر زور فرمائش پر 'کئی کہانیاں' کا منفرد

"طویل کہانی نمبر"

آپ کی بصارتوں کا رزق بننے کے لیے تیار ہے۔ ماہ اپریل کا شمار طویل کہانی نمبر ہوگا۔ ایک ایسا شمارہ جس میں سسکتی، ہلکتی، روح فرسا سچائیاں، سنگین سچ بیانیات آپ کو اپنی گرفت میں لے لیں گی۔

زندگی کی ہر نہ سچائیاں لیے ایک یادگار نمبر.....

پلیٹ فارم نمبر

یہ زندگی ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہے۔ جس پر حق اور باطل ایک ساتھ جو سفر رہتے ہیں۔ زندگی ہر موڑ پر ایک پلیٹ فارم پر رکتی ہے اور پھر..... زندگی کی منزل آ جاتی ہے۔ حق اور باطل کبھی مل نہیں پاتے۔

ایک ایسا یادگار شمارہ جسے قارئین کبھی نہ بھول پائیں گے۔

تلف و شیریں، عبرت و سبق آموز، یادوں کو کہانی کے روپ میں ڈھال کر فوری طور پر ہمیں روانہ کر دیں۔

نوٹ: پلیٹ فارم نمبر کے لیے اپنی کہانیاں اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں 25 مارچ سے پہلے موصول ہو جائیں۔

ماہ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

جگہ میں آپ بٹالوں گا۔ ہاں ہاں۔ چل بس ٹھیک ہو گیا۔ اور دوسرے آپ سب کے لیے ایک اچھی کہانی لکھ کر کاٹی بھائی کے حوالے کر دی ہے اب دیکھیں کہ کاٹی بھائی اسے کب منظر عام پر لائے ہیں۔ اچھا کاٹی بھائی ختم کرتا ہوں تھوڑی دیر میں کیوں کہ میں کون سا ہر ماہ آتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد آیا ہوں تو تھوڑی باتیں تو کروں گا نا۔ اچھا دوستوں آپ سب کا شکریہ جو مجھے یاد رکھتے ہیں۔ جاوید صاحب میں غلطی سے تمام باتیں سچ لکھ دیتا ہوں اور آپ میری کہانی پڑھ کر میرے بارے میں کہہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ احوالیوں میں ایک پیاری سی نرم و نازک دل رکھنے والی ارم خان بھی ہیں۔ ارم صاحبہ صوبہ کی کوڈی نہیں دیکھ سکتا اس لیے اگر آپ کو میری بات کا دکھ ہو اس لیے معذرت۔ آپ سب کی دعاؤں سے ہی جیل سے آزاد ہو جاؤں گا پھر دعوت ضرور کروں گا۔ آنٹی مسز نوید باغی پوری دنیا کے نام خط میں لکھ دیے مگر ہم..... منزل صاحبہ آپ جیسے لوگوں نے مجھے اس رشتے پر قائم رکھا ورنہ موت اور زندگی کی درمیانی دیوار پر بیٹھ کر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مقصود صاحب بالکل بات ہو چکی ہے۔ لیکن کوئی یاد نہیں رکھتا۔ سب بھول جاتے ہیں۔ ملک علی رضا، شکر پور یاد رکھا۔ رسالے پر تبصرہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں کیوں کہ خط لیت ہو جائے گا۔ ویسے بھی سچی کہانیاں جنوری کا مجھے نہیں ملتا ہے اس لیے کتابوں پر تبصرہ مارچ کے مہینے میں ہی کروں گا۔ شکریہ۔

☆ پیارے بھائی! یقین کرو اس خوشی کا کیا بیان ہو جو تمہارے خط سے آتی ہے۔ تمہاری قیدی آسانوں کے لیے ہر پل دعا گو ہوں۔ پرچہ تمہیں مل جایا کرے گا۔ کہانی؟؟ اب تو خوش ہونا.....

☆ ایک زمانے کے بعد احوال میں یہ آمد ہوئی ہے ہمارے پیارے ساتھی وقاص حسین کی، رحیم یار خان سے۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو شکریہ کہانی شائع کرنے کے لیے۔ ویسے تو نئے ماہ کا رسالہ آنے والا ہو گا اور میں ہوں کہ اب خط لکھ رہا ہوں۔ خط دیر سے لکھنے کی وجہ صرف اور صرف کام کی مصروفیات ہیں۔ ویسے تو رسالہ پانچ تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ لیکن میرا کام ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ روز ایک شہر سے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت نہیں نکال پاتا۔ اب بھی آج شام کو لاہور کے لیے نکل رہا ہوں تو سوچا جانے سے پہلے خط لکھ دوں۔ رسالہ ہر ماہ لیتا ہوں کبھی تو پورا پڑھ لیتا ہوں تو کبھی ادھر راہی رہ جاتا ہے۔ اور ہاں یاد آ رہا ہے راسخزاد ایوارڈ کی فہرست میں میرا نام تو آیا ہے۔ لیکن جگہ کا نام غلط لکھا ہے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی اگر وقت ملا تو اگلی بار وقت پر حاضر ہوں گا۔ تب راکھنا۔

☆ پیارے وقاص! تم جیسے دل چاہے آؤ، جم جم آؤ لیکن ایک گز ارش ہے ہماری محبت کا مجھم رکھ لو۔ کیا بے قاعدگی باقاعدگی میں نہیں بدل سکتی۔ پلیز جواب ضرور دینا۔

☆ میا نوالی سے ہمارے ساتھی ملک محمد آجیر عرض کرتے ہیں۔ ادارے میں منزه سہام کا تعہد وفا اچھا لگا۔ احوال میں اپنی کہانی پر تبصرے پڑھے۔ جن لوگوں نے میری کہانی کی تعریف کی خاص طور پر جنک صدر سے ہماری بہن، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، نعیم اللہ، مجید احمد جانی، راشد لطیف، صائمہ جمید اور سونیا خان کا بے حد شکر گزار ہوں جنہیں میری کہانی پسند آئی اور میری حوصلہ افزائی کے لیے جو الفاظ ادا کیے ان کا بے حد شکریہ۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف جدا نہ ہوں گے ہم، مگر بہن لگا جیون، 'عشق زادے'، مجھے موت چاہیے، انوکھا نشہ زبردست تحریریں تھیں۔ ایم اے راحت کی بہم شکل، واقعی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ ملک الطاف سرور سے ملاقات اچھا بنا ہو رہی تھا۔ دوسری حکایت پشیمان، حمیرا قریشی صاحبہ کی تحریر اچھی تھی۔ وہ ٹی کا پچھ، بڑا آدمی، روشنا نے عبدالقیوم، اچھی تحریریں تھیں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر انسان سے کتے کی وفا کی تحریر واقعی کہانی میں محبت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ دنا شاہ میں ہمارے ضلع میانوالی کی تاریخ کو رقم کیا گیا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی رواں ہے۔ اقبال بانو نے تحریر کو خوب صورت بنا دیا۔ واقعی شعلہ ثابت ہوئی۔ دوسرا جہاں بجھتا شعلہ، فراڈ کمپنی، سید ملازم حسین شیرازی نے اچھا بھڑکا یا یہاں تک کہانیاں پڑھ سکا۔ چند مصروفیات کی وجہ سے بقیہ کہانیاں پڑھنے سے روک دی ہیں۔ ورنہ ان کے حوالے سے تبصرہ ضرور کرتا۔ اب اجازت چاہوں گا۔

☆ بھائی اکرم! تبصرے کا شکریہ۔ آمد مستقل بناؤ۔ پراسرار کہانی کے لیے انتظار کرو۔

☆ لاہور سے ہماری بہت پیاری ساتھی لکھاری شمیم طاہرٹ احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ان تمام لکھاری بھائیوں اور بہنوں کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد جنہوں نے 2015ء کی کہانیاں بیٹس راولپنڈی ایوارڈ حاصل کیا سب کو بہت بہت مبارک۔ اور کاٹی سر! میں آپ کی ادارہ پرنٹ پبلیکیشنز کے تمام ممبران، جنوری ممبران اور جن جن کو میری سچی کہانیاں کے لیے لکھی گئی پہلی پہلی کاوش پسند آئی اور اسے بھی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں سب کی دل سے شکر گزار ہوں۔ 2016ء کا پہلا شمارہ (سچی کہانیاں) میرے لیے سچی خوشی لے کر آیا اور اس کے لیے میں سب کی احسان مند ہوں، جزاک اللہ۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ منزه سہام صاحبہ 'تجدید عہد وفا' کے ساتھ بہت اچھا پیغام لے کر آئیں۔ اس کے بعد پہنچے 'ہم اور ہمارے مہمان' کی محفل میں۔ زبردست جناب! ان صفحات پر ہمیں اپنے پسندیدہ مصنفین کے دیدار نصیب ہوئے۔ کاٹی سر! آپ کی احوال کی محفل میں جھانکا، اوہو..... بھئی واہ، یہاں تو خوب رونق ہے بھی، اب سب احوالیوں کو میری طرف سے بہت بہت آداب۔ کاٹی سر! آپ کا سب احوالیوں سے اتنی محبت اور عزت سے پیش آنا بہت متاثر کرتا ہے۔ احوال کے سب احوالیوں کے تبصرے ہمیشہ کی طرح جاندار رہے، اور اس پر کاٹی سر کا سب کو فردا فردا محبت بھرا جواب سونے پہ سہاگہ کا کام کرتا ہے جزاک اللہ۔ گڈی آپا، گل ملک اور رضوانہ کوثر کی والدہ ماجدہ قضائے الہی سے وفات پا گئیں۔ اللہ ان سب کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین ثمہ آمین) سب سے پہلے آئی اسماء اعوان کی 'لائف بوائے کہانی'۔ اسماء صاحبہ ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ کہانی لے کر آئیں۔ اسماء اعوان صاحبہ کی تحریر نے تو لگتا ہے بھولے بسرے خوابوں کا دیدار ہی کر دیا۔ واہ۔ اسماء جی خوش رہیں، سلامت رہیں اور اسی طرح چمکتے وکتے لائف بوائے کی طرف چمکتی دینی کہانیاں ہمارے لیے لاتے رہیں۔ جدنا ہوں گے ہم سیم غزل کی داستان واقعی بے مثال تھی۔ فرحت صدیقی 'اندن کے سرورترین شہر سے'، گران لگا جیون لائیں اور کیا خوب لائیں۔ ایڈیسن اور یس مسیح کی 'عشق زادے'۔ شاد رہیق صاحب کی 'ٹھکانہ ایک آدمی'۔ حق آموذ کہانی تھی۔ محمد سلیم اختر صاحب کی 'مجھے موت چاہیے' عورت کی مظلومیت کی ایک سچی داستان ہے۔ انیلا

ناقابل اشاعت تحریروں

سیدہ زینب فدا	پرانی حویلی کا راز
نعیم اللہ	خانہ بدوش
کشاف اقبال	(1) ظہار (2) قصور میرا تھا
وقاص اسلم	قدر
یاسر وکی	نصیب
عارف شہزاد	جب شک دل میں آ جائے
راشد لطیف	پچھتاوا
دشیر نواز	(1) جہالت (2) آبی جانی ہے
منعم اصغر	بے وفائی

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا تازہ ترین شاہکار 'دام دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

"ایمن" ایک ایسی ہوئی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ سانس، ہر سر کے قطر اور تھکن کا نشانہ

ہونا پڑا۔

تازہ ترین قسط سے کچھ لائنیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھینے کو دیتی ہے۔

شکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔" فردوس کی بڑبڑاہٹ زہری لڑاہٹ کے برابر تھی۔

"ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔" حامد

مبین نے لقمہ دیا۔

"پانچ لاکھ؟" فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں

کہیں۔ یوں گویا کوئی آتن پر بندوق تانے لکھڑا ہوا اور کہہ رہا ہو۔ دکا لو پندرہ لاکھ۔

"ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟" وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

"آمرارکو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔" حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر

تاک کر نیا تیر پھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

جی تو چاہا لیٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی

دعہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل

کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی

سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

'دام دل' ہر ماہ دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

امام بخش کی "روگ" کوٹ خان کی 'علاج' پر اثر تحریریں تھیں۔ ارم ناز کا 'انوکھا نشہ' بہت انوکھی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ایسے امتیاز احمد کی کراس ٹانگ 'دفاکسی' بھی اپنی اپنی جگہ اچھی رہیں۔ سب رنگ حکایتوں میں سب حکایتیں زبردست تھیں۔ اقبال بانو اردو ادب کا بڑا نام۔ آپ کی 'دنا سارواپنی' رسم و رواج میں جکڑی ایک خوب صورت تحریر۔ فیصلہ آصف خان کی 'آخری دعا'۔ مجید احمد جانی صاحب کی 'یاد رکھے گی دنیا' اُف!! لڑا دینے والی کہانی تھی۔ پلیٹ فارم میں ممتاز احمد صاحب کی "دیکھ میرا نصیب" بھی دل ہلا دینے والی کہانی کے ساتھ آئے۔ "ہم شکل" ایم اے راحت صاحب کا سلسلہ دار ناول بہت اعلیٰ جا رہا ہے۔ ایم اے راحت صاحب میرے غورث رائٹر ہیں اور ان کی ہر تحریر میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ 'زہر عشق' کاٹی سرکا ناول بہت عمدی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر قسط کے اختتام پر ہی اعلیٰ قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ جزاک اللہ۔ باقی سب سلسلے اور کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ اچھی تھیں۔ اب اجازت چاہتی ہوں زندگی رہی اور قسمت نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔

☆ بہت عزیز ٹیمینا! تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ خوش رہو! ہمیں بھی اگلے ماہ کے تبصرے کا انتظار ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔

✉ احوال میں یہ کراچی سے ہماری بہت پیاری بہن سہیل کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ادارہ لا جواب تھا لا جواب کر دینے والا یہ دکھ تو ہماری روجوں کا ناسور ہے۔ جو ساتھ ہی جائے گا۔ احوال سے سب کے احوال معلوم ہوئے اور سب کے دکھ کچھ بھی۔ اچھا سلسلہ ہے۔ جدانہ ہوں گے۔ اچھی کہانی تھی قسمت کے پھیر کی طاہرہ کا فیصلہ بھی اچھا تھا۔ گر بہن لگا جیون کم عمر لڑکیوں کی بے وفائیوں اور خوف کیسے غلط فیصلے کرواتے ہیں! اچھی تھی۔ عشق زادے آج کل کے ماحول پر کمال کہانی لکھی ایڈیٹرز نے ویلڈن ایڈیٹر، ٹھکانہ۔ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے موت چاہیے پانہیں ماں باپ ایسے فیصلے کیوں کرتے ہیں اور ایسے نفسیاتی مریض شادی کیوں کرتے ہیں۔ روگ تکلیف ہوتی ہے مجھے عورت کے اس روپ پر جو رشتوں کا احترام نہ کرے اور لغت ہے اسے بہنوئی پر کیونکہ بہنوئی محترم رشتہ ہے۔ علاج اچھی تھی، انوکھا نشہ کمال تھی۔ ایسا نشہ تو نہ دیکھنا نہ کراس ٹانگ اچھا اینڈ تھا یہی ہونا چاہیے۔ مگر پچھتہ نہ کچھ تو صاحب کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا۔ وفا ایسی آج کل کی وفا ایسی ہی ہے۔ ہم شکل مانی غورث! ملک صاحب کا اثر لیا اچھا تھا اگر وہ ایسے ہی ہیں تو خود بھی اچھے ہیں۔ کیا ہے کیا ہو گیا ہوں بس ٹھیک تھی۔ پشیمان عورت کی یہ قسم قابلِ غور نہیں ہے۔ اسٹپ چیکنگ کمال تھی۔ وہ جگہ کا بچہ لاگائی۔ اپنی اپنی بات اپنی ہی بات تھی ہمیں پڑھ کر کیوں کو بے اختیار، مسکراہٹ نے چھوڑا۔ بڑا آدمی بہت اچھی رہی۔ کتے اتنے بھی کتے نہیں۔ الفاظ گنگ ہیں حیرت اس پر ہوئی کہ سعودی عرب میں بھی یہ سب ہوتا ہے۔ 'دنا سار' میں ریشماں، بڑی تیز دلی نکلی۔ فراڈ مینی، ایک بار میرے میاں بھی اپنا گھر بیچنے کے چکر میں ایسے ہی لوگوں میں پھنسنے پھنسنے رہ گئے تھے۔ بس آیت الکرسی کا حصار انہیں بچا گیا۔ آخری دعا کیا کہیں اس معاشرتی برائی پر دل روتا ہے۔ مختاری کا فیصلہ درست تھا۔ اچھی سیما بہت شاندار تھی۔ شہید ٹھیک تھی۔ آخری چوری بہت اچھا ہوا ان کے ساتھ محمود شام کا سفر نامہ اچھا شروع ہوا ہے۔ یاد رکھے گی دنیا نے روح تک کو کپکپا دیا ایسی بھی ہوتی ہیں بہنیں۔ دیکھ میرا نصیب۔ غلطی جیسی عورتیں ناسور ہیں معاشرے کا۔ اور عاقب کے ساتھ تو بہت اچھا ہوا۔ زہر عشق، پل پل دل دھڑکانی اسٹوری ہے۔ اب دیکھیں گراں صاحب کیا کرتے ہیں بے چارے مسلمان کے ساتھ۔ مسئلہ یہ ہے۔ باباجی کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیرہ نیم کش حب معمول اچھے تھے۔ اور اب تم سناؤ کیا چل رہا ہے آج کل۔ دیکھو تم سے وعدہ وفا کرنے کے پھر ہمیں خط لکھ رہی ہوں لیٹ ہی گئی۔ اب اجازت دو زندگی اور طبیعت نے وفا کی تو پھر خط لکھوں گی۔ اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆ بس پیاری سی آبی! وعدہ وفا ہوائی چاہتا ہے۔ آپ کی محبت پر ہمیں ایسے ہی مان تھوڑی ہے۔ خوش رہیے۔

انعام یافتہ کہانیاں

اگر ہمارے لکھاری اور قاری ساتھی۔ ماہ فردی میں انعام یافتہ کہانیوں کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہوں گے۔ ساتھیوں کے ہمارے لچکدار لکھاری تو بیحد شگفتہ اور دلچسپ رہے ہیں۔ اصل مقابلہ تو دور حاضر کے ان لکھاریوں کے درمیان ہے۔ جو کہامیالی کی شاہراہ پر اپنے قلم لیے دواں دواں ہیں۔ مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑا ہے کہ ہمارے لکھاری کہاں کہاں کی کہانیاں لکھتے رہ جاتے ہیں اور سبق پورا۔ میری آپ سے گزارش ہے ساتھیوں کہ آپ ہمیں مغرور اور اعلیٰ پائے کی کہانیاں ارسال کریں تاکہ ہم بھی فخر سے یہ کہہ سکیں کہ ہمارے انعام یافتہ لکھاریوں کی تحریریں پڑھ کر دیکھیں اور سر پر ہاتھ رکھیں۔ دل سے لکھو۔ جرم کر لکھو۔ کہ الفاظ بہت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔

اسی سانس زور ہوں۔ یار تمہارا خلوص پیارا اور (چاندنی کا ہونا تاج) اصول ہے میرے لیے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ دل کی تمہارا تاج۔ شاد ہو جانی۔ سب آبی بہت شکر ہے۔ سلامتی ہو۔ شامت جمال آبی کہاں غائب ہیں؟ ان خانانہ شانی خانان آپ کی خاکہ ہیں؟ (جی ہاں) اشتیاق شاہین بھائی آپ نے یاد رکھا مکتور ہیں۔ آپ کا تبصرہ اور ہمارے ساتھ میں ممتاز احمد بھائی اور سونیا خان کا بھی بہت پسند آیا۔ حنا بشری بہت ممنون ہوں خوش رہیے۔ مجید بھائی بھائی اور صائمہ بھائی شادو باد رہیں۔ کہانیوں میں یہ دوستی ہے۔ سلیم اختر اعلیٰ۔ ارم ناز ڈی سی آر۔ روایات کی دلدل میں قہقہے۔ آپ اپنے دام میں قاسم خان بلوچ، منعم اصغر، ممتاز احمد، حنا بشری، مقصود بلوچ کی تحریریں دیکھیں۔ زہر شوق تو ہے بہت زبردست۔ اب چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔

یاد دہانی لڑیا اب تو خوش ہونا۔ تبصرہ وقت پر مل گیا۔

اشفاق پورہ سے ہمارے احوال میں یہ پہلی آمد ہی اشتیاق احسان کی۔ لکھتے ہیں۔ محفل کے سب دوستوں کے لیے اپنے چند دوستوں کے کہنے پر کہانی لکھ ڈالی ہے۔ کاشی جو ہاں صاحب اور آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ نعمان اشتیاق، منعم اصغر اور محسن علی دیکھ لو دوستوں۔ اور میں ایک اچھی خبر بھی سنانا چاہتا ہوں۔ منعم اشتیاق بولے اور اس نے کلاس میں سیکنڈ پوزیشن لی ہے۔ بہت مبارک ہو منعم۔ منعم تمہاری کہانی بہت اچھی ہے۔ مجھے اس سے اچھی چاہیے سمجھے۔ نعمان کے ناول کی پہلی قسط شادنا تھی۔ میری پہلی حاضری ہے اس قسط کے اور تو پڑھا ہی نہیں۔ ہاں اکتوبر کے شمارے میں ایک حکایت تھی "استاد" نعیم اللہ صاحب کی بہت اچھی کہانی تھی۔ اور میں کیا کہوں؟ اگلے ماہ حاضری دوں گا اگر وقت پر تھی کہانیاں مل گئیں۔

یارے اشتیاق! خوش آمدید! کہانی کے بارے میں تو ہم پڑھ ہی کر رائے دیں گے اور ہاں! اب غیر حاضری نہیں چلی گی۔

اگر ہمارے لکھاری ساتھی منعم اصغر، ڈی جی خان سے لکھتے ہیں۔ امتحانات کہاں گھل کر سانس لینے دیتے ہیں۔ اب تو فراغت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اسی خوشی میں "جی کہانیاں" میں داخل ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے منعم اصغر کی باتیں "اسرار فون" گہرائیوں میں ڈوب کر تحریر کی ہوئی۔ بہت زبردست پھر حسب عادت احوال میں قدم رکھے۔ تبصرہ میں سنبھل، سدرہ انور علی، زرینہ جونجو، حسینہ جونجو، منزل خان، مسز نوید باگھی، فرح انیس، عطی شکور، ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، صائمہ مجید، مجید احمد جانی، خادم حسین نے بہت اچھے تبصرے کیے۔ امم یعقوب صاحب نے بھی خوب پوچھی۔ جناب ہم بالکل خیریت سے ہیں بلکہ ہمیشہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی طبیعت بدلوتو ادا رہا ہے۔ یعقوب صاحب، منعم کی طبیعت بہت سے لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اب بدلنا تو زیادتی ہوئی ناں؟

✽ گارڈن ایٹ، کراچی سے ہماری لکھاری ساتھی کنول عمران خان لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے آتے ہیں "اسرار فون" کی طرف "منزہ جی" آپ نے کیا خوب صورت بات کہی۔ زبردست۔ شانی خانان اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ نسیم سیکند آپ کی سند کے شوہر کا پڑھنا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دیں آمین۔ کاشی بھائی پر اسرار نمبر کا سن کر دل بڑا خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے پر اسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے لکھنے کو مگر آج کل ذرا مصروف ہوں۔ فرصت ملے ہی قلم اٹھاؤں گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "دوستی ہے" فاطمہ گل، "میرا ساجن"، "آستین کے سانپ"، "وکی سی آر"، "ازالہ"، بہت بہترین تحریریں تھیں۔ اور زہر شوق تو بے ثواب جاری ہے۔ کاشی بھائی زبردست "دوستی" بھی اچھی تھی۔ کاشی بھائی اس بار کا سردق بڑا مخلص اور خوب صورت لگا۔ رسالہ ترقی کی منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور ترقی دے آمین۔ احوال میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ اچھا جی اب اجازت دیں۔ انشاء اللہ اگلے احوال میں ملے ہیں زندگی رہی تو سب کو میرا پیارا بھرا سلام۔ ارے ہاں کاشی بھائی 25 مارچ کو میرے چھوٹے بھائی فراز علی کی سالگرہ ہے اور اسی دن میری مہندی بھی ہوئی تھی اور 26 مارچ کو شادی تھی۔ مطلب ہماری شادی کو 11 سال ماشاء اللہ ہو جائیں گے مارچ میں۔

✽ پیاری سی کنول! سب سے پہلے تو ویڈیو اپنی ورسری کی مبارک باد۔ اب فراز علی کو سالگرہ مبارک۔ خوش رہو۔ تبصرہ مختصر مگر دلچسپ کیا۔

✽ بورڈی شریف، خیر پور ناٹن شاہ سے ہماری اڈی زرینہ جونجو احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ آپ نے میری نظم شائع کی جس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ شانی خانان کے والد محترم کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ سب سے پہلے میڈم منزعہ سہام کا ادارہ "اسرار فون" پڑھا ہے بات تو جی ہے کہ ایسا اسرار فون اگر انسانوں کے لیے ایجاد کریں تو مزہ آ جائے، پھر 90 فیصد لوگوں کے دوغلے پن عیاں ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہماری آفت کی پڑا سدرہ انور کا خط پڑھا۔ سدرہ انور چندے آفتاب چندے ماہ تاب تو ختم پرسوت کرتا ہے۔ ہم تو ننھیرے مسکین لوگ۔ احوال میں سدرہ انور، زہد حسین اور حسینہ جونجو کے خطوط پسند آئے۔ منزل خان، ادا ممتاز احمد، عیسا مجید جانی، سنبھل، اور ہمایا اشتیاق شاہین کے لیے نیک تمنائیں۔ کہانیوں میں شانی خانان۔ "تلاش" نوشاہی صدیقی، "بلند بخت" نعمان اشتیاق، "بادبان" ممتاز احمد، "ازالہ" فوزیہ احسان رانا، "حرام خور" ضرعام محمود، "میرا ساجن" سیدتہ تحریریں تھیں۔ دانیال شکی "ایک تصویر ایک کہانی" محمد سلیم اختر "یہ دوستی ہے" اسماء اعوان "لائف بوائے" ارم ناز، "وکی سی آر" بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ کاشی بھائی زہر شوق لادلاؤں ہے۔ ہائیڈ پارک میں خضر حیات، روینہ ناز روبی کی شاعری پسند آئی۔ کنول جی کی "جنتانی" کے پتوں کے اچھے لوگ بہت پسند آئی۔

✽ زرینہ جی! آپ کی طبیعت کی وجہ سے دل پریشان رہتا ہے۔ یقین کریں آپ کی احوال میں آمد نے ہمیں بہت زیادہ اطمینان اور حوصلہ بخشا ہے۔

✽ بورڈی شریف، خیر پور ناٹن شاہ سے ہماری لڑیا۔ ملکہ احوال تحسینہ جونجو کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ گل رنگی یادوں کا سرمایہ ساتھ لیے موسم بہار کا آغاز۔ خوشبو بکھیرتی جبکہ خوب صورت رنگوں سے نئی سبک مکمل محفل احوال اپنے عروج پر ہے۔ ماشاء اللہ اندام حیروں کو جالوں سے منور کرتی کچھ باتیں سبک لیے ہم بھی حاضر محفل ہیں۔ احوال میں اپنے بھائی کاشی بڑی جلدی میں ہیں۔ بس اتنی ہی باتیں؟ ٹائٹل بڑا پیارا ہے۔ ادارہ "اسرار فون" کے حوالے سے منزعہ آتی کی باتوں سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے کئی لوگوں سے واسطہ پڑا۔ جن میں کچھ اچھے تو کچھ انوکھے بھی اور کچھ بہت ہی اچھوں کا ساتھ ملا۔ ان میں ایک بہت ہی پیاری دوست کا ساتھ بھی ملا ہے عزیز از جان سدرہ انور علی، سوچا نہیں تھا کہ ہم یوں ملیں گے۔ اپنے اصولوں کی پابند (میری طرح) یقین نہیں ہو رہا کہ وہ حقیقت میں مجھے ملکہ کا درجہ دیتی ہے، کہ اس نے مجھے (تاج) بھی پہنایا بقول سدرہ کے کہ ملکہ کا حق بنتا ہے کہ تاج بھی پہنے،

ایک بہت خاص آپ بیتی

ااور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کئے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک مصعب انسان سے گزرنے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستانِ عبرت جس میں آپ بھی ہیں..... سکیاں بھی ہیں محبت اور نفرت کے رنگ بھی..... بہت جلد رانا حبیب الرحمن کے قلم سے ایک آتش فشاں کی جی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

دنیا تو سدا رہے گی ناصر ☆ ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر

2 مارچ کو ناصر کا قتل کی 44 ویں برسی گزر جائے گی، سب سے فاتحہ کی گزارش ہے۔

☆ اچھے نزابت! ہماری ساری اچھی اور سچی دعائیں تمہارے لیے اور تمہاری کامیابی کے لیے۔ تمہارے لیے ایک شعر۔

والہم آ باد رہے گی دنیا ☆ ہم تمہیں ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

☆ کبیر والا سے ہمارے ساتھی شاہد رفیق بیوعرض کرتے ہیں۔ نائٹل اس دفعہ پھر کچھ یادیں دے گیا۔ بہت خوب صورت تھا۔ یہ آپ کی محنت ہے اس کے بعد آگے بڑھا۔ منہ بہام کے بہت خوب صورت الفاظ تھے احوال میں نائٹل، ایم اشفاق، منٹ، مور شاہ حسین، نزابت افشار، سدرہ انور علی، شمسہ قمر، ممتاز احمد، میرے عزیز بھائی، فریاد گت، روینہ ناز، صابر بشیر ان سب کے احوال بہت خوب صورت تھے۔ کہانیوں میں "جدانہ ہوں گے، مگر میں آؤں، مجھے موت چاہیے، روگ، علاج، وفا کیسی، پشیمان، اسپین چینگ، وہ ملی کا بچہ، آخری دعا، شبید، آخری پوری" کو کبیر العیوب، زہر عشق، بہترین اسٹوریوں میں۔ ان رائٹرز کو میری طرف سے مبارک باد۔

☆ شاہد بھائی کے چیر مین بننے پر مبارک باد قبول فرماؤ۔ اب تمہارا ہر ماہ آئے۔ تمہاری صحت کے لیے دعائیں۔

☆ ہمارے نئے ساتھی محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتے ہیں۔ فروری کا خوب صورت شمارہ بہت حسین ہے۔ کاسٹل کے ساتھ ملا۔ یہ شمارہ میرے لیے تو بہت ساری خوشیوں کا انمول تحفہ تھا۔ احوال میں خطوط پڑھنے سے تو معلوم پڑا یہاں نفرتیں کم اور محبتیں زیادہ ہیں۔ کاش ہر جگہ ایسا ہوتا تو آج ہم خون کے آلودہ بھارے ہوتے۔ اللہ خیر کرے۔ مقصود بھائی آپ نے مجھے سچی کہانیاں میں دیکھ کر کیا تو جناب بہت بہت شکر یہ کہ آپ نے میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ سونا خان اور صائمہ مجید آپ دونوں کا بھی بہت شکریہ ادا ہے۔ پند کرنے کا۔ تحریروں میں پہلی جگہ بیانی جناب محترم محمد سلیم اختر کی یہ دوستی ہے۔ بہت اچھی بھی آپ کے بارے میں اور کچھ کہنا ضروری نہیں۔ آپ کا جاندار قلم ہی آپ کی تعریف ہے۔ ڈراپ سین بھی اچھی لگی۔ فاطمہ کل، داہمی واہ زبردست اور دلفریب داستان تھی۔ قسمت کے ٹھیلے نرالے ہیں۔ کوئی خوشیاں لاوے۔ روایات کی دلدل بھی اس شمارے کی زینت بنیں۔ آپ اپنے دام میں، اس کہانی کے بارے میں خود تو کچھ نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ یہ میری اپنی تحریر تھی اور اس کے بارے میں میں اپنے تمام قارئین کی رائے دیکھوں گا کہ وہ اس کہانی کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں۔ بہر حال پیارے کاشی تحریر شائع کرنے پر بہت شکریہ۔ خوش رہو۔ میرا ساجن۔ آستین کے سانپ، اور بھائی ایڈیٹر اور ایس جی کی کہانی، ایک اور خبر۔ ارم نازی وی سی اور حرام خور یہ کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ حنا بشر کی کہانی اچھی لگی۔ بھائی مقصود احمد بلوچ کی کہانی۔ قاتل۔ پسند آئی۔ تلاش، بلند بخت بھی بلا جواب تحریریں رہیں۔ اس بار ہائیڈ پارک میں بہت مزہ آیا اس لیے کہ۔ ام حبیبہ کا مرسہ سوا سیر، تنویر لالہ کا غیرت مند، اور نادر شاہ کا ج طریقہ بہت مزے دار تھے پڑھ کر کسی خوب آئی۔ شاعرہ، عمارہ نازی غزل تو

سدرہ انور علی، فرح انیس، ارم خان، مسند، منجمی، ممتاز احمد، کیسے ہیں آپ لوگ؟ باقی سب کو بہت سی دعائیں۔ کہانیوں میں "یہ دوستی ہے، ڈراپ سین، فاطمہ کل، روایات کی دلدل، آستین کے سانپ، حرام خور، ازالہ، وہ کون سی اور وی سی آر اچھی لگیں۔ باقی سب سے معذرت ابھی پڑھی نہیں پائی تھیں۔ سلسلے وار میں زہر عشق بہت پسند آیا کچھ اقساط مس ہو گئیں۔ مجھے اس میں کہانی کے کرداروں سے زیادہ کاشی کا ہر بات پر زور دے کر سمجھایا گیا طریقہ بہت زبردست لگا، سوچ کے کئی دروازے کھلے ہیں ویلڈن! ہم شکل مجھے پسند نہیں سو معذرت اس بار "یاد بان" پڑھا۔ اسٹارٹ نے بہت محظوظ کیا بہت دلچسپ۔ یہ پہلا ناول ہے نعمان اسحاق کا جو پہلا حصہ پڑھا میں نے۔ اسفر کا کردار اچھا ہے کافی جس میں، میں دکھتا ہوں بابا (برائے مہربانی پڑھائی کے معاملے میں نہ سمجھا جائے) خط طویل ہو گیا میرا خط ضرور لکھیں گے گا۔ ابھی مجھے اجازت دیں سب کے لیے دعائیں اللہ نگہبان۔

☆ پیارے منعم! تبصرہ اچھا لگا! اب اپنی کہانی انجوائے کرو۔ خوش رہو۔

☆ روزہ پھل سے ہمارے ساتھ احوال میں خضر حیات۔ لکھتے ہیں۔ فروری کا شمارہ اچھا تھا، کودتا اور مسکراتا ہوا 2 فروری کو ایک خوب صورت اور دلکش نائٹل کے ساتھ مل گیا۔ شمارہ بہت عمدہ اور اچھا تھا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک عمدہ اور اچھا تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی، سبق آموز اور سنس سے بھر پور تھیں۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک بھی۔ شاعری نے تو پورے شمارے کا مزہ ہی وہ بالا کر دیا۔ سب شعر بہت عمدہ تھے۔ باقی تحریریں بھی عمدہ اور اچھی تھیں۔ شمارے میں اپنا خط اور غزل دیکھ کے دل خوشی سے بارغ بارغ ہو گیا۔ کاشی صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے خط اور غزل کو جگہ دے کر خوش آمدید کہا اور حوصلہ افزائی کی۔ آپ اپنے قارئین کی عزت اور قدر کرتے ہیں، انھیں نظر انداز نہیں کرتے۔ میں مزید کچھ بھیج رہا ہوں اور امید کرتا ہوں جگہ دے کر مزید لکھنے کا موقع دیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔

☆ خضر پیارے! ہم اپنے قاری کی قدر اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ہم اپنے قاری کے مقام کا ادراک رکھتے ہیں۔ خوش رہو۔

☆ ہمارے ریگور قاری ساتھی نزابت افشار، مہورہ، فتح جنگ سے اپنی چاہتیں لیے حاضر ہیں۔ فروری کا شمارہ آج میرے ہاتھ میں ہے، منہ آپی نے ہمیشہ کی طرح بہت خوب لکھا۔ واقعی میں ایسا سارٹ فون ہونا چاہیے مگر پھر وہ خوف ہے کہ جو آپ نے ظاہر کیا۔ احوال میں میری پیاری ایڈیٹر سمر فرح انیس آپ کی دعاؤں کی طلب گار ہے۔ آپ کا چھوٹا بھائی آپ کیسی ہیں آپ؟ اتنی غیر حاضر نہ رہا کریں پلیز۔ سونا خان، اور صائمہ مجید یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ راشد لطیف، مجید احمد جانی اور ڈاکٹر خادم حسین کبیر اسب کا شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ اور منزل آپ کی آپ نے اپنے اس بھائی کو یاد نہیں کیا۔ چلو کوئی بات نہیں ویسے اتنا ہی کہوں گا کہ یاد میری بلا کر ان کو ☆ وہ مجھے کیا کچھ کے بھول گئے؟

مذاق کر رہا ہوں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کے بیٹے کی صحت کیسی ہے؟ اور نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں، "ناسور، میرا ساجن، ہم شکل (ناول) فاطمہ گل، چھوٹی سی نیکی اور میرے اپنے اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی پڑھی نہیں کیونکہ مارچ کے آخر میں میرے پیپرز ہیں B.A کے سو تیار کر رہا ہوں۔ کاشی پیپرز کے بعد آپ کو اپنی کاشی تحریریں بھیجوں گا۔ کہانیاں اور شاعری بھی ہوگی۔ بس آپ میری کامیابی کے لیے دعا کریں۔ سلسلہ تیر شمس میں گتت منیر، ایم افضل آزاد، بشیر احمد اور فرح انیس آئی آپ سب کا انتخاب اچھا ہوتا ہے۔ اللہ پاک سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ ناصر کاظمی کے اس شعر کے ساتھ اجازت کہ

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیر ادارت

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا
ہمارے میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

پاکستان کے سیاست دانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں مالی تحقیقاتی اداروں کی
بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں

ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی او کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ فن تعمیر ☆ تہذیبی

☆ پاکستان کے اشعار ☆ موسیقی ☆ فلم اور ہمارے بچے ☆ طنز و مزاح ☆ اردو ادب سے انتخاب

☆ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت ☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ اطراف میں ہے

Ph: 0092 21 32274661

Mob: 0300-8210636

Email: mahmoodsham@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com

دل میں اتر گئی پر امید کے چراغ کب تک روشن رکھو گی، امید وفا چھوڑو۔ بہت ساری دعاؤں کے بعد اجازت
چاہوں گا اللہ آپ سب کو بخشی رکھے۔ آمین۔

☆ پیارے قاسم! تم کو پرچہ پسند آیا، ہماری محنت و اصول ہوئی۔ تمہارے اندر واقعی ایک بہت بڑا لکھاری
چھپا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔

☆ سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے بھائی اور لکھاری ساتھی ممتاز احمد عرض گزار ہیں۔ اپنے خط کی ابتداء
اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ کریم اپنے پیارے حبیب حضرت محمد ﷺ کے صدقے ہر انسان کو حاسدوں کے
حسد، منافقت کی منافقت، جھوٹ بولنے والے تہمت لگانے والے بہتان لگانے والوں کے شر سے ہمیشہ محفوظ
رکھے آمین۔ سچی کہانیاں کا شمارہ بروقت مل گیا۔ پیاری بہنا منورہ سہام نے اسمارٹ فون کے عنوان سے بہت
مزے دار، اداریہ پڑھنے کو دیا۔ سچ کہا انسانی رشتے بالخصوص خون کے رشتے اور نام نہاد دوست ہی اپنی منافقت،
خباثت اور حسد جیسے بدترین اور ذلیل ترین سوچ اور جذبات میں لھوے مچھر اگھوپتے ہیں۔ احوال میں پہنچا تو
کاشی بھائی مسکراتے نظر آئے۔ یار کاشی آپ ایک لائن اور ایک جملے میں بہت بڑی بات اور خوب صورت پیغام
دے دیتے ہو۔ بہت خوب سب سے پہلے تمام بہن بھائیوں بالخصوص زاہد حسین، مقصود احمد بلوچ، ایم افضل
آزاد، سلیمان شیر، فرح انیس، ایم یعقوب، سید طازم حسین شیرازی، حنا بشری، شعبان کھوسہ، سونیا خان، صائمہ مجید،
مجید احمد جانی، راشد لطیف، کزنہ ملک اور ڈاکٹر خادم حسین کھٹرا کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ آپ کے خلوص اور
ذہین و محنتوں کا بہت قرض ہے مجھ پر۔ اللہ کی بارگاہ میں صدق دل سے دعا گو ہوں آپ سب کو کھٹ و سلاستی، تندرستی
کے ساتھ ذہنی و جسمانی خوشیاں، بے پناہ عزت اور کچھ عطا فرمائے۔ آمین پیاری بہنا کنول عمران خان، اور مقصود احمد بلوچ
کا خصوصی اور انتہائی مختصر کہ آپ میری نوٹی پھونی تحریروں کو جو کہانی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ اپنی پسندیدگی کی سند
سے نواز کر میری عزت افزائی کرتے ہیں۔ یقین کیجیے آپ کی حوصلہ افزائی بہت طاقت بخشی ہے۔ لکھنے کا جو یہ شوق
ہے۔ اور بڑھ جاتا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ لائف بوائے کرشن کہانی بہت خوب رہی۔ محترم سلیم اختر
صاحب کی ”یہ دوستی ہے“ بہت لاجواب کہانی تھی۔ محمد قاسم خان بلوچ کی ”آپ اپنے دام میں“ بہت اچھی تخلیق تھی۔
ویدلن قاسم میرا سچا منفرد اور بہترین کہانی تھی۔ ”قسمت کے کھیل، روایات کی دلدل، آستین کے سانپ، ایک جبر اور
حرام خور، میرے اپنے، تلاش، بلند بخت، ذرا سی غلطی، چھوٹی سی نیکی، اپنا ہو گیا پسنا“ اچھی کہانیاں تھیں۔ براہم مقصود احمد
بلوچ ”قاتل“ کے عنوان سے اچھی کہانی لے کر آئے۔ موسٹ پاپولر اسٹارم ناز نے وی سی آر کی لہنت اور اس کے نقصانات
کو کہانی کی شکل میں خوب صورت الفاظ اور انداز سے تحریر کیا۔ جاوید راہی صاحب کا تو جواب نہیں۔ کیا خوب لکھتے ہیں پڑھنے
والے کو اپنے تحریر میں جکڑ لیتے ہیں۔ بادبان بہت زبردست کاوش ہے۔ ہائیڈ پارک میں کنول جی تنہا، شعبان کھوسہ اور کرن
شیرادی کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ روینہ ناز روبی کا کلام ”سال نو میں“ بہت عمدہ اور لاجواب تھا۔ بہت پسند آیا۔ عمارہ ناز اور
خضر حیات کی شاعری بھی اچھی تھی۔ نیل جاوید اور آرزو انوار کے لطیفہ بہت مزے کے تھے۔ تیرنم شمس میں مسرت گتہ شکار
کا اچھا انتخاب تھا۔ باقی دوستوں کے انتخاب بھی بہت اچھے تھے۔ اجازت چاہتا ہوں۔

☆ اچھے بھائی ممتاز! تبصرہ لاجواب اور تحریر کا جواب نہیں۔ ادھر ادھر دیکھنے سے اپنا کام رہ جاتا ہے۔ بس اپنا کام کریں۔
☆ لاہور سے ہمارے بہت عزیز قاری زاہد حسین لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم۔ ”اسمارٹ فون“ نے تو ہماری آنکھوں
کی چٹلیوں کو ساکن کر دیا ہے۔ اور اسماء اعوان نے عارفین کو فراز کے حوالے کر کے سب کا قبضہ بنا دیا ہے۔ ”یہ دوستی
ہے“ میری دوستی میرا بیگانگی معقول ترین کہانی محترم مصنف کی شان میں اضافہ کر رہی ہے۔ ”ڈراما سین“ بہت
دلچسپ رہا۔ ”ناسور“ صرف کہانی نہیں اک درس گاہ ثابت ہوئی ہے۔ ”قسمت کے کھیل نزلے ہیں“ روایتی معاشرتی

مارچ 2016ء

کوین
برائے
احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: _____

مکمل پتا: _____

مارچ 2016ء

کوین
برائے
اشاعت
کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

فون رسیل نمبر: _____

مارچ 2016ء

کوین
برائے
پسندیدہ
کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کر رہی ہوں۔ میری رائے میں

اول، عنوان: _____

دوم، عنوان: _____

سوم، عنوان: _____

نام: _____

مصنف: _____

مصنف: _____

مصنف: _____

شہر: _____

”کوئی خوشیاں لا دے“ میں چھوٹا سا اک بچہ ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے، ”شمینہ فیاض روایات کی کہانی“ میں آپ اپنے دام میں بظاہر جو لکھا ہے اس کی روشنی میں تو صاف عیاں ہے کہ بددعا نہیں یعنی چاہیے کہ ”اسا جن“ اول جہالت آخرفطرت۔ ”ایک خبر اور“ افسوس زدہ سی پڑھ کے آگے بڑھنا پڑا۔ ارم ناز صاحبہ کے ”دعا“ میں ”وی سی آر“ کے ہمراہ براجمان تھیں۔ کیا کمال کے حروف الفاظ جملے کہنے کو ملے سکر رہے ہوں؟ ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی

”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی

”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی ”میں سادے سے فقرے ماحول کی منظر کشی بہت پسند آئی۔“ ”حرام خور“ فوہیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھا پایا یہ کہ بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ”قاتل“ لالچ بڑی بلا ہے بھول گیا۔ ”حلاش“ ختم ہوتے ہی ہم شاد ہو کر اٹھ اٹھا۔ ”صدیقی“ نے ”بلند بخت“ ہونے کا مہکتا بار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ شاہ کونل اللہ دیتے کا ہمیں ”ذرا سی“ کا اظہار بنا دیا۔ ”ایک چھوٹی سی نیکی“ پڑھ کے ”اپنا ہو گیا پسنا“ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی پہنچتا ہے۔ ”دعا“ میں دیکھا ہے اس سنے میں۔ نعمان اسحاق ”بادبان“ کا شامیان کھڑا کیے دوران پر آسمان۔ کی

میں پہلی بار کہانیاں ارسال کر رہی ہوں جو کہ حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ امید ہے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ پیاری بہن! خوش آمدید! کہانیاں پڑھنے کے بعد رائے دیں گے۔ تبصرہ تو روانہ کریں آپ۔

☆ ہماری لکھاری سامی اُم عادل، کراچی سے عرض کرتی ہیں۔ خوب صورت ناول کے ساتھ فروری کا شمار نہ صرف ہاتھوں میں ہے بلکہ ہم اسے آدھے سے زیادہ ہضم بھی کر چکے ہیں۔ فہرست کو چیک کیے بغیر ہم آگے بڑھے۔ منزہ صاحبہ کا ادارہ ”اسمارٹ فون“ خوب صورت تجویز کے ساتھ بہترین تحریر بھی۔ احوال میں آنے ایک مرتبہ بغیر جتنے کے اور دوسری بار جتنے کے ساتھ سارے احوال کو نگاہ لیا۔ مگر جب معمول ہمارا نامہ کہیں نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ لپٹ لٹنے والے خطوط بھی ہمارا منہ چڑا رہے تھے کہ تمہارا قصہ یہاں بھی نہیں ہے۔ ہم چونکہ احوال کے بعد رسالہ الٹی کی طرف سے شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہائیڈرک اچھا تھا۔ بس شاعری مجھ میں نہیں آئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ پھیلا کا کیوں ہمارا کوئی مسئلہ نہیں۔ (سوائے رسالے میں نہیں جگہ نہ ملنے کے) آگے آیا ”زہر عشق“ واہ کاش جی۔ جاوید راہی صاحب ہمیشہ کی طرح جاندار کہانی لاتے ہیں زندہ یاد۔ پیارے ممتاز بھیا آپ کی تحریر ازالہ حب روایت بہترین، شاندار، جاندار تحریر کی۔ زندگی کے دکھوں کو اجاگر کرتی اپنا ہو گیا پسنا اچھی لگی۔ بلند بخت اور پرے گزر گئی۔ شانی خانان کی تلاش اچھی کوشش تھی۔ اُن صاحبی ”میرے اپنے لرزائی“ سفر نامہ پڑھنا شروع نہیں کیا۔ جب مکمل ہو جائے گا تو ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھنے میں لطف دے گا۔ ”حرام خور“ اُن ماؤں کے لیے لکھ کر یہ ہے تو اولاد کے بے جانہ اٹھاتی ہیں۔ ارے ارم ناز بہنا خوش رہو، سلامت رہو، ہمیشہ کی طرح معاشرے کی بد صورتی کس خوب صورتی سے نہما تحریر میں لاتی ہیں۔ آپ کو پتا ہی نہیں میں آپ کی تحریروں کی مداح ہوں۔ ممتاز بھیا کی تحریروں کی طرح ایڈیٹنگ کا ایک اور خبر لگا کر چھپا گئے ہیں۔ ہم شکل بھی مکمل ہونے پر ایک ساتھ ہی پڑھیں گے۔ تاکہ ہم بھی کسی سے کہہ سکیں بھی ہمیں ڈسٹرب نہ کریں ہم ناول پڑھ رہے ہیں۔ آستین کے سانپ ابھی ہوئی تحریر تھی۔ ہائے ضرغام محمود آپ نے ”میرا ساجن“ میں کمال ہی کر دیا خوب صورت تحریر۔ منعم اصغر ابھی چھوٹے ہو مگر خوب لکھتے ہو۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اللہ نسرین اختر بہنا اپنی تحریر ناسوز میں آپ نے جس خوب صورتی سے معاشرے میں پینے والی بیماریاں سمجھنے کو واضح کیا ہے بہت ہی خوب ہے۔ بھیا محمد سلیم اختر کی تحریر بھی نہایت شاندار اور جاندار ہوئی ہیں۔ اب اجازت دیجیے۔ محنت سے یہ نامہ لکھا ہے جگہ ضرور دیجیے گا۔

☆ اچھی بہن! آپ یقین کر لیں کہ آپ کا نام ہم تک پہنچ ہی نہ پایا۔ ورنہ ہم تو لپٹ خطوط بھی لگا دیتے ہیں۔

☆ ایم افضل آزاد، ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ دلکش سرورق سے بچا ہوا نامہ ہم تک پہنچ ہی نہ پایا۔ ورنہ ہم تو لپٹ خطوط بھی لگا دیتے ہیں۔ منزہ آپ نے اسمارٹ فون کے بارے میں لکھا تھا۔ آپ کی بات درست تھی۔ جاوید اقبال، راجو شریال کو احوال میں خوش آمدید۔ کنول جی آپ کا احوال بہت اچھا تھا۔ سندھ انور، کنول عمران خان، شاہ زری، منزل خان، اشفاق شاہن بھائی، حنا بشری، قاسم بلوچ، عظمیٰ شکور اسلام آباد سے، سونیا خان، صائمہ مجید ملتان، مجید احمد، سب نے اپنے قلم سے خوب انصاف کیا۔ اسٹوری زہر عشق کو لکھتے ہوئے کاشی بھیا آپ کو ڈر نہیں لگا۔ ہم کو تو رات ڈر لگتا ہے آپ کی اسٹوری پڑھ کر۔ ایک خبر اور ایڈیٹنگ اور میں صبح ”ہم شکل“ ایم اے راحت آستین کے سانپ، ایم یعقوب ”میرا ساجن“، ضرغام محمود آپ اپنے دام میں محمد قاسم خان بلوچ، روایت کی دلدل، شمیمہ فیاض، کوئی خوشیاں لاوے، منعم اصغر قسمت کے حیل برالے ہیں، نازیہ بتول رضا، قاطرہ گل، اعجاز احمد ناسوز، نسرین اختر، ڈراپ سین اقبال بانو، دیویتی ہے، سلیم اختر، ازالہ ممتاز احمد وہ کون تھی شانی خانان، قاتل مقصود احمد بلوچ، حرام خور، نو فز، احسان رانا، وی سی آزارم ناز سب کی اسٹوریاں بہت اچھی تھیں۔ سب نے بہت اچھا لکھا۔

☆ اچھے بھائی! تبصرے کا شکریہ! بس ذرا اپنا احوال ہمیں جلدی روانہ کر دیا۔

☆ یاسر وہی اکاؤنٹ سے اور ملک ندیم عباس ڈھک، ساہیوال سے مشترکہ تبصرہ لے حاضر خدمت ہیں۔ لکھتے ہیں۔

☆ ہمارے ہم دونوں دوست مل کر پڑھ رہے ہیں۔ کیا بات ہے کاشی بھائی جان پرپے کو ترتیب دینا آپ پر ہے۔ حد پیاری ترتیب، انتخاب اور بے حد خوشبودار الفاظ کی کہانیاں کے صفحات پر پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ کہانی کے لیے دعا گو ہیں۔ شاعرے پر دل کھول کر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں مگر ڈرتے ہیں احوال کی بھی ہوئی محفل کے بارے میں کار سے الفاظ قارئین کو پسند بھی آئیں یا نہ آئیں۔ ویسے اجازت تو ہے ناں؟ اپنا رسالہ ہے جی کہانی اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ اس میں شامل ہونے پر محسوس ہوتا ہے کہ جسے اپنوں میں آگئے ہیں۔ احوال میں کہانی اور بھائی سب کو دیکھ کر تے ہو چلو جلدی سے ہمیں بھی خوش آمدید کہو۔ پورا جنگ کی کہانیاں میں آگیا ہے۔ ہمارے عزیز ندیم اور یاسر! شکوہ بجا مگر..... ندیم تم نے جہاں کہانیاں بھیجی تھیں ہم نے دے دیں۔ بلکہ ہم نے اس میں سے ہی کہانی جولائی میں لگائی بھی تھی۔ جب ہم وہاں نہیں تو کیسے لگائیں۔ یاسر وہی سے فون پر بات کی۔ ایک سال سے زیادہ ہوا۔ کہانی اب تک نہ آئی۔ ہمارا قصور؟

☆ احوال! ویسے دیکھو ہمارے ساتھ اس ماہ احوال میں کون شریک ہے۔ ہماری بہت پیاری لکھاری اور ہمارے ہماری آئی پیروفیسر صفیہ سلطانہ مغل، جبکہ آباد سے محبتیں لیے حاضر ہیں۔ پیارے سے بھیا کاشی۔ امید ہے کہ آپ آخریت سے ہوں گے۔

☆ ہمارا نام ستاروں سے لکھی جاتی تھی ☆ یہ عمر کاٹ دی تارے شمار کرتے ہوئے ہمارے کہانیاں کی محبتوں کے لیے معنون بھی ہے اور مسنون بھی۔ تمہاری محبت اور خلوص کی زیر بار ہمارے وقت مل جاتا ہے میں ہی اب بہت تساہل پسند ہو گئی ہوں۔ اب پرانے احباب بھی نہیں۔

☆ ارا سارا سے دے زندگی ☆ یہاں اک دائرے میں دائرہ ہے کہانیاں سب کی سب بہترین۔ بعض ناقابل یقین تھیں۔ مگر یقین کرنا پڑتا ہے کہ دنیا ہست اور نابود کا کھیل ہے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ کردار بدلتے رہتے ہیں۔ اقبال بانو کے ڈراپ سین نے ورطہ حیرت میں لگا کر بہت اچھا اختتام۔

☆ ہمیں بھی ہو گیا لوٹا تو میرے پاس آیا اقبال جی بہت عرصے بعد آپ کے قلم سے ایک سادہ شاہ کار لکھا گیا۔ جبکہ نسرین اختر تمہاری کہانی بھی نپال ٹی کی طرح دانے دار اور دم دار تھی۔ کرداروں پر گرفت اور ان کے کردار متنبہ کرنے والے تھے۔ انجام بالا خردامت پر ختم ہوا۔ کاش ہم ان کے مشکل کو تو ذکر کرنی خودی کو سر بلند کرنا سیکھیں۔ یہ سبق ہمیں اس کہانی سے بخوبی ملتا ہے۔

☆ ہواں ہونے لگی باؤں کو زنجیر کی ☆ نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پاگل رکھا لاکر لکھ کے نام سے موسوم کہانی ہے حدیقت آخری تھی۔ اللہ تعالیٰ ایسی تمام لڑکیوں، نوجوانوں کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔ کاغذ پر ایک نام اتارنا تھا اور بس ☆ پھر ہم تھے یا شیر ہمارا تھا اور بس نازیہ بتول کی کہانی بھی اپنی مصوویت سے زیادہ افادیت کو لیے ہوئے تھی۔ اس کا فیصلہ دانشمندانہ تھا۔

☆ اپنی جگہ چھوڑ دے تو اس کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ آس کے کتنے ستاروں کو بھرا کر آئی ☆ رات آئی تو کئی درد جگا کر آئی شعر و شاعری کا معیار بھی اچھا تھا۔ غزلوں کی تعداد کم ہے۔ شاعری کا حصہ بڑھا دیں۔ (ثواب ہوگا) کیونکہ شاعروں کے دل سے جو دعا نکلتی ہے وہ عرش تک جاتی ہے۔ کہانیاں جتنی پڑھیں ان سب پر تبصرہ حاضر ہے۔

☆ اب اجازت دو۔ انشاء اللہ ہر ماہ حاضری ہوگی۔

☆ ہماری بزم میں آئے ہو بڑی دیر کے بعد۔۔۔ آپی جی! خدا کرے کہ جو آپ نے لکھا وہ پورا ہو۔ آپ کی آمد نے مجھے جو خوشی دی وہ کہاں درج کروں والا معاملہ ہے۔

✽ اکوال تلہ گلگ سے ہمارے مستقل پیارے سے سلیمان شیر لکھتے ہیں۔ دلکش سرورق سے جہاد فروری کی کہانیاں 29 جنوری کو ملا۔ سب سے پہلے منظرہ آئی کہ "اسارت فون" پڑھا۔ واقعی ہمیں اب کوئی "اسارت فون" ایسا دکرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد آپ کی محبتوں کی دنیا "احوال" میں پہنچے۔ ماشاء اللہ احوال میں بھی سب نے خوب تبصرے کیے۔ اللہ پاک آپ کی اسی محبتوں کی دنیا کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ اسماء اعوان لائف بوائے میں پھر ایک خوب صورت کہانی لائیں۔ بھائی محمد سلیم اختر صاحب ہمیشہ کی طرح منفرد اور اچھوتی کہانی لے کر حاضر ہوئے منظرہ آ گیا۔ "ناسور" "نسرین" "خترینا" "فاطمہ گل" "عجاز احمد گلال" ایک خبر اور ایڈیٹر اور یس "حرام خور" فوزیہ احسان رانا "شانی خانان" چھوٹی سی نیکی "ریسہ خالد" میرے اپنے "خنا بھری صلب" کی اس ماہ کی بہت ہی خاص کہانیاں تھیں۔ بھائی ممتاز احمد "ازالہ" کی صورت میں ایک اور خوب صورت شاہ کار لے کر آئے۔ اور جاوید راہی صاحب کی "وہ کون تھی" بہت ہی زبردست تھی۔ "ہم شکل" "ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی آہستہ آہستہ پوری دلچسپی کے ساتھ اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ "بادبان" "نعمان اسحاق کے ناول کی پہلی قسط نے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ اور "زہر عشق" کی قسط نے تو اگلے ماہ کا انتظار اور بھی زیادہ کر دیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ "منسل" یہ ہے" میں بابا جی دیکھی انسانوں کی جو مدد کر رہے ہیں اللہ پاک ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش میں بھی سب کے انتخاب خوب تھے۔

☆ پیارے سلیمان! تمہاری محبت نے ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے۔ تبصرہ بہت جاندار ہوتا جا رہا ہے تمہارا۔ ✽ ہماری آفت کی پڑا۔ سدرہ العلوی، جھنگ صدر سے عرض کرتی ہیں۔ باور فروری کا شمارہ انتہائی دلکش و ناکمل کے ساتھ 31 جنوری کو ملا۔ منظرہ آئی کہ ادارہ "اسارت فون" بہت خوب صورت تحریر لکھی۔ احوال میں سبھی نے بہت اچھا لکھا۔ زریہ آئی کہ احوال حسین جو نیچو، کنول عمران خان، آبی منزویہ ہاشمی، منزل خان آبی، خنا بھری، عظمیٰ شکار، عبدالغفار عابد بھیا، مسٹر پرفیکٹ مجید احمد بھیا، صائمہ مجید بھائی، منظرہ ملک، فرح انیس کے احوال پسند آئے۔ مانی 31 آئی زریہ جو نیچو آپ مجھے شاہین کی کہہ لیا کیجئے۔ ملکہ احوال حسین جو نیچو آپ کیسی ہوتی ہے؟ کنول عمران خان، ڈیز سسر، عبدالغفار عابد بھیا تبصرہ پسند کرنے کا شکر یہ۔ مسٹر پرفیکٹ مجید احمد جانی بھیا آپ کی کہانی کدھر ہے لائف بوائے، رشتے مضبوط بنائے اسماء اعوان نے بہت اچھا لکھا۔ ویلڈن اسماء اعوان، انکل محمد سلیم اختر کی "یہ دوستی" بہت دلچسپ اور میرے خیال میں اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ ڈراپ سین، اقبال بانو کی ناقابل فراموش تحریر ہے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ نسرین اخترینا کی ناسور اپنی نظریں آسمان پر ضرور رکھیں لیکن یہ بھی مت بھولیں کہ سر زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔ عجاز احمد گلال، کی فاطمہ گل، بہت اچھی لگی۔ جب بھی لکھتے ہیں بہت اعلیٰ لکھتے ہیں ویلڈن۔ نازیہ بول رضا کی قسمت کے کھیل نرالے، بہت اچھا لکھا۔ منعم اعصر کی کوئی خوشیاں لادے ویلڈن منعم۔ روایات کی دل دل، شمیم فیاض، قاسم خان بلوچ کی، آپ اپنے دام میں، ضرغام محمود کی میرا ساجن، محمد یعقوب کی "اسین کے سانپ" پہلا شعلہ سی ایڈیٹر اور یس "حرام خور" فوزیہ احسان کی "حرام خور" تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ سین مرد تین کہانیاں میں، خنا بھری میرے اپنے، مقصود احمد بلوچ، قاتل شانی خانان "تلاش" خوب لکھا۔ شاہ کنول کی ایک چھوٹی سی لفظی، "ریسہ خالد"، "چھوٹی سی نیکی" "الما س فاطمہ" "امان کی"، اپنا ہو گیا "سنا" "بادبان" "نعمان اسحاق"، "ازالہ" ممتاز زاحم بھیا، بہت اچھی تحریریں تھیں۔ کار جہاں دراز ہے میں انکل جاوید راہی، "وہ کون تھی" "کمال لکھا۔ کاشی بھیا کی زہر عشق بہت اچھی جا رہی ہے۔ ہم شکل میں کوئی نہیں پڑھتی ہوتی اس کے لیے معذرت، ہائیڈ پارک میں

ان لوگوں کے انتخابات پسند آئے۔ تیرنیم کش میں سب کے اشعار پسند آئے۔ مقصود احمد بھیا میں خبر سے ہوں آپ کی "عبدالعزیز انکل" شعی عزیز بھیا، شائستہ جمال، شمیم ناز آبی پلیر واپس لوٹ آئیں۔ اب تک کے لیے انتہائی اعلیٰ لکھنے میں تب تک اپنا بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ اللہ بھیاں۔

✽ لائف سے یہ آمد ہے ہمارے پیارے بھائی محمد یوسف لغاری کی۔ لکھتے ہیں۔ ہر دفعہ وہ جتنا ہوں کہ اس دفعہ شمارے پر ہر دفعہ کرتا ہے مگر جب تک رسالہ قائم ہوتا ہے اس وقت ہم مقررہ تاریخ گزار چکے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے پناہ لکھنا کہ ہونا بقول شاعر احساس مروت کو چل دیتے ہیں آلات۔ سب سے پہلے تو میری طرف سے تمام ایوارڈ وزر ہوں خصوصاً سسر، شمع حفظہ، اقرا سیف اور پیارے بھائی مجید احمد جانی دشعبان کھوسہ کو مبارک باد قبول ہو۔ یہاں کہانی میں ایڈ نے اک دم کہانی کو نیا رخ دیا بلاشبہ اک بہترین کہانی۔ اقبال بانو کی کہانی ویسٹ نے بہت متاثرہ کیا۔ وہ ویسٹ آج کے دور میں بھی جاری و ساری ہے کیونکہ یہ ایک ایسے رشتے کا خاندانی سسٹم ہے جس سے اگر ایک شخص کو بھی مسئلہ ہو تو دوسرے گھر میں خود بخود مسئلہ ہو جاتا ہے محترمہ اقبال بانو نے اس پر خوب قلم لکھا۔

✽ یوسف پیارے! آئندہ بھی ایسی ہی پھرتی دکھانا تاکہ ہم بھی فخر یہ کہہ سکیں کہ اہل محبت چھپ کر نہیں لکھتے پڑ سائے آتے ہیں۔

✽ کفرہ ملک، قاسم پور کا لونی، ملمان سے شامل احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سلام محبت! راستہ دو پیچھے ہٹو! مجھے کاشی کو سلام تو کرنے دو! ظالمو! اتنی بیخیز میں کم سن لڑکی کو جگہ نہیں مل رہی۔ کاشی بھیا کیسے ہیں؟ والسلام تو کہہ لیں کہ فروری کا کچی کہانیاں پچھلوں کے بارے میں بک اسٹال پر میرے انتظار میں تھا۔ جلدی جلدی اپنے ہاتھوں میں قید کر لیا، ٹوٹا، چم اور بیگ میں چھپا لیا (بہنیں نظر ہی نہ لگ جائے) اتنا پیار اچھے۔ منظرہ سہام کا ادارہ یہ زبردست تھا کہ ان لوگوں کے جذبات جاننے کی کیونکر فکر لاحق ہو گئی۔ جانو تو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔ جانوروں میں پیا کی ہے اور وفا بھی مگر انسان ان جانوروں سے بھی گیارا کرتا ہے۔ کیوں میں نے ٹھیک کہاں؟ کاشی بھیا جب آپ لکھتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ لیوں پہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ سدا خوش رہیں۔ سب دوستوں کا شکر یہ کہ ان لوگوں نے مجھے یاد رکھا۔ بھی کے تبصرے پیارے تھے۔ کہانیوں میں زہر عشق مزے لے لے کر پڑھی کیوں کہ مجھے کہانیاں بہت پسند ہیں۔ بادبان ناول پہلا حصہ اچھا رہا۔ وہ کون تھی۔ جرم کہانی ٹھیک رہی۔ ازالہ میں انکل ممتاز احمد "نسرین" درس دیا ہے۔ ماموں مجید احمد جانی کی کہانی اس بار پڑھنے کو نہیں ملی۔ کیوں؟ حرام خور، ایک خبر اور ویسی ہی اچھی ہے اپنے، ڈراپ سین، ناسور، آپ اپنے دام میں، میرا ساجن، پیاری کہانیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی اچھی لکھا۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش، مسئلہ یہ ہے کچی کہانیاں کی شرگ ہیں۔ اس بار کچی کہانیاں بہت دل کو بھایا۔ کاشی بھیا، لائف آپ کی محبتوں کا شکر ہے جو ہمیں کچی کہانیاں بروقت اور لا جواب مل جاتا ہے۔ اب اجازت۔

☆ ہماری سی کفرہ! اگر تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ہمیں تو انتظار رہتا ہے تمہارے تبصرے کا۔ ✽ ڈاکٹر خادم حسین، رجب والا، بدھلہ سنت روڈ ملمان سے برتی تائے کے ساتھ احوال میں موجود ہیں۔

✽ عمل کرتے ہیں۔ امید ہے خیریت سے ہوں گے اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھائے ہوں اور نبھا رہے ہیں، جس کا واضح ثبوت کچی کہانیاں کا بروقت مل جانا ہے۔ باور فروری کا کچی کہانیاں پا کر جہاں خوشی ہوئی وہاں دل کمین بھی ہوا۔ خوشی اس لیے کہ بہت پیارا پڑ چرنا منع ہوا اور کمین اس لئے کہ اس میں مجید احمد جانی کی کہانی شامل حال نہیں ہے۔ اللہ خیر کرے خیریت سے ہوں۔ ادارہ میں منظرہ سہام نے جاہلیوں کے لیے ہر صورت بات کی ہے۔ کاش کے جابانی ادھر کان بھی دھریں۔ احوال میں کاشی بھائی کی باتیں پسند آئی اور اللہ عمل کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ بھی کہ سبھی تبصرے خوبصورت اور جاندار تھے۔ ہاں البتہ اس بار نے

لوگوں کی اکثریت تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سچی کہانیاں پڑھنے والے روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ بڑی خوش آئند بات ہے۔ مجید احمد جانی، صاحبہ مجید ممتاز احمد، شعبان کھوسہ، منزل خان، حنا بشری، مسز نوید باغی کے تبصرے زبردست رہے۔ نئے احوالیوں کو ستم اللہ کہانیوں میں "ازالہ ممتاز احمد کی کہانی" نے کافی متاثر کیا۔ وی، بی، آر، یہ دوستی ہے، نامور، تلاش، ڈراپ سین، آستین کا سانپ، میرے اپنے حرام خور، خوب تر تحریریں تھیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ زبردست سفر نامہ ہے۔ زہر عشق نے تو کوڑوں میں دوڑتے خون میں بھی وحشت بھردی ہے۔ جن، نوکر کی شکل میں محبوب کے آگے پیچھے کھوستا پھرتا ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش اچھے چل رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے میں باباجی، نیکیاں کمار ہے ہیں۔ مصروفیات سے وقت نکال کر جتنا سچی کہانیاں پڑھا آتنا تبصرہ کر دیا ہر مصروفیات سے وقت نکال کر کہانی لکھ رہا ہوں جیسے ہی مکمل ہوتی ہے روانہ کر دوں گا۔ اب اجازت، سب کو خلوص بھر اسلام۔

☆ ڈاکٹر صاحب! خوش باس رہیے۔ آپ کی تحریر کا شدت سے منتظر ہوں۔ تبصرے کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔

☆ بھٹی شاہ گردیز، کوئلہ رحم علی سے سونیا خان عرض کرتی ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں بروقت مل گیا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ادارہ میں منظرہ سہام "اسارٹ فون" کی تعریف کرتے ہوئے جاہلیوں کی کم عقلی کو وار دے رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھیا، ہمیشہ کی طرح سچی باتیں کر رہے تھے۔ باجی سدرہ انور، مہین زریں جو، مجید احمد حسین، سید ملازم حسین، حنا بشری، محمد قاسم خان، عظمیٰ شکور، انکل ممتاز احمد، صاحبہ مجید پیارے باغی، فرخ انیس، سید ملازم حسین، مسز نوید باغی، مسلمان شہیر، مسز نوید مجید احمد جانی، راشد لطیف مبرو، ڈاکٹر خادم حسین اور کزنہ ملک کے تبصرے بہت پیارے تھے۔ اس بار جنگ بازی لے گیا اور سدرہ انور نے خوب سچی کہانیاں متعارف کروایا۔ نئے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید۔ اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ کہانیوں میں زہر عشق سب سے پہلے پڑھی۔ پیچھے سلیمان (جن) اپنی محبت کی خاطر خاطر کیا کہیں بدلیں رہے ہیں، شروع میں پنے کی شکل میں آئے، پھر ہم شکل بھی بنایا اور اب محبوب کے دیدار کے لئے نوکر بن کر اس کی حویلی میں گھوم پھر رہا ہے۔ سچی تو کہتے ہیں عشق کہیں چھوڑتا۔ ازالہ میں ممتاز احمد، نواد کی کہانی پیش کر رہے تھے، پیارے کو خواہ مخواہ رات بھر پولیس کی راکھانی پڑی لیکن رب کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اس ایک رات کا ازالہ بھی خوب ہوا۔ گریت انکل جی! اس بار میرے فیورٹ لکھاری مجید احمد جانی کی کہانی کہاں گئی۔ ان کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ سا ہوا۔ بادبان ناول کا پہلا حصہ اچھا لگا اور وی آر میں دینو نے اپنا دین گوا دیا۔ ایک اور خبر نے حیرت میں مبتلا کر دیا، آج، آٹھ سالہ لڑکے کو اسٹاپ پر بٹھایا گیا لیکن پیچھے خود ہی درندوں کا شکار ہو گیا۔ قسمت کے کھیل بھی پیاری لگی۔ ڈراپ سین میں ایک عورت نے دوسری عورت کی کوشش ناکام بنا کر اپنا گھر اجڑنے سے بچالیا۔ اسی طرح تلاش، میرے اپنے، حرام خور، اپنا ہو گیا سپنا، وہ کون تھی، ناسور، یہ دوستی ہے، میرا سامن بہترین کہانیاں تھیں۔ اور اتنا پیارا شائع کرنے پر ہم پیش کرتے ہیں سلوٹ اور چاہتے ہیں آپ سب سے اجازت، اگلے پرچے میں ہونگی پھر ملاقات بشرط زندگی سلامت۔

☆ اچھی لڑکی! تمہارے پیارے تبصرے پر ہماری طرف سے محبت کی چھٹی اور اگلے ماہ کے لیے انتظار۔
☆ ہماری صاحبہ مجید ملتان شریف سے تھی ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں چھوڑا لیت ملا۔ نجانے ملتان میں سچی کہانیاں لیٹ کیوں آتا ہے۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ سرورق کی دوشیزہ محبت کا پیغام مسکرا کر دے رہی تھی۔ نجانے محبتیں تائید کیوں ہوتی جاری ہیں۔ نفرتوں کا انبار ہے اور بھائی، بھائی کا دشمن ہے۔ اسی کا اظہار منظرہ سہام بھی ادارہ

☆ "فون" میں کر رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھیا کی سچی باتیں گرویدہ کر گئیں۔ سنبل آپنی مبارک ہو۔ سدرہ انور اسلام فتح گیا اور (والسلام) یاد رکھنے کا شکریہ۔ مہین زریں جو، مجید احمد، شعبان کھوسہ، منزل خان، حنا بشری، مسز نوید باغی کے تبصرے زبردست رہے۔ نئے احوالیوں کو ستم اللہ کہانیوں میں "ازالہ ممتاز احمد کی کہانی" نے کافی متاثر کیا۔ وی، بی، آر، یہ دوستی ہے، نامور، تلاش، ڈراپ سین، آستین کا سانپ، میرے اپنے حرام خور، خوب تر تحریریں تھیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ زبردست سفر نامہ ہے۔ زہر عشق نے تو کوڑوں میں دوڑتے خون میں بھی وحشت بھردی ہے۔ جن، نوکر کی شکل میں محبوب کے آگے پیچھے کھوستا پھرتا ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش اچھے چل رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے میں باباجی، نیکیاں کمار ہے ہیں۔ مصروفیات سے وقت نکال کر جتنا سچی کہانیاں پڑھا آتنا تبصرہ کر دیا ہر مصروفیات سے وقت نکال کر کہانی لکھ رہا ہوں جیسے ہی مکمل ہوتی ہے روانہ کر دوں گا۔ اب اجازت، سب کو خلوص بھر اسلام۔

☆ ڈاکٹر صاحب! خوش باس رہیے۔ آپ کی تحریر کا شدت سے منتظر ہوں۔ تبصرے کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔

☆ بھٹی شاہ گردیز، کوئلہ رحم علی سے سونیا خان عرض کرتی ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں بروقت مل گیا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ادارہ میں منظرہ سہام "اسارٹ فون" کی تعریف کرتے ہوئے جاہلیوں کی کم عقلی کو وار دے رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھیا، ہمیشہ کی طرح سچی باتیں کر رہے تھے۔ باجی سدرہ انور، مہین زریں جو، مجید احمد حسین، سید ملازم حسین، حنا بشری، محمد قاسم خان، عظمیٰ شکور، انکل ممتاز احمد، صاحبہ مجید پیارے باغی، فرخ انیس، سید ملازم حسین، مسز نوید باغی، مسلمان شہیر، مسز نوید مجید احمد جانی، راشد لطیف مبرو، ڈاکٹر خادم حسین اور کزنہ ملک کے تبصرے بہت پیارے تھے۔ اس بار جنگ بازی لے گیا اور سدرہ انور نے خوب سچی کہانیاں متعارف کروایا۔ نئے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید۔ اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ کہانیوں میں زہر عشق سب سے پہلے پڑھی۔ پیچھے سلیمان (جن) اپنی محبت کی خاطر خاطر کیا کہیں بدلیں رہے ہیں، شروع میں پنے کی شکل میں آئے، پھر ہم شکل بھی بنایا اور اب محبوب کے دیدار کے لئے نوکر بن کر اس کی حویلی میں گھوم پھر رہا ہے۔ سچی تو کہتے ہیں عشق کہیں چھوڑتا۔ ازالہ میں ممتاز احمد، نواد کی کہانی پیش کر رہے تھے، پیارے کو خواہ مخواہ رات بھر پولیس کی راکھانی پڑی لیکن رب کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اس ایک رات کا ازالہ بھی خوب ہوا۔ گریت انکل جی! اس بار میرے فیورٹ لکھاری مجید احمد جانی کی کہانی کہاں گئی۔ ان کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ سا ہوا۔ بادبان ناول کا پہلا حصہ اچھا لگا اور وی آر میں دینو نے اپنا دین گوا دیا۔ ایک اور خبر نے حیرت میں مبتلا کر دیا، آج، آٹھ سالہ لڑکے کو اسٹاپ پر بٹھایا گیا لیکن پیچھے خود ہی درندوں کا شکار ہو گیا۔ قسمت کے کھیل بھی پیاری لگی۔ ڈراپ سین میں ایک عورت نے دوسری عورت کی کوشش ناکام بنا کر اپنا گھر اجڑنے سے بچالیا۔ اسی طرح تلاش، میرے اپنے، حرام خور، اپنا ہو گیا سپنا، وہ کون تھی، ناسور، یہ دوستی ہے، میرا سامن بہترین کہانیاں تھیں۔ اور اتنا پیارا شائع کرنے پر ہم پیش کرتے ہیں سلوٹ اور چاہتے ہیں آپ سب سے اجازت، اگلے پرچے میں ہونگی پھر ملاقات بشرط زندگی سلامت۔

☆ بھائی راشد! سلامت رہو! ہمارے بھائی کی بھیلی کہانی نے مایوس کیا۔ پلیز مطالعہ وسیع کر لو بھائی!
☆ ہمارے بھائی مجید احمد جانی، ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ ماہ فروری 2016ء کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ ملا۔ سرورق شاندار اور جاناں تھا۔ مسکرائی دوشیزہ بھلی لگی۔ ٹائٹل دیدہ زیب تھا۔ ادارہ میں منظرہ سہام نے "اسارٹ فون" کمال لکھا۔ احوال میں کاشی بھیا کی باتیں دل کو

لگیں۔ اور جن دوستوں نے میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند سے نوازا، تمام کامنتوں و مشکوٰۃ ہوں۔ اُن تمام کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری صحت یابی کے لئے دعائیں کیں۔ یقیناً یہی دعائیں تو ہیں جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سدرہ انور علی بہن، مسٹر پرفیکٹ خیریت سے ہے۔ اس بار احوال میں نئے لوگ زیادہ اور پرانے کم تھے۔ نئے احوالیوں کو خوش آمدید اور پرانے کو کم بیک کرنے کی درخواست کروں گا۔ کاشی بھیا، پرزور اپیل وہی کہ آپ کی نظم اس بار بھی نہیں پڑھنے کو ملی۔ کیوں؟ منزل خان! تیسرا سچی کہانیاں آنٹی لے جاتی ہیں۔ کہانیوں میں ایک خبر اور، ایڈیٹس نے کمال تحریر لکھی۔ وی سی آر زبردست تحریر تھی۔ ازالہ، ممتاز احمد پلیٹ فارم سے جڑی تحریر پر لائے۔ یاد بان ناول کا پہلا حصہ خوب رہا۔ ڈراپ سین بھی کمال تھی۔ ناسور، یہ دو قی ہے، روایات کی دلدل، فاطمہ گل، کوئی خوشیاں لاوے قسمت کے کھیل، میرا ساجن، حرام خور، میرے اپنے، بلند بخت، اپنا ہو گیا سپنا، ذرا سی غلطی، بہترین کہانیاں تھیں۔ جرم کہانی ”وہ کون تھی“ معاشرے کی عکاس تحریر تھی۔ زہر عشق کا بار احوال حصہ مڈ اسراریت کی بلند یوں کو چھو رہا تھا۔ بھارت میں بلیک لسٹ کا دوسرا حصہ زبردست رہا۔ لائف بوائے خوب لکھی گئی۔ اس کے علاوہ ہائینڈ پارک، تیرنیم کش، چھائے رہے۔ محبتوں کا درس دیتے فروری کے ساتھ سچی کہانیاں بھی محبتوں سے سجا تھا۔ مبارک باد اینڈ ویلڈن، ٹیک کثیر اینڈ بائے بائے۔

☆ پیارے مجید! تم سے احوال کے اشارت میں ہم نے جو پوچھا ہے۔ اس کی وضاحت جلد دو۔ ہمیں تمہارے غلوں پر شک نہیں لیکن جب گواہیاں دو ہو جائیں تو پھر بندہ مجرم گردانا جاتا ہے۔
✉ ہمارے لکھاری ساتھی علی حسنین تابش چشتیاں سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ماہ فروری کا شمارہ موصول ہوا تو یوں لگا ویران کشن میں بہار آئی ہو۔ پھولوں میں خوشبو اُمنڈ آئی ہو۔ نائل نے تول کو مسرور کر دیا۔ نائل لا جواب تھا۔ منزہ سہام جی کا ادارہ ”اسارٹ فون“ خوب صورت الفاظ کا چناؤ تھا۔ اچھا لکھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انسان کی دلی کیفیت سے آشنا کروانے والا اسارٹ فون ہو تو انسان اکابر دوسرے سے دور کیا ہزاروں میل دور کنارہ کشی اختیار کر جائے۔ کہانیوں کی فہرست میں مجید بھائی کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ ہو گیا۔ احوال کی محفل میں سب دوست خوب صورت محبت نائے لے کر حاضر ہوئے۔ ڈیزر منزل یہ تو کاشی بھائی کی محبت ہے کہ مجھے تھا کہتے ہیں۔ رب کے فضل و کرم سے میں ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ پاسٹ پاسٹ بھی ہوں۔ جن دوستوں نے میرا تجربہ پسند کیا۔ ان کا بے حد مشکور ہوں۔ اپنا لیٹر نہ پا کر دل افسردہ ہو گیا۔ شاید دفتر کے کمپیوٹر کا وائرس میرا لیٹر آڑا گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کاشی بھائی کے ناول کا مطالعہ کیا۔ بہت کمال لکھتے ہیں۔ ایڈیٹس اور ایس مسج صاحب آپ کی کاوش بہترین تھی۔ بہت اچھا لگتے ہو۔ شمع اصغر ممتاز احمد ایم یعقوب کے ساتھ ساتھ سب کی کہانیاں اچھی تھیں۔ ہائینڈ پارک اور تیرنیم کش بھی اچھے رہے ہیں۔ اب اجازت دیں۔

☆ پیارے حسنین! خوش رہو۔ احوال میں باقاعدگی تم سب کی محبت ہے۔

ساتھیو! ساری محنتیں سیکھا کر کے پہلا پراسرار نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کیسا لگا؟ اسے پڑھیے اور اپنے تبصروں میں لکھ دیجیے۔ آپ کی آراء ہمارے لیے بہت محترم ہے۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اگر زندگی نے وفا کی۔ تب تک کے لیے اجازت۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان



کیونکہ صحت ہے احوال
مرحباً اسپغول



Fair & Lovely

30 سال
سے قابل
اعتماد نام



بیوی گانیا
مہرین اسماعیل
صحت اور خوبصورت زندگی

خواتین روزمرہ زندگی میں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ اپنے لیے ہی بھول جاتی ہیں۔ اپنے گھریلو کام کاج کی مصروفیات ملازمت بچوں یا بچوں کی نگہداشت میں وہ اتنی مشغول ہوتی ہیں جس کی صحت اور جاذبیت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کھونے لگتی ہے۔ سب کاموں کو صحیح طریقے سے انجام دینے کیلئے ان کو اپنے صحت مند زندگی کیلئے ضروری ہے کہ اپنی فٹنس کو قائم رکھیں۔ صحت مند زندگی کیلئے ضروری ہے روزمرہ زندگی میں ہلکی ورزش کرے ہر خاتون چاہتی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست رہے ہمیشہ دلکش نظر آئے اور جب تک ہو سکے بڑھاپے کے اثرات سے جو خواتین ورزش نہیں کر رہی ہوتیں اس کا مطلب ہرگز نہیں وہ ورزش کرنا ہی نہیں چاہتیں ”ان کی وجوہات“ کئی ہیں۔ متوازن غذا کا استعمال خواتین کو علم ہی نہیں ہوتا ورزش ان کے لیے فائدہ مند ہے۔ ورزش کیلئے ہونا۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا جاتا ہے جس کی کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان بیماریوں کو بچنے کیلئے دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔

☆ مکمل غذا

☆ ورزش

یاد رکھیں کہ کم کھانا اتنا ہی
وہ ہے جتنا زیادہ
مشاہدہ

Fair & Lovely

30 سال
سے قابل
اعتماد نام



ہیں کہ ہم ان کے پروں کی پھر پھر اہٹ صاف سن سکتے ہیں۔ اماں بی! کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا؟

”کیوں نہیں لگتا لیکن کچھ کام ایسے ہیں جن سے ہمارے بزرگ روکتے چلے آئے ہیں اس لیے۔“

بات ادھوری تھی کہ فریہ تالی بجا کر بولی۔ ”وہ دیکھیے ادھر سفیدے کے پیچھے سے ایک اور غول آ رہا ہے۔ ہائے کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتی، سچ، کتنا مزہ آتا۔ ہر دم کھلی فضاؤں میں اڑتی پھرتی۔“

ماں نے پھر اس کی محویت میں خلل نہ ڈالا، خنکی ہونے کے باوجود خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

جاگیر اور دولت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر بھی آن بان اور روایت کی پاس داری اس خاندان کے خمیر میں شامل تھی۔ بیٹے سمجھدار تھے، بچے سمجھے سرمائے کو تجارت میں لگا دیا تھا۔ کچھ آبائی

مکانوں کا کرایہ ملتا اور یوں خاندانی ٹھات باٹ نہ سہی لیکن خوش حال زندگی گزر رہی تھی۔ ماں بیٹوں کی نگاہوں کا مرکز فریہ تھی۔ چھوٹی موٹی کے

پودے کی طرح اسے سرد و گرم سے بچایا جاتا اور ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی لیکن فریہ کے نازک جسم میں ایک سیہابی روح تھی جو کبھی

آسمان کی وسعتوں میں کھو جانا چاہتی، تو کبھی سمندر کی گہرائیوں کی متلاشی رہتی۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر بھائیوں نے گرلز کالج میں داخلے کی

اجازت دے دی تھی خاص طور پر اس کی سہولت کے لیے ایک چھوٹی گاڑی خریدی گئی تھی۔ باعتبار اور تو منہ ڈرائیور ڈھونڈا گیا تھا جو بہ وقت ضرورت باڈی گارڈ کے فرائض بھی انجام دے

سکتا تھا۔ اس کے باوجود فریہ کی واپسی تک ماں کا دل ہولناک رہتا۔ وہ بار بار بیٹی کے خیالی پیکر کے آیت الکرسی کا حصار باندھا کرتیں۔ وہ حتیٰ بھی ایسی حسین اور جاذبِ نظر شخصیت کی مالک کہ ہر

بھی دیکھتا اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ جوان ہوتے ہی رشتوں کی بھرمار ہو گئی تھی جن میں سے بڑی سوچ بچار اور استخارے کے بعد نواز کے

رشتے کو قبولیت کی سند بخشی گئی جو نہ صرف فریہ کا تایاز اور بچپن کا ساتھی تھا بلکہ حسن و دو جاہت میں خود بھی یکساں تھا۔ فریہ کے دل میں اس کے نام

ہی سے سریلی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ تنہائی میں وہ پہروں اسی کے خیالوں میں مگن رہتی۔ کبھی مسکراتی، کبھی خود ہی شرم سے دہری ہو جاتی۔

دونوں گھرانوں میں منشی کے بعد ہی سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں لیکن شادی اس وقت تک ملتوی کر دی گئی تھی جب تک نواز C.A کا اور فریہ B.A کا امتحان پاس نہ کر لے۔

☆.....☆.....☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب فائل کے امتحانات کے بعد رزلٹ کا انتظار اور طویل چھٹیاں فریہ کو بے زار کئے ہوئے تھیں کہ فریہ کے

اسکول کے زمانے کی سہیلی راشدہ کی شادی طے پا گئی۔ اپنے مزاج کی سادگی اور خوش خلقی کی بنا پر فریہ ہر طبقے کی لڑکیوں میں مقبول تھی۔ راشدہ کا

شمار بھی انہی میں سے تھا جو نظر معاشرتی اعتبار سے یکسر مختلف تھی۔ اس کا تعلق ایک زمین دار خاندان سے تھا۔ راشدہ کا باپ اپنے گاؤں کا

چوہدری اور انتہائی قدامت پسند تھا۔ راشدہ اس کی چہیتی بیٹی تھی جس کی ضد کی وجہ سے اس نے اسے اسکول تو بھیج دیا تھا لیکن چھٹی جماعت کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ یہ طبیتوں

کا طرز الی تھا جس کی وجہ سے اب تک دونوں ماں کی دوستی بھری رہی تھی۔ راشدہ اپنے ماں کے ساتھ کئی بار فریہ سے ملنے اس کے گھر

آئی لیکن خود فریہ کبھی گاؤں کی جھلک نہ دیکھ سکی۔ اب جو شادی کا بلاوا آیا تو چل گئی۔ اس کا

دل بے تاب تھا۔ پیارے ضد سے روٹھ کر اس کو بہا کر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا

لی۔ اس وقت بھی اس نے یکے بعد دیگرے کئی کئی بار کہا۔ ”اماں بی! وہ ہماری بڑی پیاری سہیلی ہے۔“

”اور تمہارے جانے سے دونوں بھائی جو خفا میں آئے۔“ ماں نے تاویل پیش کی۔

”اب آپ منال بھیجے گا۔“ اس کے پاس حل نہ تھا۔

”ماں! میں بھلا اتنی دور تمہیں کیسے بھیج دوں گی۔“

”ہم آپ کے پاؤں دبا دیں گے۔“ اس نے طعنے سے اپنی خدمات پیش کیں۔

”دبانے سے کہیں جاتے ہیں یہ بڑھاپے کے درد۔ بس کہہ دیا میں نے کہ تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔“

”ہائے اللہ! یہ بھی تو سوچیں کہ ہم نے کبھی اس نہیں دیکھا اس بہانے وہاں کی سیر بھی کر کے۔“

”ہاں ضرور۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”اچھی طرح اندازہ ہے ہمیں ان کی طبیعت کا“

آپ سے بھی زیادہ ظالم ہیں وہ۔“ ”میں ظالم ہوں؟“ اماں بی نے حیرت سے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا۔“ وہ باقاعدہ سکے گی۔ ”ہم تو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں قید کیے جائیں گے پھر قبر میں اتر جائیں گے سارے اربابوں سمیت۔“

ماں کا دل بھر آیا۔ بیٹی سے جدائی کی گھڑی قریب تھی گواہ اپنے رشتے داروں ہی میں جاری تھی

پھر بھی سسرال تو سسرال ہی ہوتی ہے نا وہاں جا کر تو اس طرح ضد بھی نہ کر سکے گی میری بیٹی! وہ چیخ گئیں۔ ”کون سی تاریخ ہے راشدہ کی شادی کی؟“

”بیس مارچ۔“ اس نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔ ”لیکن مجھے تو ایک ہفتہ پہلے بلایا ہے اس نے۔“

”ہرگز نہیں اتنے دن تم گھر سے باہر کیسے رہ سکتی ہو؟ بھائیوں کا یہ حال ہے کہ آتے ہی تمہیں پکارتے ہیں۔ دو گھڑی نہ دیکھیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں کسی طرح انہیں نہیں سمجھا

سکتی۔ جانا ہے تو صرف شادی والے دن چلی جاؤ۔ ویسے بھی اگلے ہفتے زوہیب اور شعیب شکار پر جا رہے ہیں۔ تم صبح سے شام تک سہیلی کے پاس رہ سکتی ہو لیکن شرط یہی ہے کہ اگر رخصتی میں

دیر ہو تو سب سے معذرت کر کے ہر حال میں اندھیرا پھینکنے سے پہلے واپس آ جانا۔“ ”چلیے یوں ہی سہی۔“ اس نے بخوشی قبول کر لیا کیوں کہ اتنا بھی توقع سے بڑھ کر تھا۔

”اور مول بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فریحہ نے زور زور سے گردن ہلا دی۔

اسی رات اس نے اپنا سوٹ کیس تیار کر لیا۔ ایک ہی دن کی تو بات تھی اسی حساب سے کپڑے اور زیور رکھے گویک اپ کی عادی نہ تھی لیکن ایسے موقعوں پر امنگ پیدا ہو ہی جاتی ہے لہذا سنگھار کا سامان بھی پرس میں بند کر لیا گیا۔

اگلے دن اماں بی نے راشدہ کے بندے انگوٹھی اور بھاری سا جوڑا بھی منگووایا۔

وہ تو گاؤں جانے کے خیال سے بے حد خوش تھی لیکن نہ جانے کیوں اماں بی کا دل دہلا جا رہا تھا؟ کئی بار سوچا اب بھی جانے سے روک لیں لیکن جب اس کا معصوم چہرہ خوشی سے دمکتا پاتیں تو خاموش رہ جاتیں پھر بھی صبر نہ ہوا تو اپنے قریب بٹھا کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ ماں کو افسردہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا اماں بی؟“

”کچھ بھی نہیں، بس خواہ مخواہ جی گھبرا رہا ہے میرا۔“

”طبیعت خراب ہے آپ کی؟“ وہ بے چین ہو گئی۔

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس تم سے یہ کہنا ہے کہ پہلی بار انہی کسی کے گھر جا رہی ہو، نیا ماحول ہے اور اجنبی لوگ ہوں گے۔ تمہاری کسی حرکت یا بات سے خاندان کے وقار پر حرف نہ آئے۔ لڑکیوں کے بیچ میں جا کر خود بھی انہی کے رنگ میں نہ رنگ جانا۔ اچھی طرح یاد رکھنا کہ تمہارا تعلق کس با عظمت خاندان سے ہے جہاں لوگ اپنی جان سے بڑھ کر عزت کو اہم سمجھتے ہیں۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں.....“ اس نے

احتجاجاً کچھ کہنا چاہا۔

ماں نے ٹوک دیا۔ ”جانتی ہوں کہ تم ہواپنے خون پر بھی بھروسہ ہے مجھے پھر بھی اس میں کیا حرج ہے؟ تم بہت چھوٹی نہیں ہو، بیوہ ہوئی تھی۔ میرا آسمان میرے سر سے تھا لیکن میں نے خود کو اس چھت کے نیچے مقید کر لیا جسے تمہارے والد محترم نے تعمیر کرایا تھا۔ معزز خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں پر سوائے اس کے باپ، بھائی اور شوہر کے کسی غیر مرد کی نظر پڑی۔ یہ تو نئے دور کے تقاضے ہیں کہ تمہیں آزادی مل گئی ہے پھر بھی اپنی روایات و بغاوت نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ ماں کا خون تمہارا گردن پر ہوگا۔“

”اماں بی!..... آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے ہم ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔“

”ماں ہوں نا، اتنی ذرا سی جدائی بھی گوارا نہیں ہے مجھے۔ اگر تمہاری ضد نہ ہو تو.....“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”اچھا اماں بی! خدا حافظ!“ اس نے اپنے سے ان کا ہاتھ تھام کر اجازت لی۔ تھوڑا وقت تھا وہ بھی ان کے چند نصائح میں گزر رہا تھا لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ ڈرائیور کے تعلقین کی گاڑی آہستہ چلانے اور صاحب زادائی کی حفاظت کے لیے کہا۔ مول بی سے، بھائی بھوے رہنے کی تاکید ہوئی اور یوں تین نفری کا روانہ ہوا۔

☆.....☆.....☆

راستے کے مناظر فریحہ کا دل بھاتے رہے۔ وہ بڑے اشتیاق سے کھیتوں، کسانوں اور مویشیوں کو دیکھتی رہی، کھلی فضا میں اتنا لمبا سفر

اس کا پہلا اتفاق تھا۔ راشدہ کے گاؤں کے دو گھنٹے چنکی بجاتے گزر گئے پھر جس گاؤں سے وہاں اس کی پذیرائی ہوئی، رنگ رنگ کی چٹائیوں کی سجائو، چمکتی دھاتی دیہاتی چائے کی پیالی، چہل پہل سب کچھ اس کے لیے تیار تھا۔

انہیں بھاڑ کر ہر چیز کی تفصیل اپنے دل میں اماں بی کو بتانے کے لیے محفوظ کر لینا تھا۔ دوسرے حیرت و شوق سے ہر طرف نگاہیں ڈال رہی تھیں اور اس کا اپنا وجود سب کے لیے نظر آ رہا تھا۔

اس اور عورتیں گھور گھور کر اس کا چہرہ اور ہاتھ دیکھ رہی تھیں اور اس کے متوجہ ہو جانے پر انہیں ہنسنے کی کوشش کرتیں۔ ایک لڑائی پر لگی ہوئی تھی کیونکہ اپنے بے پناہ دلچسپی اور کھار کے ساتھ وہ سب سے منفرد دکھائی دیتی تھی۔

وہ راشدہ کے پاس پہنچی تو حیران رہ گئی۔ دلہن اس پر خوب روپ آ رہا تھا مگر اس کی سادہ سی لباس زیب تن کر رہی تھی۔ بال بہت زیادہ عجیب و غریب نظر آ رہے تھے۔

”راشدہ! یہ..... یہ تمہارے بالوں کا حشر۔“

”کیوں! کیا ہوا ہے میرے بالوں کو؟“

”اے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُسے مزید تاؤ اس وقت آیا جب وہ اپنی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”اے اچھے تو ہیں۔“ اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

بال بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہار سنگھار بھلا بغیر بالوں کی آرائش کے پورا ہوتا ہے؟“ فریحہ جیسے رو دی تھی۔

”ارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ راشدہ اب تک اُس کی بات پر سنجیدہ نہ ہوئی تھی۔

”ایسا نہیں ہوتا بھئی! بس بات یہ ہے کہ تم لوگ سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔“ راشدہ سے بحث بے کار تھی سو فریحہ نے فوراً اُسے پرفیکٹ دلہن بنانے کا فیصلہ کیا۔

”کتنی دیر ہے بارات آنے میں۔“ فریحہ نے رس و راج دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس آدھے پون گھنٹے تک۔“ راشدہ نے ترنت کہا۔

”اوکے! آئی وانٹ اونٹلی 15 منٹس۔“ فریحہ نے جیسے خود سے کہا۔ اور وہ جھٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں نیو لائف بوائے شیپو کی چھوٹی بوتل تھی جو اُسے گاؤں کی ایک چھوٹی سی دکان سے با آسانی مل گئی تھی۔

”چلو جلدی سے یہ زیور اتارو۔ میں تمہیں پندرہ منٹ میں پھر سے تیار کروں گی۔“ یہ کہہ کر اُس نے راشدہ کی حواس باختگی کو نظر انداز کیا اور کام میں بٹ گئی۔

اس وقت راشدہ کی پھوپھی زاد انجمن اُس کی معاون کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ فریحہ نے فوراً راشدہ کے بال نیو لائف بوائے شیپو سے واش کیے اور پھر انہیں تیزی سے خشک کرنے لگی۔ اُس کے بال منٹوں میں سٹکی اور شائنی ہو گئے تھے۔ فریحہ کو اب اُس کی سادگی پر رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔

مگر غصہ اس بات پر تھا کہ آخر بالوں کی

حفاظت نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ شعور کیوں نہیں ان لوگوں میں۔ لڑکیاں منوں منوں تیل لگا کر چھتی ہیں کہ بالوں کی غذا پوری ہوگئی۔

نہیں ایسا بالکل نہیں ہوتا بلکہ بالوں کی اصل غذا تیل کے علاوہ شیپو کی بھی مرہون منت ہوتی ہے۔ لائف بوائے شیپو میں شامل دودھ اور بادام کے ساتھ ساتھ بالوں کے لیے مفید و نامنز بھی بالوں کی نشوونما کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

”باجی! تم نے تو کمال کر دیا۔ آپا کے بال تو ایسے ہو گئے جیسے فلم والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔“ انجمن اُس کے بالوں سے اتنی لائف بوائے شیپو کی سحر انگیز مہک کو سونگتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ کمال تو تم سب بھی کر سکتے ہو۔ یہ جادو میں گھر سے نہیں لانی ہوں پگی! تمہارے گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی دکان پر موجود ہے۔ یہ دیکھو جادو کی بوتل.....!“ فریخہ نے فیو لائف بوائے شیپو کی بوتل اٹھا کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

اب وہ جلدی جلدی راشدہ کا میک اپ کرنے لگی تھی اور میک اپ کرنے کے بعد اُس نے فوراً راشدہ کے بالوں کو ایک خوبصورت انداز دیا اور پھر پنوں سے دو پیٹ سیٹ کر دیا۔

اب راشدہ کے بالوں کی چمک اور مہک بہت نمایاں تھی۔ دور سے محسوس کی جاسکتی تھی۔ اور یہ سب بلاشبہ لائف بوائے شیپو ہی کا جادو تھا۔ انجمن نے راشدہ کی بلائیں لیں اور لائف بوائے شیپو کی بوتل اٹھا کر بولی۔

”باجی آج سے میں بھی یہی لائف بوائے شیپو استعمال کروں گی۔“

”صرف تم ہی کیوں..... یہ تو ہر لڑکی کو استعمال کرنا چاہیے بلکہ میں تو کہوں گی ہر شخص خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی..... لائف بوائے شیپو سب کے

بال اچھے بنائے۔“

”واہ باجی!“ انجمن کھلکھلائی۔

”ارے میں تو کہتی ہوں۔ لائف بوائے شیپو، پرفیکٹ دلبن بنائے۔“ اب کی بار گھونگھٹ سے آواز آئی تھی۔ راشدہ کی آواز پر وہ دونوں قہقہے لگاتی کمرے سے باہر آ گئیں۔

لگا ہوں کی آنکھ چھوٹی کے ساتھ ساتھ شادی کی ریسیں بھی انجام پانی رہیں۔ فریخہ کی وجہ سے خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ کسی مرد کو زمانہ حصے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ خود اس نے بھی اپنے آپ کو دلہن تک ہی محدود رکھا حتیٰ کہ برأت کے ساتھ آنے والے بینڈ باجے کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

لڑکیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب دلہا کو دیکھنے کے لیے دوڑیں۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ برأت کا نظارہ کرے لیکن اماں بی کی آواز جیسے پاؤں میں زنجیر ڈالے ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

گاؤں سے واپسی کے بعد اُس کے دل میں عجیب ایک بے قراری سی پھیر گئی تھی۔

”بھلا یہ کیسی آگہی تھی..... ایک طرف تو میڈیا چیخ چیخ کر اپنی ہر شے کو سیل آؤٹ کر رہا ہے۔ ہر شہر، ہر گاؤں، ہر قصبے میں موجود دکانوں پر اشیائے ضرورت تو موجود ہیں مگر خدا بھلا کرے ان سادہ لوح لوگوں کا.....

آگہی اور مناسب ہاتھوں میں چیزیں نہ پہنچ پائیں تو ایسی اشیاء کس کام کی.....

راشدہ کی شادی میں بھلے سے وہ اپنے طور پر لائف بوائے شیپو کی صورت میں ادراگ کا ایک دروا کر کے آگئی تھی۔ اب اُسے پھر سے گاؤں کی یاد ستارہی تھی کہ جا کر دیکھے تو کبھی کہ

اس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔

اماں بی سے بہت زیادہ ریکویسٹ کر کے وہ اپنے بھائی کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر لڑکاؤں پہنچ ہی گئی۔

☆.....☆.....☆

راشدہ کے گھر آئے اُسے زیادہ دیر نہ گزری کہ انجمن اپنی دولہائی اور چمکدار چوٹیاں لہرائی اس کے سامنے تھی۔

”ارے باجی آپ!“ وہ فریخہ کو دیکھ کر بے ساختہ اُس سے لپٹ گئی۔

”کیسی ہو چھوٹی!“ وہ محبت سے بولی۔

”باجی میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ آج نہیں کی ناں۔“ اُس کی اس بات پر بڑے بھیا نے فوراً آنکھیں دکھاتے کے ساتھ ہی گھڑی بھی دکھائی۔ مطلب واضح تھا۔

”جلدی کرو۔“

”ارے نہیں نہیں! بس ہم تو یہاں سے گزر رہے تھے تو سوچا کہ تم سب کو دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔“

”باجی یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ باجی میں ابھی آتی ہوں۔“

”ارے بابا! بس ہم نکلیں گے۔“

”کہاں نکلیں گے..... ارے دھی رانی! شام کا کھانا کھائے بغیر تو میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ تو بھی تو میری راشدہ ہی ہے۔“ راشدہ کی امی نے اُس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”آئی بھائی جان کی میٹنگ ہے۔ ہم بس پھلیں گے۔ پھر انشاء اللہ جلد آئیں گے۔“

”آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ میں ابھی آئی۔“

”ارے لڑکی سن تو۔ یہ تو بتا آج اتنی پیاری کیسے لگ رہی ہے۔“

”آپ نے ہی تو اُس دن سکھایا تھا پیارا لگنے کا طریقہ۔“ وہ مسکرائی اور دروازہ پار کر گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ واپس آئی تو اُس کے ساتھ درجن بھر لڑکیاں تھیں۔ جن کے بال لہرا رہے تھے۔ شان کرتے ہوئے، ریشم کی طرح نرم ملائم.....

”یہ کیا ہے؟“ وہ گنگ رہ گئی۔

”باجی! یہ ہے بالوں کی Care۔ آپ نے کہا تھا کہ جادو اس بوتل میں ہے۔“ انجمن نے نیو لائف بوائے شیپو کی بوتل اُس کے سامنے کی اور پھر دوسری لڑکیوں نے بھی اُس کی تقلید میں لائف بوائے شیپو کی بوتلیں اور ساشے آگے کر کے لہرائے۔

یہ تبدیلی دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس کی ذرا سی کوشش نے بالوں کی خوبصورتی میں پہلا قدم لائف بوائے شیپو کی صورت میں اٹھایا تو کتنا سدھار آیا۔ کاش کہ ہر کوئی اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اپنا فرض نبھائے تو ہر شخص سکھ کی بانسری بجائے۔

وہ سنہری یادیں لیے بڑے بھائی کے ساتھ واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔

”ارے میری گزیا! تُو نے نہ دکھایا۔ لائف بوائے شیپو پرفیکٹ کام دکھائے۔“ بھیا نے کہا تو اُس نے ان کے کاندھے سے سر لگا دیا۔

آج لائف بوائے شیپو کے نتیجے نے لائف بوائے شیپو کے ہر دعوے کو سچ ثابت کر کے اس کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ اُس کے دل سے آواز آئی تھی۔

”تھینک یو لائف بوائے شیپو..... تم نے وعدے سچ کر دکھائے۔“

☆.....☆.....☆



جہان حیرت و اسرار میں لپٹی
لوہیں خوف و ڈرائی، منشی پھیلائی پر اسرارِ نیر کی سات شخصوں کی کہانیاں

سیر ہوا میں مسافر



ایک ایسے ڈرائیور کی خوف بیتی جسے تیز رفتاری پر خوب مہارت تھی مگر

سڑک کا سینہ چیرتے ہوئے تیز رفتاری سے بھاگی جارہی تھی، کہ بس ایک خاتون کی کار سے ٹکرائی۔ اور کار الٹ کر ایک گڑھے میں جا گری۔ اس خاتون کا سفید لباس اس کے اپنے خون سے تر ہو گیا، اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ اس نے بس کو روکا تو سبھی مگر صرف چند لمحوں کے لیے اور وہ بھی مسافروں کے اصرار پر۔ پھر وہ بس کو وہاں سے تیزی سے بھٹکا کر لے گیا۔

ایسٹ آباد پہنچ کر اس نے بس کو اڈہ پر پہنچ کر بس کھڑی کی اور لاری اڈہ کے انچارج کو بس کی چابی دے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ ٹھیکے کے کچھ دوست کراچی میں تھے۔ وہ ان کے پاس جا پہنچا اور وہاں کچھ عرصہ روپوش رہا۔ جب حالات بہتر ہوئے تو اس نے کراچی میں بس چلائی شروع کر دی۔

بارہ سال کراچی میں گزارنے کے بعد اس نے واپس راوِلپنڈی آنے کا ارادہ کیا۔ یہاں آ کر اس نے اپنی ٹویٹا ویگن خرید لی۔ اور پھر سے اسی روٹ یعنی راوِلپنڈی سے ایسٹ آباد پر چلائی شروع کر دی۔ اب چونکہ ویگن اس کی اپنی تھی۔ اس لیے ایک تو وہ نہایت احتیاط سے ڈرائیونگ کرتا تھا اور

رشید خان عرف شیدا ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی کی بس چلاتا تھا۔ اس کا روٹ راوِلپنڈی سے ایسٹ آباد اور وہاں سے راوِلپنڈی آنے کا تھا۔ وہ وقت کا پابند تھا۔ بھی اس نے بس کو لیٹ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر بس اڈے سے نکالتا۔ اور مقرر کردہ وقت میں ایسٹ آباد پہنچ جاتا۔ بعض اوقات راستے میں ٹریفک بلاک ہونے کی صورت میں وہ بس کو تیزی سے چلاتا تھا۔ تاکہ وہ مقررہ وقت میں ایسٹ آباد پہنچ جائے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اکثر کامیاب رہتا تھا۔ حالانکہ یہ کوشش نہایت ہی خطرناک ہوتی تھی۔ بعض اوقات سواریاں بھی اعتراض کرتی تھیں کہ وہ اور اسپید نہ کرے مگر وہ کسی کی بھی نہ سنتا، اور بس کو تیزی سے بھگاتا رہتا۔ بس کے مالکان اس سے خوش رہتے تھے۔ اس لئے وہ کسی اور کی پروا نہ کرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بارہ سال قبل راوِلپنڈی سے ایسٹ آباد جا رہا تھا۔ راستے میں ٹریفک جام کی وجہ سے بس کافی لیٹ ہو گئی۔ اور جب اسے راستہ ملا تو اس نے لیٹ نکالنے کے لیے بس کی رفتار بڑھا دی۔ وہ بس

ہی شیدے کی ویگن مسافروں سے خالی ہوئی۔ تقریباً اسی وقت وہ نئے مسافروں سے بھر گئی۔ شیدے نے نظر گھما کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ پیچھے کی تمام سیٹیں مسافروں سے پر ہو گئی تھیں۔ صرف اس کی اپنی سیٹ کے ساتھ فرنٹ سیٹ خالی تھی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فرنٹ سیٹ پر دو مسافر آ جائیں تو وہ ویگن لے کر چلے پڑے۔ اسی وجہ سے وہ پیچھے نہیں اتر رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک شخص آیا اور آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اشارہ سے دونوں سیٹیں رکھنے کو کہا۔ تو شیدا خوش ہو گیا۔ یوں بھی ملتے ہیں مسافر قنافت!! اس نے جی جی میں خوش ہوتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور مسافروں سے کرایہ وصول کرنے لگا۔ فرنٹ سیٹ

دو سو اڑھائی ایک پھیرا فالتو بھی لگا لیتا تھا۔ جسے وہ آخری پھیرا کہتا تھا۔ اس آخری پھیرے میں عموماً رات کے بارہ بج جاتے تھے اور اس پھیرے میں کنڈیکٹر اس کے ساتھ نہ ہوتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُس رات جب وہ ویگن اسٹینڈ پر پہنچا تو وہ بہت خوش تھا کہ آج اس کا یہ آخری پھیرا ہے۔ جو ایسٹ آباد سے راوِلپنڈی کا تھا۔ یہ پھیرا لگا کر اس نے گھر جا کر آرام کرنا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جب اس نے ویگن اسٹینڈ پر جا کر ویگن روکی تو مسافر اس سے باہر نکلے۔ چند مسافر اس ویگن کے انتظار میں ویگن اسٹینڈ کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ چنانچہ جیسے

والے نے دو سواروں کا کرایہ دیا تھا۔ سب سواریاں راولپنڈی کی تھیں۔ ویگن کی تمام نشستیں پُر ہو گئی تھیں۔ باہر اور کوئی بھی مسافر موجود نہ تھا۔ اسے ڈریونگ کرتے ہوئے بیس سال ہو گئے تھے۔ مگر ایسی صورت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ویگن کی ساری نشستیں بھی پُر ہو جائیں اور باہر اسٹینڈ پر کوئی اور مسافر بھی موجود نہ ہو۔ چنانچہ اسے اسٹینڈ پر آئے پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ آخری پچھلے کے لیے ویگن مسافروں سے بھر کر وہاں سے نکل آیا۔ ٹریفک کے جھوم سے نکل کر اس نے ویگن کی رفتار بڑھائی اور بڑے اطمینان سے منزل مقصود کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی دوڑانے لگا۔

سڑکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ رات غضب کی تاریک سگی اور ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ سامنے بڑک پر ویگن کی ہیڈ لائٹس سے نکلنے والی تیز روشنی تھی اور ویگن کے پیچھے تاریکی میں بیٹھے ہوئے سولہ مسافر سایوں کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ گاہے گاہے ویگن کی حرکت کے ساتھ ان کے سر ضرور مل جاتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ مٹی کے بے جان بت نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ شیدے کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر خاموشی سے باہر ایک سمت منسلک گھور رہا تھا۔ مسافروں کی یہ خاموشی شیدے کو بڑی طرح مغل رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ان مسافروں کو اس حالت میں دیکھ کر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ میں انہیں کسی جنازے میں شامل ہونے کے لیے لے جا رہا ہوں۔

☆.....☆.....☆

آبادی کا آخری گھر بھی گزر گیا تھا اور اب ویگن سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بلند وبالا درختوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ مگر ابھی تک کسی مسافر کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا تھا۔

”کیا نزلے مسافر ہیں یہ بھی!“ شیدے نے دل میں کہا۔

”لگتا ہے ان سب نے یا تو گونگے کا

گڑکھا رکھا ہے یا پھر یہ نہ بولنے کی قسم کھائے ہو ہیں۔“ اچانک اس گھمبیر خاموشی میں پچھلے حصے کی تاریکی سے ایک آواز ابھری۔

”استاد! ہمیں یہاں اتار دو۔“

شیدے نے کمال اطاعت اور فرمانبرداری سے ویگن کی رفتار کم کر کے بریکیں لگائیں۔ ویگن سے دو آدمی باہر نکلے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

”عجیب بات ہے۔“ شیدے نے دوبارہ ویگن اشارت کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

”یہاں تو کوئی چوراہا ہے نا اسٹاپ، اور نہ ہی قریب کوئی آبادی ہے۔ پتا نہیں ان دونوں کو کہاں جانا تھا۔ جو یہاں اتر گئے۔“

ویگن دوبارہ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بلند وبالا درختوں کے درمیان دوڑنے لگی۔ سوائے ویگن سے اترنے والے مسافروں کے اور کسی مسافر کی زبان سے ابھی تک ایک لفظ بھی ادا نہ ہو رہا تھا۔ شیدا پھر سوچنے لگا کہ یہ مسافر بھی کیسے عجیب مسافر ہیں جو یوں چپ چاپ اور نہ بولنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ پانچ منٹ بعد پھر ایک آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔

”استاد! ہمیں یہاں اتارنا ہے۔“

شیدے کے پاؤں پھر بریک کی طرف بڑھے۔ ویگن آہستہ ہوتے ہوتے رُک گئی۔ پچھلے حصے سے دو آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پھر دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہو گئے اور ویگن پھر آگے روانہ ہو گئی۔

”پتا نہیں ان مسافروں کو کہاں جانا تھا۔ یہاں تو آس پاس کوئی آبادی ہی نہیں۔ خیر ہو سکتا ہے کہ وہ آبادی یہیں کہیں۔ اندھیرے میں کیا پتہ چتا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں نہیں۔“ شیدے نے سوچا۔

ایک چھوٹی سی کار خاموشی تیز رفتار کے ساتھ ویگن کے قریب سے گزری۔ اس کار کے گزرنے سے شیدے کو عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔ بالکل ایسا اطمینان جو رات کے اندھیرے میں اکیلے سفر

کے والوں کو کسی اور مسافر ساتھی کے مل جانے پر ملتا ہے۔ اس نے اطمینان کے ساتھ اس لمحے میں گھمبیر نگاہ ڈالی۔ ویگن کے پچھلے حصے میں باہر خاموش سایوں کی طرح بیٹھے تھے اور ویگن کی رفتار سے ان کے گاہے گاہے ہلتے ہوئے سروں کے علاوہ ان میں زندگی کی کوئی اور علامت نظر نہ آ رہی تھی۔ جب دوسری کار گزر گئی تو شیدے نے گھبراہٹ سے رات کی سیاہی کچھ اور بڑھ گئی ہے اور بالکل پہلے سے کہیں زیادہ تاریک اور بد صورت نظر آنے لگی ہے۔

دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ شیدا پھر ایک تاریکی آواز پر چونک اٹھا۔

”ڈرائیور! مجھے یہاں اتارنا ہے۔“

یہ آواز۔ ہو بہو پہلے دو مسافروں جیسی تھی۔ شیدے نے ویگن روکی اور جب پانچواں اور چھٹا مسافر باہر نکل کر اور دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہو گیا تو اس نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر تاریکی میں کسی آبادی کے آثار دیکھنے کی کوشش کی مگر باہر اتنی تاریکی تھی کہ اسے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ممکن تھا کہ قریب ہی کہیں کوئی چھوٹی آبادی آباد ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس جگہ دور دور کی آبادی کا نام و نشان تک نہ ہو۔

شیدے نے دوبارہ گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ساتھ ہی وہ سوچنے لگا۔

یہ مسافر یا تو اس کے ساتھ کوئی شرارت کر رہے ہیں یا ان کا مقصد کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے لوٹنا اور میری دن بھر کی کمائی بھینا نا چاہتے ہوں۔ ان سب نے پنڈی تک کا کرایہ ادا کیا ہوا ہے۔ مگر یہ اپنے کرائے کے مطابق سفر طے کیے بغیر یہاں وہاں ایران اور بے آباد جگہوں پر کیوں اتر جاتے ہیں۔“

اب کے ویگن چلی تو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ فاصلہ طے کرتے ہوئے سڑک پر دوڑتی رہی۔ شیدے نے سوچا کہ اگر رُکے بغیر اسی طرح اور اسی رفتار سے فاصلہ طے کرتی رہی تو وہ مقررہ وقت پر پنڈی پہنچ جائے گا۔

ایک بار پھر پیچھے سے آواز آئی۔ ”ڈرائیور! ہم یہاں اتارنا چاہتے ہیں۔“

شیدے نے اس بار سر باہر نکال کر اترنے والے دونوں مسافروں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ویگن کے عقبی حصے کی طرف نظر ڈالی۔ ایسا نہ کرنا ہی اس کے لیے بہتر تھا۔ تاہم اس نے کوشش ہٹم سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ مسافر بھی انہی کا ساتھی ہے۔ آخر یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتا۔

مگر وہ فرنٹ سیٹ کا مسافر بار بار باہر دور دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا اور ایسا کرتے ہوئی اس نے ایک بار بھی اپنا سر تک نہ بلایا تھا۔

”کیسی منحوس دکھائی دے رہی ہے یہ تاریک سڑک بھی۔“ شیدے نے زیر لب کہا۔ اور جب پھر ویگن ہی آواز سنائی دئی تو وہ چونک گیا۔

”استاد! ہمیں یہاں اتار دو۔“ اس نے جی بی جی میں ان الفاظ کی نقل اتاری اور جب ویگن کے پچھلے حصے سے یہی الفاظ بالکل پہلے اترنے والے ہر مسافر کے لب و لہجے میں دوہرائے گئے تو اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

نواں اور دسواں مسافر اتر گئے اور ویگن پھر تاریکی میں ڈوبی ہوئی سڑک کے سینے پر دوڑنے لگی۔ اب کے شیدے نے ادھر ادھر دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ وہاں کوئی آبادی ہے یا نہیں۔ اسے اگر چہ اس کا احساس نہیں تھا۔ مگر وہ ویگن کو اتنی تیز رفتاری سے چلا رہا تھا کہ اس سے پہلے اس نے بھی ویگن کی رفتار اس حد تک نہیں بڑھائی تھی۔ دس مسافروں کا بوجھ کم ہو جانے کے باعث ویگن کچھ ہلکی ہو گئی تھی اور شیدا حیران ہو ہو کر سوچ رہا تھا کہ ویگن میں جتنے مسافر کم ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے اندر ہی اندر اتنا خوف کیوں محسوس ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر آج کیا بات ہے؟“

وہ برابر پھر کسی مسافر کی آواز پر کان لگائے

بیٹھا تھا اور جب آواز آئی تو وہ اپنی نشست پر اچھل سا پڑا۔ اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔
 ”ڈرائیور! ہمیں یہاں اترنا ہے۔“
 اور پھر گیارہواں اور بارہواں مسافر ویگن سے باہر نکل کر دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ پہلے مسافروں کی طرح یہ مسافر بھی ایسی جگہ اترے تھے جہاں کوئی راستہ اور کوئی آبادی نہ تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے باقی ماندہ چار مسافر اب بھی سايوں کی طرح خاموش اور چپ چاپ بیٹھے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے بھی تو اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور نہ ہی اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالا تھا۔ وہ تو بس سامنے دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو گھورے جا رہا تھا۔
 ”کاش مجھے اس سڑک پر سے گزرتی ہوئی دو چار گاڑیاں اور نظر آجائیں۔“ شیدے نے دل ہی دل میں تنہا کی۔ گاڑی تو اسے کوئی نظر نہیں آئی۔ مگر مسافر کی وہی آواز گونج اٹھی۔
 ”ڈرائیور! ویگن روکو۔ ہمیں اترنا ہے۔“
 یہ آواز اب شیدے کے لیے نامانوس نہ رہی تھی۔ مگر اس موقع پر نہ جانے کیوں یہ آواز بار بار آنے والی آواز۔ اسے اچھل کر دوپٹے والی تھی۔ اس نے پھر ویگن روکی۔ دو مسافر ویگن سے اترے اور دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ شیدے نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر سے ویگن آگے بڑھادی۔
 ”سترہ میں سے چودہ نکالیں تو باقی تین بچتے ہیں۔“
 شیدے نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اگر یہ کسی شرارت پر اتر آئے تو میں اکیلا ہی ان تینوں کو بڑی آسانی سے سنبھال سکتا ہوں۔ مگر کاش یہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر پہلو ہی بدل دے۔ باہر نکل جائے یا اپنی زبان سے دو لفظ نکال لے، چاہے یہ دو لفظ میرے لیے کافی ہی کیوں نہ ہوں۔“
 ویگن تاریک رات میں اندھیری سڑک پر تیز

رفتاری سے دوڑتی رہی۔ اب اس میں صرف شیدا ڈرائیور پیچھے بیٹھے ہوئے دو سائے۔ یا پھر فرنٹ پر بیٹھا ہوا وہ مسافر جو برابر باہر دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔ شیدے نے اسٹیرنگ ویل اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر لی کیونکہ ایک انجانے سے خوف کے احساس کے ساتھ اس کے سر کے بال کھڑے ہونے لگے تھے۔ پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے دونوں سائے ایک حرکت کرنے لگے تھے۔ شاید وہ بھی اترنے کا ارادہ کر رہے تھے اور پھر وہی ہوا۔ وہی آواز شیدے کو بدحواس کر گئی۔
 ”ڈرائیور! ہمیں یہاں اترنا ہے۔“
 اس آواز کا لہجہ بھی بالکل پہلے اترنے والے مسافروں جیسا ہی تھا۔ ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ اب ان آوازوں سے شیدے کو نفرت کے ساتھ ساتھ اذیت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں مسافر ساتھ باہر نکلے اور پھر ان کی آواز آئی۔
 ”شب بخیر۔“
 ”کیا؟“ شیدے نے کہا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پندرہویں اور سولہویں مسافروں کی زبان سے ادا ہونے والے ان دو الفاظ نے شیدے کو غیر معمولی طور پر چونکا تے ہوئے خوف زدہ سا کر دیا حالانکہ ان الفاظ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں مسافر اندھیرے میں غائب ہوئے۔ ویگن پھر پہلی سی رفتار سے دوڑنے لگی۔ مگر شیدا بہت ہی الجھا ہوا تھا۔ سولہ مسافر اتر گئے تھے اور اب ایک مسافر رہ گیا تھا جو فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ شیدا خوف زدہ ہو کر سوچنے لگا اگر ان سولہ مسافروں میں راستے نے ہی اترنا تھا۔ تو انھوں نے پنڈی تک کا کرایہ کیوں دیا۔ اور پھر وہ دودھ کی ٹولی میں کیوں اترے۔ کہیں بھی اکیلا مسافر نہیں اتر۔ وہ تین اکٹھے ہو کر اتر سکتے تھے۔ اور اس سے زیادہ بھی۔ مگر دودھ کر کے اترنا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا اور پھر آخری دو مسافروں کا ”شب بخیر“ کہنا اُسے خوفزدہ سا کیوں کر گیا ہے؟
 اکثر مسافر جاتے ہوئے شب بخیر کہا کرتے

تھے مگر چونکہ یہ الفاظ سولہویں مسافر نے ادا کیے تھے اور باقی پندرہ مسافر سارا راستہ بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ اس لیے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ الفاظ بظاہر عام اور معمولی ہونے کے باوجود کوئی غیر معمولی اور پُر اسرار مفہوم لیے ہوئے ہیں۔
 ”سترہ میں سے سولہ گئے باقی رہا ایک۔“
 شیدے نے جیسے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔
 ”مگر یہ ایک کیا شے ہے؟ اس کے کیا ارادے ہیں؟“
 پھر جیسے شیدے کے ذہن میں اٹھتے ہوئے ان سوالوں کے جواب میں فرنٹ سیٹ کے مسافر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور سامنے تاریکی کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔ مسافر کے چہرے کا رخ ذرا سا اس کی طرف ہوا تو شیدے کو معلوم ہوا کہ اس نے اس چہرے کو اس سے پہلے کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک صاف اور زرد زرد سا چہرہ تھا۔ جس کی سیاہ آنکھیں کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں۔ مسافر نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور پھر پہلی دفعہ اس کی زبان کھلی۔
 ”کالا قبرستان تہی دور ہے؟“
 شیدا چونکتے ہوئے اچھل سا پڑا۔ گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ویگن کی رفتار بڑھادی۔
 ”پانچ میل“ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کا سفر تو خوب مزے سے کٹ رہا ہے۔ ہے نا؟“
 جواب میں فرنٹ سیٹ والے مسافر نے زور دار قہقہہ لگایا۔
 ”ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ تم گاڑی ذرا تیز چلا رہے ہو۔ شیدے استاد!“
 شیدا مسافر کا قہقہہ سن کر گھبرا گیا۔ اگرچہ قہقہے کی آواز ویگن کے چلنے کی آواز میں ڈوب گئی تھی۔ پھر بھی وہ قہقہہ اسے ڈراؤنا اور پُر اسرار محسوس ہوا اور

غزل

پھر تیری بے رخی کا تقاضا اُٹھ رہا ہے
 میری الفت کا بھی دیکھو جنازا اُٹھ رہا ہے
 مجھے اب موت کا تو ڈر نہیں ہے
 تیری دوری سے یازہ اُٹھ رہا ہے
 نکلتا تیری دنیا سے پڑے گا
 نیا اک یہ تنازعہ اُٹھ رہا ہے
 لغو سے معنی باتوں میں یہاں ہیں
 بھروسہ بھی لہذا اُٹھ رہا ہے
 جلا کر دل کو ہم بیٹھے ہیں مہدی
 یہاں دھواں بھی تازہ اُٹھ رہا ہے
 (شاعر: مہدی قاضی)

مسافر کی زبان سے اپنا نام سن کر تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ حالانکہ کسی اور مسافر کی زبان سے اپنا نام سن کر اس نے آج تک ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔ جو اس وقت وہ بڑی طرح محسوس کر رہا تھا کہ اُسے کچھ کرنا یا کچھ کہنا ضرور چاہیے ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے، یا سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”بہتر ہوگا تم اپنا تعارف کرا دو۔ کیونکہ ہم دونوں اکٹھے سفر کر رہے ہیں اس وقت۔“
 ”جیسے تمہاری مرضی۔“ مسافر نے بڑے آرام و سکون سے کہا۔ ”مجھے موت کہتے ہیں۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔“
 ”موت“ مسافر نے دوبارہ کہا۔

شیدے نے بریکوں کی طرف پاؤں بڑھایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مسافر مذاق کر رہا ہے۔ مگر جب مذاق خطرناک ہوتا پھر مذاق کہاں رہتا ہے۔

”نہیں“ مسافر نے جیسے اس کی سوچوں کو پڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔“ اُس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”میری ہنسی کے نیچے تمہیں کوئی چیز دکھائی دیتی ہے؟“

شیدے نے مدھم مدھم روشنی میں مسافر کی کہنی کے نیچے نگاہ ڈالی۔ مسافر کے سینے پر بندھے ہوئے ہاتھوں سے ایک آئوٹیک پستول کی نال ذرا سی باہر نکلی ہوئی تھی۔

”چلو مان لیا“ شیدے نے جیسے بے بسی سے کہا۔ ”تمہارا نام موت ہے۔ یہی کہا تھا ناں تم نے۔ چلو میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے تم قبرستان کا پوچھ رہے تھے۔ شاید تم قبرستان ہی جا رہے ہو۔“

”بالکل۔ بالکل۔“ مسافر نے کہا۔ ”یہی وجہ ہے کہ ہم قبرستان جا رہے ہیں۔“ ایک خوفناک سی سنسنی شیدے کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

”ہم.....؟“ اس نے اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو معلوم نہیں کہ مجھے وہاں کسی نے بلایا ہے۔“

”تمہیں اسی وقت بلا لیا گیا تھا۔ جب میں نے اس سفر کا منصوبہ بنایا تھا۔“

”تو اس سفر کا منصوبہ تم نے بنایا تھا۔ کیا خوب! کیا وہ مسافر تمہارے اس منصوبے کے مطابق راستے میں ویران اور بے آباد جگہوں پر اترے تھے؟“

”ہاں۔ تم بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہو شید خان۔“ مسافر نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تاکہ ہم دونوں اکیلے سفر کر سکیں اور ہماری باتیں سننے والا یا ہمیں دیکھنے والا کوئی تیسرا آدمی اس گاڑی میں موجود نہ ہو۔“

یہ کہتے ہوئے مسافر نے اپنے پیر نیچے دیکھ

کے فرش پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے تھپ تھپ کی آواز پیدا کرنی شروع کر دی۔ تھپ تھپ کی آواز حیرت انگیز طور پر دیکھنے کے چلنے کی آواز سے ہم آہنگ تھی۔ شیدے نے اسٹیرنگ ویل پر اپنی گرفت مضبوط کی مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہاتھ ہی نہیں اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اپنے کانپتے ہوئے جسم اور کانپتی ہوئی مگر غصے بھری آواز کے ساتھ اس نے کسی قدر چیختے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا نام واقعی موت ہے تو تم ایک بار نہیں سو بار اور بڑے شوق سے قبرستان جاؤ لیکن یہ تو بتاؤ ذرا کہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی وہاں کیوں لے جانے پر اصرار کر رہے ہو؟ کوئی تک ہے اس بات کی؟ اگر تمہارے ہاتھ میں اس پستول کی بجائے کوئی خنجر وغیرہ ہوتا تو پھر میں بھی یہ کوشش کر کے دیکھ لیتا کہ ہم دونوں وہاں جاتے ہیں یا نہیں۔“

”موت نے اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو قریب دیا ہے۔“ مسافر نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

”اور میرا خیال تو یہ ہے کہ تم کو ذرا ایک منٹ کے لیے کچھ سوچنا اور غور کرنا چاہیے۔ یہ دیکھنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تمہارے وہاں یعنی قبرستان جانے کی معقول وجہ ہے یا نہیں؟“

”یہ تم کیا ہوا میں تیر چلا رہے ہو؟ کیا کیا ہے میں نے؟“

”تمہیں یاد ہونا چاہیے۔“

”کیا یاد ہونا چاہیے؟“

”یہی کہ تم نے کیا کیا تھا؟“

”مک کی خوفناک تاریکی کے درمیان دیکھیں ایک دم ساکن اور بے حس و حرکت ہو گئی ہے۔“

”تو تمہیں بالکل یاد نہیں آ رہا؟“

”بالکل نہیں“ شیدے نے کہا۔ ”بات کیا ہے؟“

”اب قبرستان کتنی دور ہے؟“

”تقریباً تین میل“ شیدے نے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟“

”اور تمہیں اب بھی کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”نہیں“ شیدے نے تنگ آ کر کہا۔ ”آخر تم کو کون؟“

”تم بھول گئے ہو۔“ مسافر نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں یکا یک ایک بلی کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگیں۔

”میرے اللہ! کاش میں بھی بھول سکتا۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔ میں تو بھول نہیں سکا اور تمہیں یاد تک نہیں آ رہا۔“

”لیکن وہ بات کیا ہے جو تمہارے کہنے کے مطابق مجھے یاد نہیں آ رہی۔“

”تو سنو۔“ فرٹ سیٹ کے مسافر نے کسی قدر مضطرب انداز سے اور گویا اپنی اندرونی کیفیت کو دہانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”آج سے دس سال پہلے جب تم یہاں بس چلا یا کرتے تھے تو تم نے ایک خاتون کی کار کو ٹکرا مار دی تھی۔ کار الٹ کر ایک گڑھے میں جا گری تھی۔ مگر تم وہاں سے بھاگ گئے تھے۔“

”اس بات کا تم سے با تعلق ہے؟“

”تو گویا تم نے وہ حرکت کی تھی؟“

”ہاں۔“ شیدے نے جیسے بے دلی سے کہا۔

”مگر اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟“

”اس خاتون کا کیا پتا؟“

”اس کی کار الٹ کر گڑھے میں گر گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ خاتون بھی ہلاک ہو گئی تھی۔ مگر وہ..... اس کا..... وہ تمہاری کیا لگتی تھی۔ عزیزہ بھی یا کچھ اور؟“

”وہ میری زندگی تھی۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔“ مسافر نے یہ کہتے ہوئے ایک مجنونانہ انداز میں شیدے کی طرف دیکھا۔ پھر دو ایک لمبے کے لئے خاموش رہ کر جیسے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں بہت پہلے مر گیا ہوتا۔ موت نہ جانے کتنی بار میرے قریب سے ہو کر گزر جاتی رہی۔ لیکن میں اس کی خاطر یا اس کی وجہ سے زندہ رہا۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں مرا نہیں زندہ رہا۔ پھر جب میں بیرون ملک سے یہاں گھر واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی جان لینے والے تم تھے۔“

”مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔“ شیدے نے جیسے صفائی پیش کی۔

”میں لیٹ ہو رہا تھا اور مجھے وقت پر بس اسٹینڈ پہنچنا تھا۔ اس روز۔“

یہ کہتے کہتے شیدا جیسے اپنے آپ ہی زک گیا۔ اور اس نے اپنا چہرہ۔ مسافر کی چیخیں ہوئی پر اسرار اور خوف ناک نظروں کا سامنا کرنے سے بچنے کے لئے دوسری طرف کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی نظروں کے سامنے دس سال پہلے کا وہ منظر پوری تفصیل کے ساتھ ابھر آیا جس کے متعلق اس نے وقوعہ کے روز کے بعد دوبارہ بھی سوچتے اور یاد کرنے کی زحمت ہی نہ کی تھی اور وہ بھاگ کر کراچی چلا گیا تھا۔ وہاں جا کر اُس نے اس واقعہ کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔

”تو یہ تم تھے۔ جو اسے اور مجھے دونوں کو ختم کرنے کا باعث بنے۔ اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر اندر سے ختم ہو جانے کے باوجود میں اس کی خاطر جیتا رہا۔ جیتا رہا اور تمہارا سراغ لگا تا رہا۔ کہ کب تم میرے سامنے آتے ہو۔ آخر آج رات قسمت مجھ پر مہربان ہوئی اور میں تم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔“

شیدے کے تخیل کے پردے پر اب بھی



چاندنی شہر کی دوسری خاص کہانی

مجھے معاف کر دو!

حنابلہ شہر

چاندیاد کے لالچ میں چھوٹی بہن پر کالا جادو کر دینے والے ایک شخص کا قصہ عبرت

قبرستان آتا تھا۔ ایک دن میں قبرستان گیا تو میری نظر چوہدری قاسم پر پڑی۔ وہ آج بہت شدت سے رورہا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہانہ

میں ابا کی قبر پر فاتحہ کے لئے اکٹرا جاتا تھا۔ آتے جاتے اکثر میری ملاقات چوہدری کے بیٹے لام سے ہو جایا کرتی تھی۔ شاید وہ پابندی سے



قبرستان کا بڑا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے بلند ستون اب نظر آنے لگے تھے اور شیدا سوچ رہا تھا کہ اگر وہ موڑ کاٹتے ہوئے اپنی وگن کو سڑک پر ہی رکھنے میں کامیاب رہا تو پھر اسے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں گی اور وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو جائے گا۔

تیز رفتاری کے باعث وگن سڑک کی اور اونچی نیچی جگہوں پر اُچھلی تو شیدا ایک انجانے سے خوف کی تخت آنکھیں جھپکنے لگا۔ مگر پھر اسے قبرستان کا بڑا دروازہ دکھائی دیا تو اس نے اپنی وگن کو سڑک پر ہی رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن یہ کیا؟ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قبرستان کے بڑے دروازے کی تاریک محراب اس کی گاڑی کو ایک طاقتور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ شیدے نے بظاہر اسٹیئرنگ کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مگر اس کی ساری کوشش کے باوجود اسٹیئرنگ مڑ گیا۔ وگن بے قابو ہو کر پہلے اپنے ایک پہلو پر ہو کر رہی اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ اُچھلتے ہوئے قبرستان میں جا گری۔ جہاں مردوں کے قطار در قطار تعویذ اور کتبے اس کے استقبال کے لیے چشم براہ تھے۔

وگن اُچھل کر قبرستان میں گری تو سیدی بڑے دروازے کے ایک ستون سے جا ٹکرائی۔ وگن اور ستون کے اس تصادم سے جو خوفناک دھماکہ ہوا۔ اس کی آواز شاید آسمانوں تک بھی سنی گئی ہوگی لیکن تصادم کی اس آواز سے بالکل الگ بلکہ نمایاں اور وہ وحشتانہ قہقہہ تھا۔ جو اس لمحے فضا میں گونج اٹھا تھا۔ اس وحشتانہ قہقہے سے رخ مندی کا احساس صاف ظاہر تھا اور یہ قہقہہ تو فرنٹ سیٹ والے پاگل مسافر نے لگایا تھا۔ یا شاید قبروں میں لیٹے ہوئے اُن مردوں کی طرف سے تھا۔ جو نہ جانے کب سے اس خاتون کو ہلاک کرنے والے ڈرائیور ”رشید خان“ کی اس قبرستان میں آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

حادثے کا منظر گھوم رہا تھا اور اس کے کانوں میں ہلاک ہونے والی خاتون کی دلخراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ اس کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر جو نہ جانے کوئی پاگل انسان تھا یا کوئی آسبی روح۔ مگر وہ اسے بغیر اپنی زبان سے کہے اس حادثے کی ایک ایک تفصیل پوری جزئیات کے ساتھ یاد دلانے جارہا تھا۔

”قبرستان اب کتنی دور رہ گیا ہے؟“
”ایک میل۔“ شیدے نے اپنے سختی سے بھنپے ہوئے دانتوں کے درمیان کہا۔
”ٹھیک ہے۔ ہم وقت پر پہنچ جائیں گے وہاں۔“

وگن تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اور سڑک کا ڈھلوانی راستہ تیزی سے طے کرتے ہوئے اونچائی والے راستے پر چڑھی۔ اس اونچائی کے اختتام کے قریب پہنچتے ہوئے شیدے کو آسمان پر ایک مدھم سی روشنی نظر آئی۔ وہ جان گیا کہ وہ جلد ہی کھلی جگہ میں نکل آئیں گے۔ جہاں سے قبرستان صاف دکھائی دینے لگے گا۔

”جلدی کرو۔ اب کتنی دور رہ گیا ہے؟“
”صرف ایک چوتھائی میل۔“
یہ کہتے ہوئے شیدے کی آنکھیں سامنے دیکھتے ہوئے جیسے حلقوں سے باہر نکلنے کو ہوئیں اور اس کے سر کے سارے بال کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں حادثے میں ہلاک ہونے والی خاتون کا خون آلود لباس پھر رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں اس خاتون کی دلخراش چیخیں گونج رہی تھیں۔
”کاش میں یہاں کہیں رکے بغیر اس جگہ کے پاس سے گزر جاؤں۔“ شیدے نے جی ہی جی میں کہا۔ ”پھر مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

اب قبرستان کے ارد گرد بنا ہوا لوہے کا جنگلات دکھائی دینے لگا تھا۔ اس جنگل کی سلاخوں کے درمیان سے نظر آتے ہوئے قبروں کے تعویذ اور کتبے پر اسرار بھوتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ذرا آگے سڑک پر وہ موڑ تھا۔ جس کے قریب

گیا۔ میں اُس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جوشہ دینے کی کوشش کی۔ میں نے کتبے پر غور سے پڑھا تو ”نمین تارا“ لکھا نظر آیا تھا۔ پتا نہیں چوہدری کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ میں چونکہ اس گاؤں میں نیا آیا تھا۔ اس لیے زیادہ کچھ جانتا نہیں تھا۔ میں نے وہاں فلقاتھ پڑھی اور گھر آ گیا۔ سارا دن مجھے چوہدری قاسم کا شدت سے روٹنا یاد آتا رہا۔ وہ اتنی شدت سے رورہا تھا کہ جیسے کوئی ابھی حال ہی میں فوت ہوا ہو۔

کچھ دن بعد پھر میرا قبرستان جا تا ہوا۔ میں جلدی جلدی فاتحہ پڑھ کر جانے کے لیے مڑتا تھا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ میری نظر چوہدری قاسم پر پڑی۔ وہ بارش سے بے نیاز قبر کے پاس بیٹھا شدت سے رورہا تھا۔

”نمین تارا مجھے معاف کر دو۔ تم نے مجھے معاف نہ کیا تو میرا اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ قبر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”چوہدری صاحب! بارش تیرے ہورہی ہے۔“ میں نے چوہدری کو پکارا۔ مگر چوہدری نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی بھی رورہا تھا۔ اتنی دیر میں پادل زور سے گر جا اور محسوساً دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ کوئی گھنا درخت بھی نظر نہیں آیا کہ جس کے نیچے سے کھڑے ہو کر بارش سے محفوظ رہے۔ سردیوں کی بارش بندے کو بیمار بھی کر دیتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے چوہدری قاسم کا بازو پکڑا اور گورنر سکی جھوپڑی میں آ گیا۔ گورنر موجود نہیں تھا۔ چوہدری قاسم چٹائی پر ٹھہلا سا بیٹھ گیا۔ مگر وہ ابھی بھی رورہا تھا۔ نین تارا کی قبر یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چوہدری قاسم ابھی بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ ”نمین تارا مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو یہ زمین بھی مجھے جگہ نہیں دے گی۔“

”یہ کس کی قبر ہے؟“ میں نے ہمت گھر کے سوال کیا۔ ”میری چھوٹی بہن کی۔“ چوہدری نے جواب دیتے ہوئے پہلی بار میری طرف دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر وہ

خاموش ہو گیا۔

”آپ یہاں روزانہ آتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو اپنی بہن سے بہت محبت ہے۔“ میں نے اُسے خاموش دیکھ کر پھر سوال کیا۔

چوہدری نے ٹہنی میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر تک جھوپڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”چوہدری صاحب آپ مجھے اپنا نام بتائیں۔ آپ کا دل بکا ہو جائے گا۔“ میں ہمدرد لہجے میں بولا۔

”نم نہیں گناہ۔“ چوہدری غم ناک لہجے میں بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔“

میں نے اُسے بولنے پر آمادہ دیکھ کر کہا۔ ”کبھی کبھار انسان گناہوں کی وجہ سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ کوئی حل نہیں نکلتا۔ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ تو یہ کہ دروازے بند ہو جاتے ہیں، اور اس کے ذمہ دار بھی ہم خود ہیں۔“ چوہدری قاسم کی آواز کسی کھائی سے آ رہی تھی۔ اور پھر اُس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

چوہدری ہاشم ابھی تک بے اولاد تھا۔ دن رات وہ اپنی بیوی کو طعنے دیتا رہتا کہ صرف بیٹا ہونا چاہیے۔ اگر بیٹی ہوتی تو تمہاری اس حویلی میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

میں بہت مدتوں اور مردوں کے بعد پیدا ہوا۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ میرا باپ فخر سے سین پھیلا کر پھر رہا تھا۔ وراثت کے علاوہ باپ کے بے جالاؤ پیار نے میرے اندر ضد، غصہ اور ہٹ دھرمی وغیرہ پیدا کر دیا تھا۔ میں عورت کو پیر کی جوتی سمجھتا تھا۔ ماں کی محبت کے باوجود میں اُسے بہت تنگ کرتا اور بدتمیزی کرتا۔ حویلی کی ملازمتیں بھی میری بدسلوکی کا شکار تھیں۔ باپ کی حمایت میرے ساتھ ساتھ تھی۔ 9 سال تک بلا شرکت غیرے میری بادشاہی قائم رہی۔ اس دوران اتنا اُمید سے ہو میں۔

”حاجرہ یاد رکھنا اس بار بھی بیٹا ہونا چاہیے۔“ ابا رعونت بھرے لہجے میں بولے۔

”چوہدری صاحب یہ تو اللہ کے کام ہیں، میں ہلا اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔“ اماں کمزور سے لہجے میں بولیں۔

”بس بس زیادہ بک بک نہ کر، بڑی آئی مجھے سمجھانے والی۔ جو کہہ رہا ہوں وہی ہو۔“ ابا دھاڑے۔ ماں باپ کی باتیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کسی صورت میں بیٹا نہ ہو۔ ورنہ میری بادشاہی میں کوئی حصے دار آ جائے گا۔ میرے اندر جہن اور حسد کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے دن رات دعائیں مانگنا شروع کر دیں کہ اب کی بار بہن ہو، اور آخر میری دعاؤں کے آگے ابا کی دعائیں ہار گئیں اور ایک بہن میرے لیے آئی۔ ابا کا غصے سے بُرا حال تھا۔ وہ تو اسے دیکھنے بھی نہیں گئے۔ بہن سے مجھے بھی کوئی مطلب نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آخر عورت ہے تو ایک کمزور مخلوق، اس کا اور ہمارا کیا مقابلہ۔ غرور، تکبر میرے اندر پنپ رہے تھے۔

اماں نے اُس کا نام ”نمین تارا“ رکھا۔ نین تارا بہت خوبصورت تھی۔ اماں اُس نازک سی گڑیا کے ساتھ بہت خوش تھیں۔

”قاسم ادھر آؤ بیٹا، دیکھو تمہاری بہن!“ میں کھیل کھاتا تھا کہ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”کیا ہے اماں!“ میں بدتمیزی سے بولا۔

”بیٹا اپنی بہن سے ملو دیکھو تمہارے لیے چھوٹی گڑیا آئی ہے۔“ اماں کے لہجے میں نین تارا کے لیے محبت تھی۔ ”تو میں کیا کروں۔ مجھے کسی بہن کی ضرورت نہیں ہے۔“ باپ کی زبان میرے منہ میں تھی۔ نین تارا کا وجود میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں اُسے مارتا، اس کے کھلونے توڑ دیتا، اُس کی چیزیں پھینچا دیتا۔ وہ روتی، شور مچاتی مگر کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں ابا کا لاؤلا اور اُن کا وارث تھا۔ اور نین تارا کو تو یاد رکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اماں مجھے سمجھاتی مگر میں اُن کی ایک نہیں سنتا تھا۔ میرے اسی سلوک کو دیکھتے ہوئے وہ

مجھ سے خوف زدہ رہنے لگی۔ میرے آنے پر چھپ جایا کرتی۔

”اماں بھائی مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ نین تارا اماں سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹا وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔ بس نا سبھ ہے اس لیے جھگڑا کرتا ہے۔“ اماں نے میری حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میں تو بھائی سے جھگڑا نہیں کرتی۔“ نین تارا نے لحوں میں کتنی گہری بات کی تھی۔ میں چند لحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ مگر پھر اپنی ازلی بہت دھرمی کے باعث باہر چلا گیا۔ کیونکہ مجھے نین تارا اور اُس کی باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

اماں نے نین تارا کو اسکول داخل کروا دیا۔ وہ بہت شوق سے اسکول جاتی۔ مجھے اسکول جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں تو صرف دوسرے بچوں پر اپنی برتری ثابت کرنے جاتا تھا، کہ پڑھ لکھ کر وہ میرے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔ بلکہ رہیں گے وہ ہمارے ملازم ہی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نین تارا پڑھائی میں اور میں اپنی آوارگی میں بڑھتا رہا۔ شرارتیں بھی کرتا اور ابا کو شکایت استاد کی لگاتا۔ جب ابا انھیں ذلیل و خوار کرتے تو میری فرعونیت کو بڑی تسکین ملتی۔

نین تارا نے میٹرک اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ پورے گاؤں میں دھوم مچی تھی۔ صورت اور سیرت میں تو باکمال تھی ہی پڑھائی میں بھی اُس نے میدان مار لیا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کے چہرے پر نین تارا کے لیے عزت اور محبت دیکھی تھی۔ مجھ سے وہ ڈرتے تھے۔ مگر نین وہ مجھ سے نفرت بھی کرتے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ نین تارا سے حد محسوس ہوا۔ یعنی ایک لڑکے کے سامنے ایک لڑکی فوقیت لے گئی تھی۔ حویلی میں آنے جانے والے اماں ابا کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اور میرا حسد کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اماں سے اس بات کا اظہار کیا کہ اُسے شہر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لینا ہے۔ یہ سنتا تھا کہ میرے تن بدن میں آگ

لگ گئی۔ ابا اور میں نے خوب مخالفت کی۔
 ”کیا ضرورت ہے آگے پڑھنے کی۔“ میں نے
 قہر آلود لہجے میں اسے گھورا تھا۔
 ”ابا مجھے شوق ہے۔“ نین تار نے پہلی بار
 زبان کھولی۔
 ”پڑھ کر کیا تو تیر مارے گی، کرنا تو پھر بھی چولہا
 بانڈی ہے۔“ میرے لہجے میں تحارت تھی۔
 ”پتر پڑھنے دے بے چاری کو۔“ اماں حمایت
 میں بولی۔
 ”نا بھی ضرورت کیا ہے شہر جا کر پڑھنے کی،
 کرنی تو تیری شادی ہے۔ ہم نے کون سا تجھ سے
 نوکری کروائی ہے۔“ ابا غصے سے دھاڑے۔
 ”چودری صاحب میں نے آپ سے زندگی
 میں کبھی کچھ نہیں مانگا مگر اپنی بیٹی کے لیے منت کرتی
 ہوں کہ اُسے پڑھنے کی اجازت دے دیں۔“ اماں
 ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔
 ”ابا بس زیادہ غور نہ کر۔ نا تو بس نا، کوئی
 ضرورت نہیں ہے لڑکی ذات کو سر پر بٹھانے کی۔“
 میں نے نفرت سے کہتے ہوئے نین تار پر نظر
 ڈالی، اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔ مگر
 مجھے ذرا رحم نہیں آتا تھا۔
 اور پھر اماں کی التجائیں اور نین تار کی دعائیں
 رنگ لے آئیں، ابا مان گئے تھے۔
 میں نے سنا تو حیران رہ گیا تھا۔ ابا کی نفرت
 اور تحارت کہاں گئی تھی۔ شاید بیٹی کی محبت جاگ گئی
 تھی۔ ابا نے اس شرط پر شہر پڑھنے کی اجازت دی
 تھی، کہ نین تار کو کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گی جس
 سے ہماری عزت پر حرف آئے اور نین تار نے
 وعدہ کیا تھا۔
 نین تار کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو گیا تھا۔
 میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ جب اُسے ہوش
 سے چھٹیاں ہوتیں تو میں اسے لینے جاتا۔ سارے
 راستے اُسے ڈانٹا، ڈراتا، بلایا اور اس پر عیب ڈالتا۔
 ”دیر سے کیوں آئی۔ کہیں کسی سے چکر تو نہیں
 چلا رہی۔ ایسی کوئی خبر مجھے ملی تو یاد رکھنا تو زندہ جو ملی

نہیں جائے گی، تیری لاش نکلوے نکلوے کر کے لے کر
 جاؤں گا۔“
 وہ سارے راستے آنسو بہاتی مگر مجھے رحم نہ آتا۔
 حوبلی جا کر بھی اماں ابا کو اس کی جھوٹی شکایتیں لگاتا۔
 شاید اس طریقے سے میں اُس سے انتقام لیتا کہ وہ
 پڑھائی میں مجھ سے آگے کیوں نکل رہی تھی۔
 اسی دوران حوبلی میں میری شادی کے ہنگامے
 جاگ گئے۔
 گل بانو میری مگی تھی۔ جواب دلہن بن کر حوبلی
 کی رونق بڑھانے آ گئی۔ میں بہت خوش تھا۔ مگر اس
 خوشی میں بھی میرا دل نین تار سے صاف نہیں ہوا تھا۔
 وہ میری نفرت کا ہمیشہ شکار رہی تھی۔
 گل بانو اور نین تار کی بہت اچھی دوستی ہو گئی
 تھی۔ مگر وہ مجھ سے خائف ہی رہتی تھی۔ میں نے اُس
 کو کبھی بھائیوں والا پیار جونہیں دیا تھا۔ ہم مرد نہ جانے
 عورتوں کے معاملے میں اس قدر خود غرض اور تنگ نظر
 کیوں ہوتے ہیں؟

☆☆☆

”نین تار ڈاکٹر بن گئی۔“ یہ خبر میرے تن بدن
 میں آگ لگ گئی تھی۔ ساری حوبلی میں جشن کا سماں
 تھا۔ ہر کوئی ابا کو مبارکباد دے رہا تھا۔ ابا کی عزت کو
 چار چاند جوگ لگے تھے۔ پہلی بار کوئی لڑکی اتنا زیادہ
 پڑھ گئی تھی۔
 ”بیٹا تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔“ ابا نے
 نین تار کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
 ”ابا آپ کی عزت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ
 پیاری ہے۔“ ڈاکٹر بن کر بھی نین تار کے انداز میں
 عاجزی اور انکساری ختم نہیں ہوئی تھی۔
 ”میری بیٹی بہت نصیبوں والی ہے۔“ اماں کے
 لہجے میں اُس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ مجھے اُن کا پیار
 ایک آنکھ نہیں بھار رہا تھا۔
 ”نین تار میں نے ہمیشہ تجھ سے نفرت کی۔ کبھی
 تجھے پیار نہیں دیا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی تو باپ کی
 محبت سے محروم رہی۔“ ابا کے لہجے میں دکھ تھا۔
 میرے لیے خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔

”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ میرا خواب تھا
 ڈاکٹر بننے کا وہ پورا ہو گیا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں
 ہے۔“ نین تار کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر
 مسکراہٹ تھی۔
 ”مگر میں بیٹا تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا
 ہوں۔ اپنی تمام ذیادتیوں کا ازالہ۔“ ابا پر عزم
 انداز میں بولے۔
 ”مجھے گاؤں میں ہسپتال بنانا ہے۔ اُس کے لیے
 زمین چاہیے۔“ نین تار نے امید بھری نظروں سے ابا
 کو دیکھا۔
 ”ہاں بیٹا جو تم کو ہوگی وہی ہوگا، جتنی زمین چاہیے
 لے لو۔“ ابا محبت سے بولے۔
 ”ابا میں جاہتی ہوں گاؤں والے علاج سے
 محروم نہ رہیں۔ انھیں شہر نہ جانا پڑے۔ انھیں علاج
 کی سہولیات گاؤں میں میسر ہوں۔“ نین تار کی
 لہجہ میں امید اور ولولہ تھا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسے زمین دینے
 کی، کرنی تو اس کی شادی ہی ہے تو پھر یہ نیا شوشا
 کیوں چھوڑا جا رہا ہے۔“ میں نے غصے سے مداخلت
 کرتے ہوئے کہا۔
 ”خوش ہو کر قاسم! یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ
 ہے۔“ ابا کو تو لگ ہی بدل گیا تھا۔
 ”ابا اگر تُو نے اسے زمین دی تو میں اس کے
 نکلے کر دوں گا۔“ میں نفرت سے پھینکا را۔
 ”اوئے آرام سے بہن ہے تیری۔“ ابا غصے
 سے چلائے۔
 ”آپ ہوتے کون ہیں میرے نکلے کرنے
 والے۔“ نین تار نے میری آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کر کہا۔ میں اُس کا اعتماد اور جرأت دیکھ کر حیران
 رہ گیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آ رہا تھا۔ میں نے
 آگے بڑھ کر اُسے تھپتھپانا چاہا کہ ابا میرے سامنے
 آگئے اور میرے منہ پر پھنٹر سید کیا۔
 ”اپنی بکواس بند کر اور چلا جا یہاں سے۔“ ابا
 نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور اس کی وجہ صرف
 نین تار تھی۔

”دیکھتا ہوں کیسے بنتا ہے ہسپتال۔“ میں دھمکی
 دیتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور جاتے جاتے نین
 تار پر نفرت بھری نگاہ ڈالنا نہیں بھولا تھا۔
 ☆☆☆
 ”قاسم کیوں غصہ کر رہے ہیں، بنانے دیں نا
 ہسپتال۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔“ گل بانو نے
 محبت سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”بکواس بند کرو اور میرا دماغ نہ کھاؤ۔“ میں
 غصے سے دھاڑا۔
 ”سب اُسی ناگن کے حمایتی بن گئے ہیں۔“ میرا
 خون غصے سے کھول رہا تھا۔ گل بانو خاموش ہو گئی تھی۔
 نفرت میرے خون میں شامل ہو گئی تھی۔ میرے سر پر
 انتقام سوار تھا۔
 ”میں اس جاگیر کا اکیلا مالک ہوں۔ کسی کو اس
 میں شریک نہیں بننے دوں گا۔“
 میں ساری رات جاگتا رہا اور منصوبے بناتا رہا
 کہ نین تار کو کیسے مزہ چکھاؤں۔ کیسے اُس سے اپنی
 بے عزتی کا بدلہ لوں کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔ اور پھر
 میرے شیطانی دماغ میں ایک ترکیب آئی تھی۔ جس
 سے سانپ بھی مر جاتا اور لالچی بھی نہ ٹوٹی۔ یعنی میں
 بُرا بھی نہیں بنوں گا اور نین تار میرے راستے سے
 ہٹ جائے گی۔
 صبح میں اپنے کمرے سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ابا
 اور نین تار زمین دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔ میں کھولتا
 ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرا ارادہ گاؤں سے باہر
 جانے کا تھا۔ گاؤں سے باہر ایک ہندو سا دھو تھا۔ جو
 کالے عملیات کا ماہر تھا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا۔
 اس کی جمپو پڑی سے ناگوار بُو آرہی تھی۔ جگہ جگہ
 کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔
 وہ شاید کسی چلے میں مصروف تھا۔ میں ایک جگہ
 بیٹھ گیا۔ نفرت اور حسد نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔
 وہ میری بہن تھی۔ مگر میں ظالم ہو گیا تھا، اُس کی
 ایک ذرا سی معصوم خواہش نے میرے اندر کے
 حیوان کو جگا دیا تھا۔
 ”بول کیوں آیا ہے۔“ سادھو کی اچاک آواز پر

میں چونکا تھا۔ سادھو نے میری طرف سرخ انگارہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
میں نے ہمت کر کے اسے ساری بات بتادی۔
نہیں تارا سے اپنی بے پناہ نفرت بھی۔

”یہ کن سا مشکل کام ہے، ہو جائے گا۔ بس تمہیں اس کے لیے دوشراٹھ ماننا ہوں گی۔“ سادھو گہرے لہجے میں بولا۔

”وہ کیا شرائط ہیں؟“ میں نے جوش سے بولا۔
”ایک 15 دن تک غسل نہیں کرنا اور کوئی نماز نہیں پڑھنی اور 15 دن کے بعد قرآن کی بے حرمی کر کے میرے پاس لے آنا۔“ سادھو رازدارانہ انداز میں میرے قریب جھکا۔

دوسری شرط سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ قرآن کی بے ادبی..... میں سوچ میں پڑ گیا۔
”اگر یہ نہیں کر سکتا تو چلا جا یہاں سے۔“ میری خاموشی پر سادھو چنچا۔

”دوسری شرط بہت مشکل ہے مگر اپنے مقصد کی خاطر یہ سب کروں گا۔“ حسد نے میرا ضمیر مار دیا تھا۔
اگر اُس دن میں واپس گھر چلا جاتا اور نین تارا سے نفرت ختم کر دیتا تو شاید آج اس حال میں نہ ہوتا۔

نماز تو میں پہلے ہی نہیں پڑھتا تھا۔ مگر جمعے کا مسئلہ تھا۔ جو اباکے ساتھ پڑھنے جاتا تھا۔ اور جہاں تک غسل کا تعلق تھا تو وہ میں سب سے چھپا سکتا تھا۔ مگر گل بانو واقف ہو سکتی تھی۔ اس کا میں نے یہ حل نکالا کہ کم از کم پڑے روز بدل لیا کروں۔ میں حویلی میں کسی سے زیادہ بات نہ کرتا۔ حویلی میں سب سمجھ رہے تھے کہ شاید مجھے عقل آگئی ہے۔ میں نے غسل چھوڑ دیا۔ مگر روز پکڑے بدل لیتا۔ جمعے کا دن آ گیا اس دن مجھے بہت بے چینی تھی۔ نماز چھوڑنے کی نہیں اب اسے بچنے کی۔ جمعے کے وقت ابا تیار ہو کر نکلے لگے تو انھوں نے مجھے بھی آواز دی۔

”قاسم آ جا جمعے کو دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے بہانہ بنایا کہ ابا میرے دوست کا ایکٹیوٹ ہو گیا ہے میں اُسے دیکھ کر وہیں سے مسجد آ جاؤں گا۔ یہ مصیبت ایسے مل گئی تھی۔ میں روز پکڑے تو بدل لیتا تھا۔ مگر

میری بیوی مجھے شک بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی۔
”قاسم آپ روز نہاتے ہیں مگر آپ کے کپڑوں سے ناگوار مہک آتی رہتی ہے۔“ گل بانو انھیں بھرے لہجے میں بولی۔

”مہک! مگر میں تو روز نہاتا ہوں۔“ میں نے تھوک نکلے ہوئے جھوٹ بولا۔
”چن نہیں مگر بہت ناگوار ہو ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شک کے بادل اُٹھے۔

”اچھا زیادہ یک یک مت کرو، بڑی آئی نیک بی بی۔“ میں نے ناگوار سی سے اُسے جھڑک دیا چ کر ڈوا جو تھا۔

☆☆☆

پندرہ دن ہو چکے تھے۔ دوسری شرط پوری کرنے کا وقت آچکا تھا۔ میں اپنی بیوی کے سونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سو گئی تو میں اٹھا، رات کے دو بجے تھے۔ میں نے الماری کھولی جس میں قرآن پاک رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پرانا قرآن پاک نکالا جو کوئی پڑھتا ہی نہیں تھا۔

میرے ہاتھ بڑی طرح کانپ رہے تھے۔ مگر کیا کرتا اُس نفرت اور حسد کا جو مجھے ایک پل بھی چین سے سونے نہیں دے رہی تھی۔ ابھی میں الماری بند کر کے نماز ہی تھا مجھے ایسا لگا کہ جیسے زمین ہل رہی ہو۔ میں اپنی جگہ رک سا گیا کہ واقعی زلزلہ آ رہا ہے۔ حویلی میں چیخ و پکار سی گئی تھی۔ میری بیوی جو اُمید سے تھی گھبرا کر اُٹھ گئی۔ حویلی میں سب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ میرا دل بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ زلزلہ نہیں ہے۔ قرآن کی ابھی ابھی جو بے حرمی ہوئی ہے یہ اُس کا نتیجہ تھا۔

کچھ دیر بعد زلزلہ رک گیا۔ حویلی میں سکون ہوتا گیا۔ صبح حویلی میں زلزلے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر گاؤں کے کسی فرد نے زلزلے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ سب حیران تھے کہ یہ کیسا زلزلہ تھا جو صرف حویلی والوں کو ہی محسوس ہوا تھا۔ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔

نیچے اترتے ہوئے میری نظر نین تارا پر پڑی، وہ

ابھی اب مجھ سے بات نہیں کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر اندر تک کڑوا ہو گیا۔ بہت جلد ڈاکٹر صاحبہ کی عقل لٹکانے آ جائے گی۔ یہ کام بہت خوفناک تھا۔ مگر وہ مجھے کرنا تھا۔

☆☆☆

”یہ لوا“ میں نے قرآن نکال کر سادھو کو دیا۔ جسے دیکھتے ہی سادھو کی آنکھوں میں شیطانی ہلک ابھری تھی۔
”بہت اچھے!“ سادھو میری طرف دیکھ کر کمر وہ

نہی سینے ہوئے بولا۔
”بس آگے کا کام آسان ہو گیا ہے۔“ سادھو نے ایک گڑیا نکالی۔ گڑیا کے سر میں سونیاں چھوئیں اور اس کی ٹانگوں کو کالے دھاگے سے باندھ دیا۔
”یہ لے۔“ سادھو نے گڑیا میری طرف بڑھادی۔

میں نے دیکھا گڑیا پر ”نین تارا“ کا نام لکھا تھا۔ یعنی میری منزل قریب آگئی تھی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سادھو نے قرآن دیکھ کر ان پر بڑھانی شروع کر دی تھی۔ پھر بھونک مار کر مجھے دے دیا۔

”اس کو اپنی بہن کے بستر کے نیچے رکھ دینا اور گڑیا قبرستان میں پرانی سی قبر میں دبا دینا اور یہ ہماری لوہان پر یہ منتر پڑھنے جو میں تمہیں بتا دیتا ہوں اور آخر میں تمہاری پربھونک مار کر گڑیا کے پیٹ میں گاڑ دینا۔“ سادھو نے تمام عمل کے بدلے میں ہماری رقم وصول کرتے ہوئے کہا۔

میں جھوپڑی سے نکلے لگا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ میں وہیں رک گیا۔ انسان کا ضمیر اُس کو کوڑے مارتا رہتا ہے جب تک انسان خود نہ ٹھان لے نے میں اُس کو آواز نہیں سنی۔ بارش تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ قدرت مختلف بہانوں سے انسان کو روکتی ہے، منع کرتی ہے۔ سمجھاتی ہے، ڈراتی ہے۔ مگر انسان جب شیطان بن جائے تو وہ کہاں باز آتا ہے۔ میرا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ شاید سادھو بھانپ گیا تھا۔ میری کیفیات کو وہ سمجھ رہا تھا۔

”کالے عملیات چاند کے آخری دنوں میں کیے

جاتے ہیں۔ خاص کر جب دشمن کو راستے سے ہٹانا ہو۔ اگر یہ دن گزر جائیں تو پھر پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔“ سادھو نے تیر چلایا تھا جو ٹھیک نٹا پر لگا تھا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ فوراً ہی جھوپڑی سے نکل پڑا۔

بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ ماحول میں ایک خوفناک سا احساس رہا تھا۔ بجلی چمکنے سے قبرستان کا ماحول مزید خوفناک لگ رہا تھا۔

میں نے گاڑی قبرستان کے باہر کھڑی کی اور مارچ نکال لی۔ قبرستان میں چلتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ ابھی قبریں پھینکی گئی ہیں اور مڑے باہر نکل آئیں گے اور مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں نے بہت مشکل سے خوف پر قابو پایا تھا۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے ایک پرانی قبر کی تلاش تھی۔ ایک ہاتھ میں مارچ اور دوسرے میں گڑیا۔ کچھ دیر کے بعد میرا ہاتھ پھسلا اور میرے ہاتھ سے گڑیا گر گئی۔ پہلے پرانی قبر تلاش کر رہا تھا اب گڑیا کی تلاش تھی۔

اللہ انسان کو بہانے سے روکتا ہے غلط کام کرنے سے، مگر رکتا وہی ہے جو انسان ہو، شیطان نے توازل سے نافرمانی کی ہے اور ابد تک نافرمانی ہی کرے گا۔ میں نے زمین کی طرف مارچ کا رخ کیا۔ قبروں پر روشنی پڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ قبر سے ہاتھ نکلے گا اور میری ٹانگیں پکڑے گا۔ میں نے ہمت کی اور گڑیا کی تلاش شروع کی۔ اچانک میرے پاؤں کے نیچے کوئی نرم چیز آئی تھی۔ میں نے دیکھا تو گڑیا ابھی۔ میں نے کچھ صاف کیا تو ”نین تارا“ لکھا ہوا نظر آیا۔

”منحوس کا پتلا بھی اتنا تنگ کر رہا ہے۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ میں نے جلدی سے پرانی قبر تلاش کی اور وہیں بیٹھ کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

میرا منہ سادھو کی ہدایت کے مطابق قبیلے کے رخ کے مخالف تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے غسل شروع کیا۔

ایک ایک کسی کے رونے کی آواز سنا دی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساتھ والی قبر پر منظر دیکھ کر میرا خون خوف سے جسنے لگا تھا۔ قبر کے اوپر ایک

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

800/-	ایم اے راحت	جادو
300/-	شازیہ اعجاز شازی	تیری یادوں کے گلاب
500/-	غزالہ طیل راؤ	کالج کے پھول
500/-	غزالہ طیل راؤ	دیا اور جگنو
500/-	غزالہ طیل راؤ	انائیل
500/-	فیصہ آصف خان	جیون جیل میں چاند کرنیں
500/-	فیصہ آصف خان	عشق کا کوئی انت نہیں
500/-	عطیہ زاہرہ	بگلیکے دھوپ کے صحرا
300/-	محمد سلیم اختر	یہ دیا مجھے نہ پائے
400/-	ایم اے راحت	دش کنیا
300/-	ایم اے راحت	درندہ
200/-	ایم اے راحت	تعلی
200/-	ایم اے راحت	بھرم
400/-	خاتون ساجد	چھپن
300/-	فاروق انجم	دھواں
300/-	فاروق انجم	دھڑکن
700/-	انوار صدیقی	درخشاں
400/-	اعجاز احمد نواب	آشیانہ
500/-	اعجاز احمد نواب	جزیرہ
999/-	اعجاز احمد نواب	ناگن

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمپنی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لکھاری، ہمیشہ اپنا ناول شائع

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

اگ لگ گئی ہے۔ وہ بیڈ سے اتر کر نیچے پلٹتی تو وہی
دوسرے آجاتے تھے۔ جن کے آنے سے کمرے
میں بڑے گوشت کی بدبو آنے لگتی۔ وہ ساری رات
وہی راتی۔ چند دنوں میں اُس کی حالت پاگلوں جیسی
ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں پُرسکون لیٹا اُس کی
آنکھوں کی آوازیں سناتا رہتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سائے
کے مٹکل تھے۔ جو عمل پورا کر رہے تھے۔ جو
کھانا کھا کر رہے تھے۔

میری میں سب بہت پریشان رہنے لگے تھے۔
میں کو کوئی مسئلہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ساری رات
وہی راتی رہتی۔ جیسے ہی بستر پر لیٹتی تو چیخیں مارتی
اٹھ جاتی۔ ایک رات اسی طرح رونے کی آواز
سہ میری آنکھ کھل گئی۔ اماں ابائی طرح رو رہے
تھے۔ میں تارائیڑھیوں کے پاس بے ہوش گری
پڑی تھی۔ اُسے ہسپتال لے جایا گیا تو پتا چلا کہ اُس
کی کمری بڑی ٹوٹ چکی ہے۔

وہ وہیل چیئر پر واپس حویلی آئی تھی۔ اس کو اس
حالت میں دیکھ کر مجھے رحم نہ آیا تھا۔ کس قدر پتھر دل تھا
میرا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی، ہنستا
والا بچہ چھوڑ دیا تھا۔ سب اُس کی زندگی کی دعائیں
دے رہے تھے اور میں اُسے قبر میں اتارنے کا انتظام
کے لیے آیا تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ سوتے میں مر گئی۔ کسی کو پتا نہ چلا
کہ اسے کیا ہوا تھا۔ میں خوش تھا کہ میرے راستے کا
پتھر ہٹ گیا تھا۔ اب پھر سے میری بادشاہی حویلی میں
کام ہونے والی تھی۔ اماں ابائےم سے نڈھال تھے۔ مگر
میراثون سفید ہو چکا تھا۔

”قاسم مجھے لگتا ہے نین تارا کی موت قدرتی
ہوئی ہے۔“ گل بانو پُرسوج انداز میں بولی۔
”کیا مطلب؟“ میں چونکتے ہوئے بولا۔
”یعنی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ نین تارا کو سایا
دیا تھا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ اُس پر کسی نے کچھ
کر دیا تھا۔“ گل بانو مزید بولی۔

”کیا بکواس ہے؟“ میں نے ڈانٹ دیا۔
”میں اندازہ نہیں لگا رہی اُس کے کمرے کی“

آگیا۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ میں نہایا اور
کپڑے تبدیل کیے۔ میں کافی دنوں بعد نہایا تھا اس
لیے خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت پرسکون
ہو کر سو گیا تھا۔

اب عمل کا دوسرا مرحلہ تھا۔ یہ کام مشکل تھا کیونکہ
میں کبھی نین تارا کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اور یہاں
یہ کہ اُس کے کمرے میں وہ قرآن رکھتا تھا۔ کسی
ملازمہ کو کہہ کر یہ کام کروانا مناسب نہیں تھا۔ کہیں
بات نہ نکل جائے۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا
تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔ ملازم نے بتایا کہ ابا
اور نین تارا ہسپتال کی زمین کے سلسلے میں باہر گئے
تھے۔ میرے پاس سنہری موقع تھا میں فوراً قرآن لے
کر نین تارا کے کمرے میں گیا اور جلدی سے بیڈ کے
بالکل درمیان میں رکھ کر فوراً باہر آ گیا تھا۔ کسی کو پتا نہ
چل سکا تھا۔

☆☆☆

میرا بیٹا ہوا تھا۔ میں بہت خوش تھا ساری حویلی
میں جشن منایا گیا تھا۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی
تھی۔ ابا اماں، نین تارا سب بہت خوش تھے۔
رات کے کسی پہر نین تارا کی چیخوں سے پوری
حویلی گونج اٹھی تھی۔ ہم سب اٹھ گئے۔ نین تارا
مستل روئے جاری تھی۔ اماں اور ابا اسے تسلی دے
رہے تھے۔

”نین تارا کیا ہوا ہے! کیوں رو رہی ہو؟“ گل
بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

”بھابی میرے کمرے میں دو لمبے لمبے کالے
سائے تھے۔ وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ انھوں
نے میری گردن دبانے کی کوشش کی تو میری چیخ نکل
گئی۔“ نین تارا روتے ہوئے بولی۔

لگتا ہے کہ علم نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا
ہے۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا تھا۔ اماں اُسے
اپنے کمرے میں لے گئی۔ بس پھر تو یہ سلسلہ شروع
ہو گیا۔ وہ ساری رات روتی رہتی چیخیں مارتی رہتی۔
کبھی کہتی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کبھی کہتی میں
جیسے ہی سونے لگتی ہوں ایسے لگتا ہے سارے جسم میں

آدھی بیضا رو رہا تھا۔ اس کا لباس سفید لیکن بہت میلا
ہو رہا تھا۔ چہرے سے کئی برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ مگر
حیرت کی بات تھی کہ بارش کے قطرے گرنے کے
باوجود اس کا لباس گیلیا نہیں ہو رہا تھا۔ خوف کے
مارے میں عمل کرنا بھول گیا اور آنکھیں پھاڑے
اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔

”ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو بیٹیوں کو
زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ برباد ہوتے وہ لوگ جو
عورتوں کا وراثت کا حق کھا جاتے ہیں۔ کوئی ٹھکانہ
نہیں ان کا اس دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔“

اس کی آواز سے بہت تکلیف نمایاں تھی۔ ایسی
آواز جیسے بہت تعدد اور اذیت کے بعد انسان کرا رہا
ہو۔ وہ دوبارہ رونے لگا تھا۔ اب اُس کی آواز اس
قدر بھیانک تھی کہ مجھے لگا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔
میں تیزی سے اٹھا۔ بھاگتے ہی لگا تھا کہ وہی ہندو
سادھو نظر آیا۔ اس نے مجھے قبر کے پاس دھکیل دیا۔

”کہاں جا رہے ہو عمل اُدھورا چھوڑ کر۔ یاد رکھو
اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میری مددگار تو تین شخصیں
زندہ نہیں چھوڑیں گی، عمل اُلٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اس
لیے عمل پورا کرو۔“ سادھو کی آنکھیں سرخ انگارہ
ہو رہی تھیں۔

ایک دفعہ پھر ضمیر کی جنگ شروع ہو گئی۔ آخر کار
شیطان جیت گیا اور ضمیر کی آواز خاموش ہو گئی۔ اب
مجھے اپنی زندگی کی فکر تھی۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے
میں نے نین تارا کو قبر میں اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

بارش ہلکی ہو چکی تھی۔ آخر میں نے چھری پر
پھونک مار کر گڑیا کے پیٹ میں گاڑ دی۔ بادل زور
سے گر جا اور بجلی چمکی تھی۔ بجلی کی چمک میں سارا
قبرستان نمایاں ہو کر بھیانک لگ رہا تھا۔ بہت سی
جگاڑیں نہ جانے کہاں سے شور مچاتی ہوئی گزر
گئیں۔ میرا دل خوف کے مارے دھڑکا تھا۔ کچھ
عجیب و غریب پرندوں کی آوازیں بلند ہوئی تھیں اور
پھر ہر سوناٹا چھا گیا۔ عمل ختم کر کے میں نے گڑیا قبر
کھود کر اُس میں دیدی۔ اور بہت مطمئن ہو کر گھر

صفائی کرتے ہوئے قرآن ملتا تھا۔ جس سے...
“گل بانو تاسف بھرے انداز میں بولی۔
 بے کار باتیں کر کے میرا سر نہ کھاؤ۔
 اپنے اندازے اپنے پاس رکھو۔“ میں نے
 اُسے جھڑک دیا۔

☆☆☆

میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو وہ معذور تھا۔ میرا دل بچھ
 سا گیا۔ چند دنوں کے بعد میرا بیٹا فوت ہو گیا۔ میرے
 اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ چکا تھا۔ اماں ابا تو پہلے ہی جوان
 بیٹی کی موت پر ہنسا رہے تھے۔ اب مزید دھمی ہو گئے
 تھے۔ ایک قیامت تھی جو حویلی پر ٹوٹ چکی تھی۔ اور پھر
 اس کے بعد حویلی پر غم کے بادل چھا گئے۔ حویلی میں
 پھر بھی خوشی نہ آئی۔

میرا بڑا بیٹا میٹر جیوں سے گرا اور گرتے ہی
 مر گیا تھا۔ میری کمر ٹوٹ چکی تھی۔ گل بانو بالکل
 خاموش ہو گئی تھی۔ نین تارا کی موت کے بعد مجھے
 ہر کام میں نقصان ہو رہا تھا۔ کبھی تیار فصل تباہ
 ہو جاتی۔ کبھی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔ ایک
 رات میں سوتے سے اٹھ گیا۔ پسینے میں بھیگ چکا
 تھا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں نے کمرے کا
 دروازہ کھولا تو ایک لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
 اس لڑکی نے سر اٹھایا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ
 نین تارا تھی۔

”بھائی آپ نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا۔
 میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے وقت سے
 پہلے مجھے مار دیا۔“ نین تارا کی آنکھوں میں آنسو اور
 لبوں پر شکوہ تھا۔ میرے خوف سے پسینے چھوٹ گئے
 میں گنگ کھڑا تھا۔

”میرے اللہ تو! اسے کبھی معاف نہ کرنا۔ نہ دنیا
 میں اور نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔“ نین تارا
 نے آسمان کی طرف دیکھا اور دردناک انداز میں
 کہتے ہوئے غائب ہو گئی۔

میں کئی دیر تک بستر پر پریشان بیٹھا رہا تھا۔ یہ
 مصیبت میں نے خود مول لی تھی۔ اب بھٹکتے کا وقت

آچکا تھا۔

میری بیوی پھر امید سے تھی۔ پتا نہیں کیوں اس
 بار مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس بار میرے
 ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ میں ساری ساری رات
 جاگتا رہتا۔ نین تارا کی بے بسی اور اُس کی چپٹیں مجھے
 رات بھر جگاتی تھیں۔

میں گاؤں کے امام مسجد کے پاس اپنا مسئلہ
 کر گیا کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ وہ علم و حکمت
 میں بہت سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انھوں نے میرا مسئلہ
 سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ پڑھنا شروع
 کر دیا۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان کے ماتھے پر
 ناگواری سے بل تھے۔

”قرآن کی بے حرمتی کرو، کالام کرو اور ناحق
 کسی کا قتل کرو اور اس کے بعد یہ کہنا کہ مجھے سکون
 کی نیند نہیں آتی۔ چوہدری صاحب میرے پاس
 آپ کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ نے حقوق
 اللہ اور حقوق العباد دونوں میں زیادتی کی ہے۔
 آپ چلے جائیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں
 کر سکتا۔“ امام صاحب نے مجھے مایوس بنا دیا تھا۔

میری بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اُسے
 شہر لے کر جانا پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے جو خیر بھی
 سنائی تھی اُسے سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی
 تھی۔ میرا بیٹا ہوا تھا جس کے دوسرے تھے۔ اس کی
 رنگت بالکل سیاہ تھی۔ اس کی آواز اس قدر بھیانک
 تھی کہ سب لوگ تو یہ استغفار کر رہے تھے۔ میری
 بیوی قریب المرگ تھی۔ ڈاکٹروں نے صاف
 جواب دے دیا تھا۔

”قاسم میں جانتی ہوں کہ نین تارا پر کالام آپ
 نے کروا دیا تھا۔ قرآن پاک کی بے حرمتی تھی آپ نے
 کی تھی۔ اللہ نے ہمیں اولاد کے ڈھک دیے تاکہ ہمیں
 سزا ملے۔“ یہ کہہ کر گل بانو نے دم توڑ دیا تھا۔ میرا بچہ
 بھی مر چکا تھا۔ اماں ابا تو صدمے جھیل کے ٹوٹ سے
 گئے تھے۔ اب اس نئے غم پر ایک ایک کر کے دنیا سے
 منہ موڑ گئے۔

میں سارا دن دیوانوں کی طرح پھرتا رہتا تھا۔

اس حویلی کا واحد مالک بننے کے لیے اتنا کچھ کیا وہ
 اور بچتی تھی۔
 ایک دن اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے نین تارا کی قبر پر
 آ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نین تارا کی قبر
 پر دوڑا تا ہوں۔ اللہ سے معافیاں مانگتا ہوں۔ قرآن
 کرا تھا لگا مجھے شرم آتی ہے۔“

چوہدری قاسم خاموش ہو چکا تھا۔ اُس کی کہانی
 سن کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں جو اُسے حوصلہ
 اپنے بیٹا تھا۔ میرا اپنا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔

میں نے ایک نظر چوہدری قاسم پر ڈالی اور
 ہمدردی سے بالکل باہر نکل آیا۔ بارش اب بھی
 اور ہی گئی مگر اب مجھ سے واپس رکا نہیں جا رہا تھا۔ میں
 دراصل قدموں سے چلتا ہوا قبروں کے پاس سے گزرا
 تو میری نظر نین تارا کی قبر پر پڑی۔ اس خاموش اور
 سکون قبر کے نیچے یہ داستان چھپی تھی۔

میں گھر آ گیا مگر دل و دماغ چوہدری قاسم کی
 طرف لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ مگر میں اس
 کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کافی دنوں تک میں
 کمرستان نہیں گیا تھا۔ دو ہفتوں کے بعد میرا کمرستان
 مالا ہوا تھا، تو دیکھا کہ چوہدری قاسم کا ڈرائیور ”نین
 تارا“ کی قبر کی صفائی کر رہا تھا۔ اور اس پر پھول ڈال
 رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔
 ”چوہدری صاحب خود نہیں آئے۔“ میں نے
 ملازم سے پوچھا۔

”چوہدری صاحب اب چل نہیں سکتے۔“ ملازم
 کے بتانے پر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”کیوں کیا ہوا انھیں۔“ میں نا بھگی سے بولا۔
 ”انھیں کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا
 جس کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے ہیں۔“ ملازم
 کہہ کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

میں شام کو سیدھا حویلی گیا۔ چوہدری بستر پر لیٹا
 تھا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں
 آنسو تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا میں نے وجہ
 پوچھی۔

”بس اللہ کی پکڑ میں آ گیا ہوں۔ میں اب چل
 نہیں سکتا۔ میں نے قرآن کی بے حرمتی کی تھی۔ اس
 دن میں نین تارا کی قبر پر بیٹھا رو رہا تھا کہ عجیب
 وغریب بڑے بڑے کیڑوں نے میری ناگوں پر کاٹ
 لیا۔ کالے علم کی وجہ سے میں ایمان بھی گنوا بیٹھا۔ جس
 دولت و جائیداد کی خاطر میں نے سب کیا اب وہ
 میرے لیے بے معنی ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ وہ زار و قطار
 رونے لگا۔ میں نے نسلی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ
 کہے اور گھر آ گیا۔

فجر کی اذان کے وقت میری آنکھ کھلی۔ میں وضو
 کر کے مسجد جانے لگا تھا کہ اعلان ہوا۔ ”چوہدری
 قاسم رضائے الہی سے وفات پا گئے ہیں۔“
 میں تیزی سے مسجد کی طرف گیا۔ معلوم ہوا کہ
 چوہدری قاسم کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی کہ ناگوں کاٹنی
 پڑ گئی اور وہ برداشت نہ کر سکا اور فوت ہو گیا۔

چوہدری قاسم کی تدفین کے بعد میں قبر کے پاس
 بیٹھا اُن کی مغفرت اور آسانی کے لیے دعا کر رہا تھا
 کہ اچانک میری نظر کچھ عجیب وغریب کیڑوں پر پڑی
 وہ بہت تیزی کے ساتھ چوہدری قاسم کی قبر کی طرف
 آرہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں خوف سے پیچھے ہٹ
 گیا۔ ایسے کیڑے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے
 تھے۔ وہ تیزی سے قبر میں اتر کر غائب ہو گئے۔ میں
 نے شدت غم اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

”اے اللہ تو ہی چوہدری قاسم کی مغفرت فرما۔“
 میں دعا کر کے قبرستان سے باہر آ گیا۔

بالکل صحیح ہے کہ کالا جادو کرنے والا کافر ہے۔
 کیونکہ وہ اللہ سے جھگڑا کرتا ہے۔ اپنی تقدیر پر راضی
 نہیں ہوتا۔ اپنا ایمان بھی گنوا بیٹھتا ہے اور دنیا آخرت
 بھی برباد کر لیتا ہے۔

قاری میری آپ سے گزارش ہے کہ کبھی بھی
 نفرت اور دشمنی میں اتنا آگے نہ بڑھ جائیں کہ کالے
 جادو کا سہارا لینا پڑے۔ یہ دولت سب سے رہ جاتی ہے۔ دنیا
 سے جاتے وقت صرف نیک اعمال کا ذخیرہ ہی ضروری
 ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆



پہلے اور پھر کی تیسری خاص کہانی

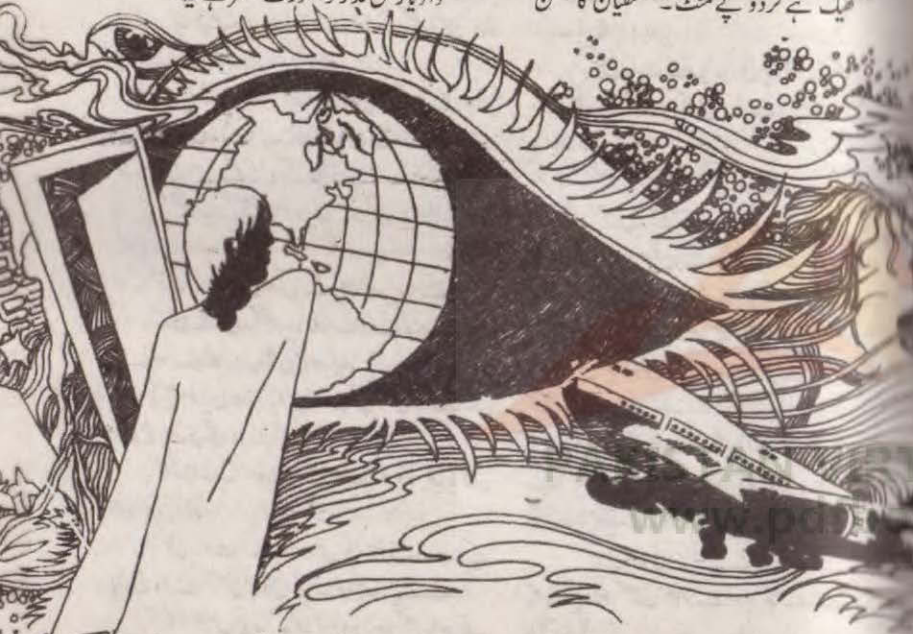
روم نمبر 607

نفیسہ سعید

اٹلی میں پیش آنے والا قصہ حیرت کلام اللہ کی طاقت کا پیش خیمہ

روم نمبر 607 کے دروازے پر پہنچ کر وینر نے حیدر سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور اندر لے جا کر ان کا سامان رکھ دیا، سفیان نے آگے بڑھ کر سامنے لگی بڑی شیشے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا، سامنے نظر آنے والے دریائے نمبر کا منظر اس قدر دلکش تھا وہ چند لمحوں قبل سیڑھیاں چڑھنے سے پیدا ہونے والی تھکن اور بے زاری ایک ہی پل میں بھول گیا۔ وینر سامان رکھ کر جا چکا تھا۔ حیدر بھی اس کے پیچھے ہی آن کھڑا ہوا۔

”مٹا فلور کچھ زیادہ اوپر نہیں، آنے جانے کے ہول کے مطابق زیادہ معلومات نہ رکھتے تھے پھر بھی نیکی سی ڈرائیور کی کوششوں اور کچھ ٹیٹ سرچنگ کے بعد ایئر پورٹ سے تقریباً آدھا گھنٹہ کی مسافت پر انھیں ایک ہول میں خالی کمرہ مل ہی گیا۔ جس پر ان دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا ورنہ عام طور پر تعطیلات کے دنوں میں روم جیسے شہر میں سیاحوں کا رش اس قدر ہوتا ہے کہ خالی کمرہ ملنا محال ہو جاتا ہے۔ اگر انھیں یہ سب پہلے سے علم ہوتا تو یقیناً یہاں آنے سے قبل وہ اپنے ڈیلر کے ذریعے کسی ہول میں روم بھی بک کر واپس لیتے۔ ان پر تو روم آتے ہی ایک افتاد یہ بھی پڑی تھی کہ وہ جس سے ملنے اتنی دور آئے تھے، وہ بندہ کبھی شہر میں موجود نہ تھا۔ پریڈ انو اچانک فیمیلی میں ہونے والی کسی ڈیٹھ کے سبب دودن کے لیے شہر سے باہر تھا۔ ویسے بھی ان دونوں کے لیے یہ کوئی بڑا ایڈیوٹ نہ تھا۔ وہ نوادرات کی خرید و فروخت کے ساتھ اپنا سیاحت کا شوق بھی پورا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ روم گھومنے کا موقع اتنی آسانی سے مل گیا۔ ہول ریسر تراز میں چھنے فلور پر بشکل ایک روم خالی تھا۔“



”ہاں اور اس کی خوبصورتی میں اضافے کا ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہم اسے بلندی سے دیکھ رہے ہیں۔“ سفیان نے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے بے خودی سے کہا۔

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ حیدر نے اس کی بات کی تائید کی۔

آ جاؤ کھانا کھالیں، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ ہول آتے ہوئے کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ کیونکہ یہاں آنے کے بعد انھیں حلال حرام کا بہت خیال رکھنا پڑتا اور پھر کھانا کھا کر وہ دونوں ایسی

کے مارے برا حال تھا۔ ایسے میں یورپی ترازو کے فلور پر ملنے والا ایک خالی کمرہ بھی اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ پوری پرمٹ کرنے کے بعد وینر کی رہنمائی میں وہ دونوں اپنا سامان اٹھائے ہوئے ہول کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں تک آتے آتے ان دونوں کی سانس بھول گئی۔ کیونکہ حیدر کو لفٹ فوہیا تھا اور وہ بھی کبھی، کسی بھی صورت لفٹ میں سوار نہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے بحالت مجبوری سفیان کو بھی ہمیشہ اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی جو وہ چھٹے فلور سے گھبرا رہا تھا۔

سفیان اور اس کا دوست حیدر علی دونوں مل کر نوادرات کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے اس بزنس کا دائرہ کار تھائی لینڈ، بنگاک اور یورپ کے دیگر ممالک تک پھیلا ہوا تھا، جن میں خاص طور پر اٹلی بھی شامل تھا۔ یہ دونوں دوست تھائی لینڈ سے قیمتی پتھر اٹھاتے اور ان ممالک میں سپلائی کرتے جو ان کے خریدار تھے۔ جس کے سلسلے میں ان کا زیادہ تر وقت پاکستان سے باہر ہی گزرتا۔

دو سال پرانی بات ہے جب حسب روایت سفیان اور حیدر علی نوادرات کی خریداری کے لیے تھائی لینڈ گئے۔ اس دفعہ انھیں اٹلی سے کوئی بہت بڑا خریدار ملا تھا جس کی ڈیمانڈ کے مطابق قیمتی پتھر کی خریداری کے سلسلے میں یہ دونوں تقریباً دو سے تین دن تھائی لینڈ رکنے کے بعد اپنے سارے سامان سمیت اٹلی کے شہر روم جا پہنچے۔ جہاں وہ ڈیلر موجود تھا، جس کو انھوں نے اپنی ڈیلوری پہنچائی تھی۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے انھیں تقریباً رات ہو چکی تھی۔ ایئر پورٹ کے آس پاس کسی ہول میں کوئی روم خالی نہ تھا۔ عام حالات میں وہ دونوں یورپ کے دوسرے شہروں میں تو جاتے رہے تھے لیکن روم آنے

جنگی جلیں دہی

کہتے ہیں کہ اللہ والوں کی مدد مناجاب اللہ ضرور ہوتی ہے۔ بس تو کل علی اللہ قوی ہونا شرط ہے۔ ہم بھی اگر اپنی ساری اچھی برائیوں اور اللہ پر بھروسہ کریں تو مدد ضرور آتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری بہت غریب تھا۔ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں تھا۔ اور وہ کسی سے کچھ مانگ کر نہیں کھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے باہر گیا تو اُس کی بیگم نے سوچا کہ بڑوں میں کسی پر ظاہر نہ ہو کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اُس نے جھوٹا کچھ نہیں بنا کر تندر میں ڈال کر تندر جلا یا اور اندر جا کر چکی چلائے گی۔

تندر میں دیر بعد جب اس کا شور واپس آیا تو پوچھا کہ تم جنگی جلیں کس رہی ہو؟
 وہی نے اسے اندر بلایا۔ جب دونوں اندر گئے تو دیکھا کہ چکی خود بخود چل رہی ہے اور آٹا نکل رہا ہے۔
 وہی جلدی جلدی برتنوں میں آٹا بھرنے لگی۔ گھر کے سارے برتن آٹے سے بھر گئے۔ پھر اس نے باہر جا کر تندر کو دیکھا تو وہ روٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انصاری نبی اکرمؐ کے پاس گیا اور جا کر سارا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ پھر چکی کا کیا ہوا؟ انصاری نے جواب دیا کہ پھر میں نے اُسے اٹھا کر جھاڑ دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم چکی کو اسی طرح رہنے دیتے تو وہ تمہاری زندگی تک یونہی چلتی رہتی۔ سبحان اللہ۔

(زور قلم: نزہت ناز۔ کراچی)

تھا جب لڑکی نے آواز دے کر روکتے ہوئے سوال کیا۔ جبکہ حیدر اوپر چڑھ چکا تھا۔

”ہاں۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ وہیں کھڑا رہا تاکہ پتا چلے لڑکی مزید کیا کہنے والی ہے۔

”ایسور تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔“

سفیان نے اس کا جملہ سن کر غور کیا تو پتا چلا وہ ایک انڈین لڑکی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکی رکی نہیں بلکہ تیز تیز سیر حیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ سفیان آہستہ آہستہ چڑھتا اوپر آیا تو حیدر فریٹس ہو کر اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھی وہ کالی میم۔“ انگریزی لباس میں سانولی لڑکی دیکھ کر حیدر ہمیشہ یہی جملہ کسا کرتا تھا۔

”وہی ایک سوال۔“ سفیان نے اسٹینڈ پر لگا تولیہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

”روم نمبر 607؟“ حیدر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں یا رکھ نہیں آتا، ان تین دنوں میں کوئی تین سو لوگ ایک ہی بات بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”آپ وہاں ایسی ٹیل کر رہے ہیں سر۔“ اس کا ادا ادا ہر سرسری سا تھا۔

”ایسی ہی ہم وہاں انجوائے کر رہے ہیں یار۔“

”سگریٹ کا ایک بڑا سا کش لگاتے ہوئے“

”انجوائے۔“ ہوٹل منیجر ایک بار پھر سے حیران رہا۔

”پاکل انجوائے، تم شاید کبھی اپنے ہوٹل کے کس فلور پر نہیں گئے۔ اگر جاتے تو میری بات سن کر انجوائے نہ ہوتے۔“

اس بار منیجر نے بنا کوئی جواب دیے جلدی جلدی اس کاٹ کر سلپ اور کارڈ حیدر کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

روم گھوم کر ان دونوں کی واپسی تقریباً دو بجے ہوئی۔ جب وہ آہستہ آہستہ سیر حیاں چڑھ کر اوپر

ہارے تھے اسی بل اوپر سے نیچے اترتی ایک لڑکی ان

”تم دونوں وہی ایشین ہونا جو روم نمبر 607 میں رہ رہے ہو۔“ سفیان تھرڈ فلور کی جانب بڑھا ہی

حیدر نے ایک نظر ڈرا نیور کے چہرے پر ڈالی۔ بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے آنکھیں موند ہوئے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائی۔ جبکہ سلمان لا پرواہی سے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے روم کے نظارے دیکھنے میں بوجھا۔

”آپ لوگ روم نمبر 607 میں کب سے رہ رہے ہیں؟“ ان دونوں جانب سے جواب نہ پا کر کسی نیکی ڈرائیور نے ہمت نہ ہاری اور اپنا پرانا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

”کل رات سے یار، کوئی پراہم ہے کیا؟“ حیدر نے ہلکی سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں اس اوکے۔۔۔۔۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“ اس وقت تو وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے رات واپسی پر ہوٹل کے میز کی جانب سے کیے جانے والے سوال نے حیدر کو بتادیا، اس وقت جب وہ واپس آ کر اوپر جا رہے تھے تو فرسٹ فلور پر ہی انھیں وہ وہی لڑکی جو کل ان کا سامان کمرے میں پہنچا کر آ

”آپ آج رات بھی اسی کمرے میں رہیں گے؟“ وہ آج پھر ان دونوں کو اوپر جاتا دیکھ کر اپنی حیرت ناچھپا سکا۔

”کیوں بھائی اس کمرے میں ایسا کون سا خزانہ چھپا ہے جو تمہیں ہمارے اوپر جانے سے پریشانی لاحق ہوئی۔“

”سوری سر میں نے تو دیئے ہی پوچھ لیا۔“ جلدی جلدی بولتا ہوا وہ ویٹیر سیر حیاں اتر گیا۔

☆☆☆

”ہم مزید دو دن یہاں رہیں گے اور دونوں دن ہمیں روم نمبر 607 میں ہی رہنا ہے۔“ حیدر اور سفیان نے باہمی مشورے کے بعد ہوٹل منیجر کو نہ صرف اپنے فیصلے سے آگاہ کیا بلکہ دو دن کی ایڈوانس پے منٹ بھی کر دی۔

”روم نمبر 607!!“ منیجر کا کونٹر پر رکھے نوٹ اٹھاتے ہوئے رک گیا۔

گہری نیند سوئے کہ آنکھیں کھلیا۔ وہ بھی شاید سفیان کے فون پر آنے والی کسی کال سے۔ ورنہ تو وہ اسی طرح بے خود پڑے رہتے۔

☆☆☆

صبح کے بعد وہ دونوں ہوٹل کے سوئمنگ پول کی جانب آ گئے۔ سوئمنگ کا شوق دونوں میں سے کسی کو بھی نہ تھا یہاں آنے کا ان کا مقصد صرف تفریح تھا۔

سوئمنگ پول کے ایک جانب موجود بگڑی کے بیچ پر یہ دونوں جا بیٹھے، جب ایک بوڑھا شخص ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس کا سوال اناہلین میں تھا، جواب میں سفیان نے ذرا سا پرے سرک کے اس کے لیے جگہ بنادی۔

”شکریہ۔“ بیٹھتے ہوئے وہ شکریہ ادا کرتا نہ بھولا۔

”سنا ہے تم اس ہوٹل کے چھنے فلور پر رہتے ہو؟“

”جی۔“ حیدر مختصر سا جواب دے کر سامنے نظر آنے والے نظاروں میں گم ہو گیا۔

”مسلمان ہو؟“ اس دفعہ اس شخص کا لہجہ میں کچھ حیرت کی تھی۔

”الحمد للہ۔“ سفیان بنایہ سوچے کہ وہ سمجھایا نہیں فوراً بول اٹھا۔

”کل رات سے۔“ اس کی طرف سے کیے جانے والے مسلسل سوال کو ابھار رہے تھے۔

”گاڈ بلیس یو۔“ یہ کہہ کر وہ بوڑھا شخص اچانک ہی بیٹھنے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سفیان نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ کیونکہ وہ اس اجنبی شخص کی بلاوجہ کی جراح سے اکتا گیا تھا۔

☆☆☆

”ہوٹل ریورٹی ترازو، روم نمبر 607، معاف کیجیے گا، سر آپ وہاں کب سے ہیں۔“

جس نیکی میں وہ دونوں روم گھومنے نکلے تھے اس نیکی کے باتونی ڈرائیور نے جیسے ہی یہ سنا کہ وہ دونوں ریورٹی ترازو کے روم نمبر 607 کے رہائشی ہیں۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

لعنت بھیجی جو سب پر، ویسے جو بھی ہواس فلور پر سکون بڑا ہے۔ ابھی جب ہم اوپر آ رہے تھے سب فلور پر گہما گہمی لیکن اوپر آتے ہی سکون مل گیا۔

حیدر کی بات سچ تھی، اس فلور پر دن کے ٹائم بھی کم ہی لوگ نظر آتے لیکن شام ہوتے ہی یہاں بالکل سناٹا چھا جاتا۔ حیدر بستر میں گھسا اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیل رہا تھا جب سفیان چیخ کر آیا۔ ابھی وہ بستر پر بیٹھے ہی لگا تھا کہ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی موجود ہے۔ سفیان نے پلٹ کر دیکھا۔ حیدر بڑے اطمینان سے ابھی بھی اپنے موبائل میں ہی بڑی تھا۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا، چاروں طرف کوئی نہ تھا۔

”شاید مجھے وہم ہوا ہے۔“ دل ہی دل میں اپنے وہم پر مسکراتا جیسے ہی وہ سیدھا ہوا تاکہ لیت سکے، ایک دم کمرے کے سکوت میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ ہونٹ کا سارافرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی جو اس پر کسی کے چلنے کی ہلکی سی آواز بھی محسوس کی جاسکتی تھی، خاص طور پر رات کے اس پیل، سناٹے میں ابھرنے والی یہ آواز خاصی نمایاں تھی۔ سفیان چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسی دم اُسے حیدر کی حیرت زدہ آواز سنائی تھی۔

”تھیں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ایسے جیسے کوئی یہاں اس فرش پر چل رہا ہو۔ وہ بھی اپنے قدم گھٹ گھٹ کر۔“

”ہاں اور مجھے ایسا بھی محسوس ہوا جیسے فرش پر رکھے جانے والے قدم خامسے پھاری تھے۔“

آواز آتا بالکل بند ہو چکی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس وقت کمرے میں موجود کوئی انجان ہستی ان دونوں کی باتیں سن رہی ہو۔

”میرا خیال ہے کوئی ہمارے کمرے کے باہر تھا، اُسی کے چلنے کی آواز رات کے اس سناٹے میں گونج رہی تھی۔ سو جاؤ اب!“

آواز آتا بالکل بند ہو چکی تھی۔ اس لیے سفیان نے حیدر کو تسلی دی۔ اسی پل چاپ ایک بار پھر سے

ابھری، اس بار آواز پہلے سے خاصی تیز تھی، شاید چلنے والے نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی تھی۔

”کیا مصیبت ہے یہ۔“ سفیان ایک دم سے اُٹھ بیٹھا۔

”صبح مجھے ڈانٹنگ ہال میں ایک لڑکی ملی تھی جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ہمیں پہلی ہی فرصت میں یہ دم چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن میں نے اس کی کسی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، شاید وہ مجھے کچھ اور بھی بتانا چاہ رہی تھی۔“ حیدر بھی دوبارہ ابھرنے والی آواز سن کر اُٹھ بیٹھا، اُسی پل کمرے میں لکڑی کا بھاری فرنیچر بڑی طرح لرزنے لگا۔

”میرا خیال ہے زلزلہ آ گیا ہے۔“ خوف زدہ حیدر بستر پر اٹھ بیٹھا مگر اسی لمحے کسی نے اس کا بیڈ اُٹھا کر زمین سے اوپر کر دیا۔ یقیناً اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کہیں وہ اس ساری رفتار کو زلزلہ سمجھ کر کمرے سے باہر نہ نکل جائے۔

”پلیز مجھے نیچے اتار دو۔“ خوف سے حیدر کی گھٹی بندھ گئی مگر سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوا، حیدر کا بیڈ ابھی بھی ہوا میں معلق تھا۔

”پلیز مجھے نیچے اتار دو۔“ اس دفعہ اس کے الفاظ انا لائن زبان میں تھے شاید اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کمرے میں موجود ہوائی مخلوق کی سمجھ میں اُس کی زبان نہیں آ رہی اور اگلے ایک ہی سیکنڈ میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کی فریاد سن لی گئی اور بیڈ دوبارہ سے اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اب ایک بار پھر کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ سفیان کو یاد آیا اس نے ابھی تک آیت الکرسی کا ورد نہ کیا تھا جو وہ جب عادت سونے سے قبل کرتا تھا اور شاید موبائل گیم میں مصروف حیدر بھی آیت الکرسی اور دیگر حفاظتی دعائیں پڑھنا بھول گیا تھا۔ اسی لیے یہ سب افتاد نازل ہو رہی تھیں۔

”آیت الکرسی پڑھو۔“ سفیان نے خوف زدہ بیٹھے حیدر کو کارا، مگر ان کے آیت الکرسی کا ورد شروع کرنے سے قبل ہی کمرے میں موجود اس مخلوق نے ایک عجیب و غریب حرکت اور کی، اُن کا سارا سامان

کمرے کے دروازے سے باہر پھینک دیا صرف ایک لمحوں میں ان کے بیگ جس میں قیمتی نوادرات بھی تھے۔ اس طرح کمرے سے باہر پھینکے گئے جیسے وہاں میں اُن کو چارے ہو۔ اس منظر نے ان کی یہ حالت کی کہ وہ دونوں آیت الکرسی پڑھنا ایک بار پھر ہول گئے صاف پتا لگ رہا تھا کہ اس طرح باہر نکلنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ دونوں اسی وقت کمرے سے نکل جائیں۔ اس کا یہ اشارہ سمجھتے ہی وہ پہلے حیدر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی تقلید میں انہوں نے جلدی جلدی چپل اپنے پاؤں میں پھنسانی کی۔ اب اسے حیدر کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

”ہم باہر جانا چاہتے ہیں آپ جو کوئی بھی ہو ہمیں صرف اتنا بتا دو کہ آپ کہاں کھڑے ہوتا کہ ہم آپ سے بچ کر کمرے سے باہر جا سکیں۔“

اس نے اس دفعہ بھی یہ تمام باتیں انا لائن زبان میں کہیں۔ اس کی زبان سے ان الفاظ کی ادائیگی کے لمحے ہی کمرے میں موجود ہستی نے انہیں اپنی ہڈی کا احساس اس طرح دلایا کہ وہ دونوں ہکا بکا ہو گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے کمرے میں موجود ہوائی مخلوق کو ہونٹ کی چھت سے لگا دی۔ اتنی وزنی باتیں اس طرح ہوا میں معلق ہونا یقیناً اس بات کی نشاندہی تھا کہ وہ مخلوق اس وقت وہاں ہی کھڑی ہے وہاں ہوا میں ٹبل معلق تھا۔ اب سفیان اور حیدر کے اُن کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی ہڈی بچا کر کمرے سے نکل بھاگیں اور اپنے دونوں ہاتھ بیک بیک گھمٹتے ہوئے وہ پانچ منٹ میں نیچے اُٹھ کر فلور پر آ گئے۔

آج وہ نیچے لفٹ سے آئے تھے کیونکہ خوف زدہ ہونا ان کا فطری رویہ تھا۔ نیچے آتے ہی سفیان نے پلٹ کر پڑھنا بھول گیا۔

”جب تم سب لوگوں کو علم تھا کہ 607 نمبر کمرے کی حالت کا کبیرا ہے تو تم نے جرأت کیسے کی ہمیں وہ بات کہنے کی۔“

”ایک منٹ سرائیل سے میری بات سنیں، ہم آپ کو روم صرف ایک رات کے لیے دیا تھا اور

اس رات کی صبح جب آپ بخیریت نیچے آ گئے تو ہمیں خود حیرت ہوئی۔ لیکن اگلی رات بھی آپ کو کسی نے کچھ نہ کہا تو ہم بھی خاموش ہو گئے اور پھر وہاں مزید رہنے کا پروگرام آپ کا تھا۔ جبکہ میں نے بے منٹ لینے سے قبل آپ کو سمجھا نا چاہا تھا لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔“

غیبر کی بات درست تھی سفیان خاموش ہو گیا۔ ”مگر پھر بھی آپ کا فرض تھا ہمیں اس سارے خطرے سے آگاہ کر دیتے۔“ اب جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پہلے کی نسبت نرم تھا۔

”اصل میں سر ہم نے سنا تھا کہ مسلمانوں کے کلام میں وہ خاصیت ہوتی ہے جو ایسی بڑی چیزوں کو بھگا سکے اور آپ چونکہ مسلمان تھے اس لیے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے آپ نے اپنے کلام کی طاقت سے اس بڑی مخلوق کو زیر کر لیا ہے۔“

”اوہ۔“ حیدر نے غیبر کی پوری بات سن کر اپنے ہونٹ مسکڑے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پچھلے تین دن سے ہم دونوں آیت الکرسی اور چاروں فل کے علاوہ بھی کچھ خاص دعائیں پڑھ کر سوتے رہے ہیں اس لیے کچھ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی جو آج اس نے ہمیں روحانی عمل سے قبل ہی روک دیا اور اپنا شیطانی کام شروع کر دیا۔“

اب ان دونوں کی سمجھ میں ساری بات آ گئی اور پھر اس رات کا باقی وقت انھوں نے نیچے لاؤنڈ میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر گزار لیا۔ لیکن جب تک وہ وہاں سے واپس نہ آئے سارے کمرے کے لوگ انھیں باری باری آ کر دیکھتے، ان سے ملتے اور حیرت کا اظہار کرتے کہ تین راتیں اُس کمرے میں گزارنے کے بعد وہ زندہ تھے۔

یقیناً ہمارے کلام پاک میں ایسی تاثیر موجود ہے جو بڑی بلاؤں کو ہم سب سے دور رکھنے کا سبب بنتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہم سب مسلمانوں کو ایسی شیطانی بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

☆☆☆



پراسرار لڑکی چشتی عاص کہانی

گم شدہ چہرہ

شانی خان

اس لڑکی کی لرزادینے والی خوف بیتی جس کا چہرہ ہوائی مخلوق نے گئی تھی

بیٹی کو دعا دیتے ہوئے بولی تھی۔

”اماں آپ بھی ناشتا کر لیں تو خود صاحب کے گھر جانا ہے۔ اُن کی بیوی نے اپنی ماہم کے لیے ایک بہت اچھا رشتا بتایا ہے۔

ہاں بیٹا اچھی بات ہے۔ خیر سے ماہم اب بڑی ہو گئی ہے۔ جتنی جلد اپنے گھر کی ہوا چھائے وہی ہے مجھے ماہم کے حوالے سے بہت پریشانی ہی رہتی ہے۔ عجیب لڑکوں والی عادتیں ہیں اُس کی۔ نہ کسی کا ڈر نہ خوف، بھلا کیا کام تھا کل بھرے بازار میں اُس لڑکے کی پٹائی کا۔ ارے اُس نے دوسری لڑکی کو چھیڑا تھا، کون بھی درمیان میں مولا جٹ بن کر سامنے آئے والی۔ یہ کوئی تنگ ہے۔ لیکن کرو بہو میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ یہ بہادری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتی۔ نجانے کب کیا گل بھلا دے۔ بہتر ہے جتنی جلدی اپنے گھر کی کرو اس کو۔“ دادی کل کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے بولی تھیں۔

☆☆☆

”ماہم ماہم گھر آ گیا ہے اُتر و جلدی سے۔“ سعدیہ ماہم کا کاندھا ہلاتے ہوئے بولی اور ماہم چونک کر جلدی سے اپنا پرس سنبھالتی ہوا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”اے لڑکی گھوڑی ہو گئی ہے مگر وہی بچپن والی عادتیں..... کب تجھے عقل آئے گی۔“ صابرہ بیگم اپنی پوتی کو جو صحن میں گلے گھنے نیم تلے بال بنانے میں مصروف تھی۔ دیکھ کر بولی تھیں۔

”ارے کم عقل شام ہوتے ہی بال کھول کر بیڑ تلے آ جاتی ہے۔ جانتی نہیں اس سے طرح طرح کی چیزیں باہر نکلتی ہیں۔“

”ارے میری پیاری سی دادی جان آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ آپ کی یہ طرح طرح کی مخلوق بڑی نا قدری ہے، انھیں میں کہاں نظر آنے والی۔ میرے ایسے بھائی کہاں۔“ وہ دادی کو مزید تاؤ دلاتے ہوئے بولی تھی۔

”ارے اُن کو کی بچھی نہ ہو تو۔ یہ کیا فضولیات بک رہی ہے۔ پناہ مانگو خدا سے۔“ دادی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”امی میری بس آنے والی ہے، آج مجھے کچھ دیر ہو جائے گی۔ واپسی سعدیہ کے ساتھ ہوگی۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ جلدی سے حلق میں اتارتے ہوئے بولی تھیں۔

”اچھا بیٹا خدا کی امان میں جاؤ آؤ۔“ عالیہ بیگم

”خدا کے لیے بس کرو ماہم، ان گندی اور خوفناک گلیوں کی شان میں اور قہیدے نہ سناؤ مجھے۔ چلو یہاں سے۔“ سعدیہ ماہم کی کیفیت جان کر بے چین سی ہوئی تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

☆☆☆

”سنو عالیہ بیگم! شام کو تیار رہنا۔ صدیقی صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ انھوں نے ایک بہت اچھا اور مناسب ریٹ کا گھر ہمارے لیے دیکھا ہے۔ مجھے تو پسند آیا تم اور بچے بھی دیکھ آؤ تو میں فائل بات کروں۔“ وہ چائے کا سب لیتے ہوئے بولے تھے۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یہ گھر اب بچوں کی اور ہماری ضرورتوں کے لیے چھوٹا بڑا رہا ہے۔ خیر سے ہمارے تینوں بچے اب بڑے ہو گئے ہیں اور ویسے بھی ہمیں جلد ہی ماہم کی شادی بھی کرنی ہے۔ بڑا گھر ہوگا تو سہولت رہے گی۔“

”ہاں عالیہ بیگم! آج کہو تو میں بھی روز روز کی اس گھر بدلنے کی ہجرت سے تنگ آ گیا ہوں۔ خدا ہمیں بھی اپنا گھر دے۔ یہ مالک مکان کی گھر خالی کرنے کی کتنی تلوار ہر وقت سر پر رہتی ہے تو اس سے بھی جان چھوٹے۔“ وہ



شیطان کا سامان تجارت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا۔ چار گدھوں پر سامان تجارت لاوے شیطان جا رہا ہے۔ آپ نے پوچھا۔ ”اے مردود! یہ کیا لے کر جا رہے ہو؟“

شیطان نے کہا۔ ”یہ مال تجارت ہے“ ایک گدھے پر ظلم دوسرے پر خیانت تیسرے پر مکر و فریب اور چوتھے پر حسد لاوا ہوا ہے۔“

شیطان نے کہا۔ ”اس مال کا خریدار کون ہے؟“

شیطان نے کہا۔ ”ظلم حکمرانوں اور بادشاہوں کے کام کی چیز ہے“ وہ اس کو

خریدتے ہیں خیانت تاجروں کے ہاتھ

فروخت کرتا ہوں مکر و فریب عورتوں کو پسند

ہے اور حسد کی علما کے ہاں بہت مانگ ہے

میرے تمام مال کے گاہک موجود ہیں۔“

حسن انتخاب۔ رازِ عدل۔ بحریں

لوگ سمجھتے ہیں اُس لڑکے نے تیزاب ڈال کر میرا چہرہ بگاڑ ڈالا ہے، کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ لوگ مجھے دیوانہ جانتے ہیں مگر میں جانتی ہوں سچ کیا ہے۔ بہت زمانہ گزر گیا ہے۔ میرا سب کچھ کھو گیا ہے۔ میں گھوٹی ہوں مگر میں آج بھی ہر گندی گلی کی تاریکی میں اپنا روشن چہرہ تلاش کرتی ہوں، جس کی بلی چڑھا دی گئی تھی۔ کسی دن ضرور میں اُن سے اپنا گم شدہ چہرہ واپس لینے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔“ اور پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

اُبڑے بکھرے بالوں، گندے کپڑے پہنے، مسخ چہرے والی ماہم نامی وہ عورت مجھے ایک گندی گلی کے کونے پر بیٹھی ملی تھی۔ اُس کی یہ افواہی داستان سن کر میں کہنے ہی لگتی تھی کہ اس کائنات میں کیسے کیسے اسرار چھپے ہیں ماہم کی طرح۔ ایک لمحے میں ایک قدم ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دے کچھ پتا نہیں۔ بس شش شش!!!! احتیاط کیجیے۔

☆☆☆

”ہمیں تمہاری خوبصورتی کی بلی دینی ہے لڑکی۔“ اس نے صرف تمہارا چہرہ چاہیے ہمیں۔ اس گندی گلی کی ماہم پوری ہستی آباد ہے اور تمہارا یہ چہرہ ہمارا وہ گندہ حصہ ہے جس کی ہمیں زمانوں سے تلاش تھی۔

”یہ خوشی کا سامان یونہی نہیں۔“ ان سب کے مکروہ قہقہے اُس کے کانوں میں زہر کی طرح گرنے لگے تھے اور پھر اک تیز آگ سی اُس کے اطراف دھک اٹھی۔ وہ بے آپ پھٹکی کی طرح اپنے گلی تھی۔ درد کی اذیت سے گھبرا کر بھاگتے تھے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

”آئیں انپلر صاحب! ماہم بی بی اب بیان کے قائل ہیں۔“ ڈاکٹر انھیں ماہم کے روم کی طرف لے جاتے ہوئے بولا تھا۔

وہ اب بھی بیڈوں میں جکڑی بے بس سی پڑی تھی۔ اُس کا درد، اس کی پُر پُر سے عیاں تھا۔

”بی ماہم صاحبہ! ایسی طبیعت ہے آپ کی۔“

ماہم آپ کی اذیت ختم تو نہیں کر سکتے مگر گناہ کا راس کے انجام تک پہنچا کر آپ کا درد کم ضرور

رہے ہیں۔ جلد کی خوف و دباؤ کے بتائیں کس

لایا آپ کے ساتھ یہ خوفناک، تڑپا دینے والا

لوہ، آپ کی دوست سعدیہ اور ایک بیٹی شاید

مطابق وہ لڑکا خرم جو آپ کو پسند کرتا تھا اور

آپ کے والدین کے رشتے پر انکار کے سبب اُس

لے انعام کی ہیں آپ کو تنہا جان کر آپ کے

پارے پر تیزاب ڈالا۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔ میرا چہرہ تو وہ لے گئے ہیں۔ خرم بے قصور ہے۔ جا میں سب یہاں

ہے۔“ وہ دیوانوں کی طرح چیختے گئی تو ڈاکٹر اسے

لے کر لے گئے۔

☆☆☆

اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ارے یہ کیا!!

وہ حیرانی سے گندی گلی میں کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ بہت سے سانولے سانولے بچے نیکر

پہنے اور ہم چارہ تھے۔ کچھ عورتیں ساڑیاں پہنے

کپڑے دھونے میں، کچھ چولہا جلانے کھانا بنانے

میں مصروف تھیں۔ جبکہ لال لال آنکھوں اور درمہالی

قد و قامت کے بہت سے مرد کھڑے ماہم کو گہری

نظروں سے تولنے میں مصروف تھے۔ اُن کی نگاہیں

ماہم کو اپنے وجود کے آ رہا ہونی محسوس ہو رہی تھیں۔

اُن عورتوں و مردوں کے حیلے اور لباس سے

ماہم کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اُن کا تعلق ہندو

مذہب سے تھا۔ مگر یہ یہاں کیسے..... کیا سننے سے

آئے ہیں اور میری طرح انھیں بھی یہ گلی یوں کر

پسند ہے۔ مگر بھلا گندی یوں گلی میں کپڑے دھونے

اور کھانا بنانے کی کیا تنگ ہے۔ وہ خود ہی سوال

و جواب سوچ رہی تھی۔ ہاں میں خود ہی جا کر ان

سے پوچھتی ہوں وہ گلی میں قدم آگے بڑھاتے

ہوئے سوچنے لگی۔ مگر یہ کیا..... گلی شیطان کی آنت

کی طرح لٹی ہوئی چلی گئی۔ اُس نے اپنی رفتار اور

تیز کر لی مگر گلی کی طوالت کم ہونے کے بجائے بڑھتی

چلی گئی۔ وہ کچھ کچھ حواس باختہ سی ہونے لگی تھی۔

آخر کی تو ایک ذات ہی۔ ایک آن دیسی دنیا

میں موجود ہونے کا ادراک اس میں بھریں ہوا اور

پسند اُس کے ہاتھ پر پانی کی طرح بہنے لگا۔ وادی

کی ساری نصیبتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگی۔

جنھیں وہ اکثر ایک کان سے سن کر دوسرے سے

نکال دیتی تھی۔ وہ انجانے میں اسرار کی ایک ایسی

جگہ پہنچ چکی تھی جہاں کے واپسی اس کے اختیار میں

نہ تھی۔ لال لال آنکھوں والے مرد اُس کے گرد

گھیرا تنگ کرنے لگے تھے۔ ماہم کا دل اچھل کر

حلق میں آ چکا تھا۔ آخر وہ دل کڑا کر کے بہت

ہمت سے بولی تھی۔

”پلیز مجھے گھر جانے دیں۔“

”ہاں جاؤ گی مگر ضرور مگر ایسے نہیں۔“

”پھر کیسے.....“ وہ سراپا سوال بن گئی۔

دل کا غبار ہٹا کرتے ہوئے بولے تھے، جواب میں عالیہ

بیگم نے ہنسنی آہ پر ہی انکشاف کیا تھا۔

☆☆☆

شام کو سرور صاحب بمعہ فیملی گھر دیکھنے پہنچ

گئے۔ چار بڑے بڑے کمرے، کھانا و سبج صحن، صاف

ستھرے پتھر کا ہاتھ روم۔ گھر ہر لحاظ سے عالیہ بیگم اور

بچوں کو پسند آیا مگر ماہم کو جو بات گھر کی سب سے

زیادہ پسند آئی۔ (بلکہ اُس کے دل کی مراد برآئی) وہ

گھر کے پیچھے گندی گلی کا ہونا تھا، جس کا دروازہ صحن

کے کونے میں بنا ہوا تھا۔

”واہ ابو! گھر تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے بس

آپ آج ہی قائل کریں۔“ ماہم خوشی سے مسکراتے

ہوئے بولی تھی۔

”ہاں ہاں فکر نہ کرو۔ میری صدیقی صاحب سے

بات ہوئی ہے اور میں ایڈوائس بھی دے چکا ہوں۔

آئندہ چند روز میں ہم یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔“

وہ پیار سے اپنی اکلوتی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے

بولے تھے۔

گھر کی شفٹنگ میں انھیں دو تین روز ہی لگے

اور سب اپنی روٹین میں واپس آ گئے مگر ماہم کی

روٹین سب سے الگ تھی۔ وہ گندی گلی کا راستہ

اپنے لیے اختیار کرنے لگی۔ بھلے سے کہیں بھی جانا

ہوتا۔ صبح کا بج کے لیے بھی اُسے گندی گلی سے جانا

پڑتا تھا۔ جس پر اُسے والدین خاص کر دادی سے

روز ہی جھڑپیں ہونے لگی۔

”ارے او کم عقل! کیوں باز نہیں آتی، صاف

راستہ چھوڑ کر چوروں کی طرح پچھلے راستے سے

کیوں آتی ہے۔“ دادی اُسے گھر میں داخل ہوتے

دیکھ کر غصے سے بولتی تھیں۔ مگر وہ دادی کی جھڑپیں

ان سنی کرتی مسکراتی، بلائی خوف و خطر وہی راستہ

اپناتی رہتی۔

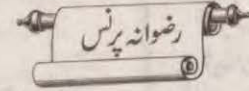
☆☆☆

آج سعدیہ کی خرابی صحت کی وجہ سے وہ اکیلی

کا بج لگتی تھی، سو واپسی پر بھی تنہا ہی تھی۔ وہ اپنی دھن

میں مگن گئی میں داخل ہوئی ہی تھی کہ تیز شور نے اُسے

بھوک



اس دوشیزہ کی خوف میں ڈوبی کھائے چاک تک ہی وہ بھوکے مل گئے تھے اور.....

اس وقت رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے اور وہ بڑے انہماک سے اکنامکس کی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ کل اسی سنجیکٹ کا پیپر تھا حالانکہ اس کی اچھی خاصی تیاری تھی لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی دل کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ یہی سوچ کر ہولے جا رہی تھی کہ اگر کل کا پیپر بہت مشکل آیا تو کیا ہوگا؟

اس نے پڑھتے پڑھتے چاک تک ہی وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی تو گھڑی کی سوئیاں ایک بج رہی تھیں۔ اس نے جھانی لیتے ہوئے کتاب میز پر رکھ دی۔ پانچ منٹ ریٹ کر لوں پھر نوٹس پڑھنا شروع کروں گی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا۔

پورا گھر ایک مہیب سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ امی ابو اور دونوں چھوٹے بہن بھائی اپنے اپنے کمروں میں دنیا و مافیہ سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ تمام کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوائے اس کے کمرے کے یا پھر برآمد میں 40 والٹ کا بلب روشن تھا جو ابو ہمیشہ رات کو جلا دیا کرتے تھے۔

پانچ منٹ ریٹ کرنے کے بعد اس نے نوٹس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ اسے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُسے پکار رہی تھیں۔ وہ بری طرح چونک اٹھی۔ اتنی رات گئے امی کیوں مجھے بلا رہی ہیں، کہیں کسی کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی مگر یہ کیا وہ دروازے میں ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔

کمرے میں پھیلا گہرا اندھیرا اور مکمل سکوت کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کمرے سے کسی نے بھی کوئی آواز نہیں دی ہے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر امی ابو کے بیڈ کی طرف دیکھا برآمدے سے آنے والی ملاجی سی روشنی میں اسے وہ دونوں بے خبر سوئے نظر آ رہے تھے۔

یقیناً یہ میرا وہم تھا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ واپس پلٹی تو سامنے علیب اور رمشا کے کمرے پر نظر پڑ گئی۔ وہ بے اختیار ان کے کمرے میں چلی آئی۔ اسے اپنے ان دونوں چھوٹے بہن بھائیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ آٹھ سال تک اس نے اکیلے ہی امی ابو کی بے

کیوں ایک عجیب سا خوف اسے اپنے رگ و پے میں دوڑاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے کتاب اٹھائی لیکن دباغ جیسے بلیک ساہور ہاتھ اس نے امی کی کتلی واضح آواز سنی تھی۔

”نیلا! نیلا جلدی آؤ۔“ کتلی بے قراری تھی ان کی آواز میں اور یہ وہم ہرگز نہیں تھا۔ اس نے اُلجھ کر کتاب نیچے رکھ دی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

آج دوپہر کو بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا تھا۔ دوپہر کو وہ کچھ دیر کے لیے اپنی بہت عزیز دوست سعدیہ کے گھر کچھ ضروری نوٹس پڑ سکس کرنے گئی تھی۔ سعدیہ ان کے گھر کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ بس دوسری کئی میں اس کا گھر تھا۔

واپسی پر گرمی کی شدت سے گھبرا کر اس نے



درخت کے نیچے کھڑے قلفی والے سے قلفی خریدنے کا ارادہ کیا۔ برس سے پیسے نکال کر وہ قلفی والے کی جانب بڑھی لیکن وہ پیسے لینے کے بجائے ایک ٹک اسے دیکھنے گیا۔ کیسی عجیب سی آنکھیں تھیں اس کی ساکت اور زندگی سے عاری آنکھیں! نیلما کے ہاتھ کپکپا گئے اور حلق میں جیسے کانٹے اُگ آئے۔ کچھ بولنا چاہا لیکن آواز نکل ہی نہ سکی۔

صرف چند لمحوں کی بات تھی پھر درخت کے اوپر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ منمنائی ہوئی سی ہنسی تھی۔ اس نے گہرا کراہ کر دیکھا۔ ایک عورت سرخ رنگ کے دوپٹے کا گھونگٹ کاڑھے اس درخت کی ایک شاخ پر اپنے دونوں پیر لٹا کر بیٹھی تھی۔

کیسے سیاہ اور سوکھے سوکھے سے پیر تھے اس کے جو لہنگے سے جھانکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نیلما کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا وہاں سے بھاگ جائے لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے پیروں میں جان ہی نہیں رہی تب ہی اتفاق سے بڑوس میں رہنے والی آنٹی اپنی کار میں وہاں سے گزریں اور اسے یوں حواس باختہ درخت کے نیچے کھڑا دیکھ کر انہوں نے کار روک لی اور اسے پکارا تو وہ حواس میں واپس آ گئی۔

”کیا ہوا نیلما سب خیریت ہے؟“ انہوں نے کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی قلفی والا اپنا ٹھیلہ لے کر آگے بڑھ گیا لیکن اس کی بے جان آنکھیں اس وقت بھی اسے اپنے چہرے پر جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر آئی کی کار کتر قریب آ گئی اور بنا پوچھے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

”آنٹی یہ قلفی والا بہت عجیب سا آدمی لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے۔“ چنانچہ کیسے بے اختیار ہی اس کے منہ سے خوف کے کپکپاتے ہوئے یہ جملہ نکلے تھے۔

آنٹی ٹھٹھکا کر ہنس پڑیں۔ ”ارے یا گل ایسے نہیں کہتے۔ دیکھو تو بے چارہ اس عمر میں، اتنی شدید گرمی میں گھر چلانے کے لیے کتنی محنت کر رہا ہے۔“

وہ کار کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔

تب ہی نیلما نے درخت کی اُس شاخ کی جانب دیکھا جہاں اسے وہ عجیب الخالقت عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی۔ لیکن اس وقت وہ شاخ بالکل خالی تھی۔ خوف سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ناحق ہی اس درخت کے نیچے آکھڑی ہوئی تھی۔ شاید یہ درخت چڑیلوں اور بھوتوں کا مسکن ہے۔

اس نے خوف سے کانپتے ہوئے سوچا لیکن آنٹی سے اس عورت کا ذکر نہیں کیا کہ وہ مذاق اڑاتیں اور پھر گھر آ کر امی سے بھی وہ اس واقعے کو چھپا گئی کیونکہ کل اس کا بہت اہم پیپر تھا اور امی کا کافی ضعیف الاعتقادہ خاتون تھیں۔ چنانچہ یہ سن کر ان کا ری ایکشن کیا ہوتا جبکہ وہ بڑی یکسوئی سے تیاری کرنا چاہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب میرا وہم ہو گری بھی تو اتنی شدید تھی۔

اس نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دے ڈالی تھی لیکن اب اس وقت رات کے اس گہرے سنائے میں وہ خوف جیسے دوبارہ دل کے اندر کند ڈال کر زور زور سے اسے پیچ رہا تھا۔ وہ زندگی سے عاری دوپے جان آنکھیں اسے چاروں جانب سے اپنی طرف گھوری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔

”یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید مجھے امی کو جگا دینا چاہیے۔“ اس نے کانپتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا تب ہی علیل کے رونے کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

”آئی! آئی!“ وہ بری طرح سے روتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔

وہ پوری قوت سے دوڑتی ہوئی علیل کے کمرے میں پہنچی تو ایک بے حد دہشت ناک اور روح فرسا منظر نے اس کے ہوش و حواس ہی معطل کر دیے۔ سامنے وہی قلفی والا بوڑھا بیٹھا اپنی زندگی سے عاری آنکھوں کے ساتھ اُسے گھور رہا تھا اور اس کی گود میں علیل تھا جو اس کے بازوؤں کے ٹکٹے میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے

بری طرح رور رہا تھا۔

”علیب!“ وہ پوری قوت سے چیخی۔

وہ بوڑھا آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ ایسی کریمہ ہنسی کہ نیلما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے پورے منہ میں صرف تین دانت تھے۔ جن میں ایک دانت ٹون سے تر تھا جبکہ باقی دونوں دانت بے انتہا میلے اور پیلے تھے۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے مجھے کچھ کھانے کو دو۔“ وہ عجیب منمنائی آواز میں اپنا استخوانی ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے علیل کو مضبوطی کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔

”امی بوجلدی آئیے۔“ نیلما کے حلق سے ایک دلہلہ وچ نکلی اور پھر وہ چلائی ہی چلی گئی۔ دفعتاً اسے کندھے پر کسی کا ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تو وہی صبح والی عورت جس کے چہرے پر اس وقت بھی گھونگٹ ہی پڑا ہوا تھا، اس کے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ نیلما کی چیخیں بے اختیار رک گئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔

”وہ بھوکا ہے، اسے کچھ کھانے کو دو۔“ گھونگٹ کے اندر سے وہ من من کرتی ہوئی بول رہی تھی۔ نیلما تھرتھرا کر ہنسنے لگی۔ علیل اب بھی بری طرح رور رہا تھا، تڑپ تڑپ کر اسے پکار رہا تھا لیکن کتنی حیرت کی بات تھی کہ ساتھ والے بیڈ پر لیٹی ہوئی رمشا کی نیند میں ڈر سا بھی خلل نہیں پڑا تھا اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ امی ابوتا شور وغل ہونے کے باوجود کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے، ورنہ امی کی آنکھ تو ذرا سی آہٹ سے کھل جاتی تھی۔

نیلما نے بڑی بے بسی سے اپنے چھوٹے سے معصوم بھائی کو دیکھا جو اس کریمہ شکل بوڑھے کے ٹکٹے میں جکڑا بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔

”میرے بھائی کو چھوڑ دو، تم کو اللہ کا واسطہ!“ وہ بے اختیار روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ خوف، دہشت اور پریشانی سے جیسے اس کا ذہن مفلوج ہوتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی۔

”اسے کھانا دو وہ بھوکا ہے۔“ دفعتاً وہی منوس آواز سرگوشی کی صورت میں اس کے کان کے پاس گونجی۔

نیلما کا دل خوف سے بند ہوتے ہوئے بچا۔ وہ عورت بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ چکی تھی اور چہرے سے گھونگٹ بھی سرک چکا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں زندگی کی کوئی رقی نہیں تھی۔ نیلما کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ناک کی جگہ محض ایک سوراخ تھا اور ہونٹ بھی بالکل سفید تھے۔ وہ اپنا استخوانی ہاتھ نیلما کے کندھے پر رکھے صرف ایک ہی جملے کی گردان کر رہی تھی۔

”اسے کھانا دو وہ بھوکا ہے۔“ ”اچھا میں ابھی کھانا لانی ہوں تم لوگ علیل کو چھوڑ دو۔“ وہ اس سے دور ہتے ہوئے بولی۔ خوف سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ وہ لرزرتے قدموں سے علیل کی جانب بڑھی۔

”میرے بھائی کو چھوڑ دو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔“ اس نے بڑے ملتیانہ انداز میں بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے علیل کی جانب اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیے لیکن دوسرے ہی لمحے خوف کی شدت سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیل کی آنکھیں ایک دم سے بے رقی ہوئی تھیں۔ ایسی آنکھیں جن میں زندگی کی کوئی بھی رقی نہ ہو۔ وہ اسے گھورتے ہوئے ہنسنے لگا۔ بالکل اسی بوڑھے کی طرح۔ نیلما پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھنے لگی۔

اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اس کو اپنا پاس بلارہا تھا۔

”آئی میرے پاس آؤ۔“ نیلما نے دیکھا اس کے سات سالہ بھائی کا معصوم چہرہ اس وقت ایک بہت بوڑھے شخص کے چہرے جیسا لگ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایسی بھیاںک ہنسی تھی کہ وہ تھرا کر رہ گئی۔ وہ عورت اس کے پاس سے گزر کر علیل کے نزدیک پہنچ گئی اور پھر اس نے بوڑھے کی گود سے علیل کو کچھن کر زمین پر پڑ دیا۔

نیلما کی بے اختیار چیخ نکل گئی لیکن علیل پر جیسے

گرنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسرے ہی لمحے پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پھرتی اور نیلما کے خوف زدہ چہرے کو دیکھ کر وہ عورت اور بوڑھا زور زور سے ہنسنے لگے۔ علیل نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

”ہی ہی ہی۔“ کمرے میں چار سوان لوگوں کی کمریہ ہنسی کی آواز گونجنے لگی۔

نیلما کی ٹانگیں اور ذہن دونوں ہی شل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ چیخا چاہ رہی تھی لیکن حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اس نے ان تینوں کو رمشا کے بیڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ بوڑھا اپنی منمناتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے رمشا کے نزدیک آ کر رک گیا جبکہ علیل اور وہ عورت ابھی بدستور بیٹے جا رہے تھے۔

”رمشا یہاں سے بھاگو۔“ نیلما ہڈیانی انداز میں چیختی تھی پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ اسپتال کے ایک سفید بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی امی اور ابو اس کے سر ہانے کھڑے ہوئے تھے۔ پریشانی ان کے چہروں سے ہوید اٹھی۔ امی کی آنکھیں بہت رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”امی آپ لوگ کہاں تھے؟ میں نے آپ لوگوں کو کتنا پکارا، کتنی آوازیں دیں۔“ چند لمحے ان لوگوں کو جھٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ یکا یک ہڈیانی انداز میں چلانے لگی۔

”رمشا کو بچا لیں، علیل کہاں ہے۔“ وہ چیخ چیخ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں سب کمرے میں جمع ہو گئے تھے لیکن وہ کبھی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی پھر زبردستی اسے نیند کا انجکشن دے دیا گیا اور اس کا ذہن ایک بار پھر غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس بار جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں امی اور ابو کے علاوہ علیل اور رمشا بھی تھے۔ وہ چند لمحے

چپ چاپ دم سادھے علیل کو دیکھتی رہی۔

”آپ امی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ علیل اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر بھاگ کر اس کے قریب آ گیا جبکہ امی اور ابو بھی اس کے نزدیک آ کر اس کے ہاتھ سہلانے لگے۔

”علیل وہ بوڑھا آدمی اور وہ عورت کیسے چلے گئے؟“ اس نے نقابت بھرے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”کون بوڑھا آدمی؟“ علیل کی معصوم آنکھوں میں تحیر امنڈ آئی۔

”بیٹے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ امی نے ہول کر نیلما کو گلے سے لگالیا لیکن وہ بدستور خوف زدہ نظروں سے علیل کو دیکھتی رہی۔

”یہ میری بچی کو کیا ہو گیا ہے حسیب!“ وہ بے اختیار رو دیں۔

☆☆☆

آج صبح جب وہ سوکر اٹھی تھیں تو علیل اور رمشا کو اسکول کے لیے جگانے سے پہلے وہ نیلما کے کمرے میں آئیں تھیں کہ اس کو پیپر کے لیے کہیں دیر نہ ہو جائے لیکن اسے کمرے میں نہ پا کر وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی بچوں کے کمرے میں آئیں تو دروازے پر ہی نیلما کو فرش پر بے ہوش پڑا دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ ہڈیانی انداز میں چیخنے لگیں۔

ان کی چیخ پکار سن کر حسیب صاحب دوڑے چلے آئے تھے۔ اس کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اسے آج دو دن کے بعد ہوش آیا تھا۔ ڈاکٹر زبھی سمجھ نہیں پارے تھے کہ آخر اسے ہوا کیا تھا۔ انہوں نے حسیب صاحب کو یہی بتایا تھا کہ ان کی بچی کا ذہن کسی شدید خوف اور ڈپریشن کے زیر اثر ہے اور اس وقت اس کی آنکھوں سے جھلکتا خوف ڈاکٹروں کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔

”نیلما بیٹا مجھے بتاؤ تم کس بات سے خوف زدہ ہو۔ میں ہوں نا تمہارے پاس میں سب ٹھیک کر دوں گا۔“ حسیب صاحب نے بہت پیار سے اس کا سر

سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”پھر آپ رات کو کیوں ہماری مدد کو نہیں آئے اب مجھے، رمشا اور علیل کو وہ لوگ ڈرا رہے تھے، ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ وہ آنسوؤں سے لگی ہوئی آواز میں ان سے شکوہ کرنے لگی۔

”کون ڈرا رہا تھا مجھے سب تفصیل سے بتاؤ بیٹا!“ حسیب صاحب نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے چکار کر پوچھا جبکہ امی دم سادھے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

نیلما نے خوفزدہ نظروں سے علیل کی جانب دیکھا جو نزدیک ہی خاموش کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت نیلما کو واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ہونٹوں پر ویسی ہی کمریہ مسکراہٹ رہی تھی۔ نیلما نے کچپا کر حسیب صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ابو ان لوگوں نے علیل پر جادو کر دیا ہے۔ اس کو اپنے جیسا بنا دیا ہے۔“ وہ خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں علیل کو دیکھ کر بولی۔

حسیب صاحب نے کچھ حیرت سے علیل کی جانب دیکھا جو اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کی معصومیت بھر کر ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نیلما کی جانب تھوڑا سا جھکا۔ ”آپ امی مجھے کیا بتا دیا ہے ان لوگوں نے؟“ بڑی معصومیت سے اس نے سوال کیا تھا۔

نیلما نے بے اختیار اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا وہی سرزدنگی سے عاری ساکت آنکھیں اس کو تنک رہی تھیں اور اس کا چہرہ کسی بہت ہی بوڑھے شخص کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

وہ تھر تھر کا پنے لگی۔ چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ ”ابو یہ علیل نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے علیل کو مار دیا ہے۔ آپ میرا یقین کریں ابو میرا علیل شاید مر گیا ہے۔“ وہ بے اختیار حسیب صاحب کا ہاتھ تھام کر بے تحاشا رونے لگی، اس کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ امی بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر رو رہی تھیں۔

”حسیب میری بچی پر کوئی سایا ہو گیا ہے، آپ کسی مولوی کو بلا لیں۔“ وہ اسے اپنے پیچھے سے لپٹاتے ہوئے رندگی ہوئی آواز سے کہہ رہی تھیں۔

”بیٹے اعلیٰ اللہ رکھے بالکل ٹھیک ہے، دیکھو یہ تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہے۔“ حسیب صاحب نے اسے چکار تے ہوئے علیل کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن نیلما منہ چھپائے روئی رہی۔ وہ اس چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہی تھی جو اس کے علیل کا تھا ہی نہیں۔ وہ چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی یہ ہی کہتی رہی کہ ابو آپ میرا یقین کر لیں ان لوگوں نے میرے علیل کو مار دیا ہے۔

”آپ امی میں زندہ ہوں آپ مجھے چھو کر دیکھیں۔“ اچانک ہی وہ اچک کر اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

اتنا اچانک کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس اس کے پیچھے ہی نیلما کو اپنے رگ دپے میں ایک برف جیسی ٹھنڈک کے پھیلنے کا احساس بے حد شدت کے ساتھ ہوا۔ علیل کے بے حد سرد ہاتھ اس کی گردن پر تھے اور وہ بہت آہستگی کے ساتھ اس کے کانوں میں بے حد عیب سی آواز کے ساتھ سرگوشی کر رہا تھا۔

”میں زندہ ہوں لیکن آج تم مر جاؤ گی، پھر رمشا مرے گی، ہی ہی ہی۔“ کتنی کمر وہ لہتی تھی وہ۔

نیلما نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی گود سے ہٹانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں بلکہ اس سے کچھ اور چٹ گیا۔ نیلما نے پوری قوت سے اس کو اپنے آپ سے الگ کرنا چاہا لیکن اس سات سال کے بچے میں جیسے نولا جیسی قوت آگئی تھی اور اس کی خنت اور سرد ہاتھوں میں نوکیلے کانٹے آگ آئے تھے جو نیلما کو اپنی گردن میں پیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے امی کو پکارنا چاہا، ابو کو آواز دینی چاہی لیکن بس وہ ہونٹ ہلا کر رہ گئی۔ آواز حلق سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔

علیل کا چہرہ بالکل اس کے منہ کے قریب

تھا۔ بے جان ساکت آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے بہت بے بسی کے ساتھ امی کی جانب دیکھا تو دہشت سے اس کا تیز رفتاری سے دھڑکتا دل ایک دم سے ساکت ہو گیا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بس ان کو دیکھتی رہ گئی کیونکہ وہاں اس کی امی کی جگہ وہی کرہیہ صورت عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے زرد دانتوں پر لگی خون کی بوندیں بہت واضح تھیں اور وہ رمشا کو اپنی گود میں لیے آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور وہ بوڑھا رمشا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بس یہ جملہ بول رہا تھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ یہ آخری منظر تھا جو نیلما نے اپنے دل کی دھڑکن رکنے سے پہلے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آج نیلما کا چالیسواں تھا۔ امی عورتوں میں گھری بے حد نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی بیٹی نے اتنا اچانک ان کے سامنے ٹھوس دم توڑا تھا کہ انہیں اس کی موت کا اب تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں کے سوتے رو رو کر خشک ہو چکے تھے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ بس وہ نیلما کو ہی پکارتی رہتیں۔

حسیب صاحب خود غم کی شدت سے نڈھال تھے۔ نیلما کی اچانک موت کا معاوہ کسی صورت نہیں حل کر پار ہے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کا سبب اچانک ہی ہارٹ فیئل بتایا تھا۔ ویسے سارے ڈاکٹر خود بھی اس کی اس اچانک موت پر کافی حیران تھے۔ ڈاکٹر کا ایک بورڈ اس کیس پر ڈسکس کرنے کے لیے بیٹھا بھی تھا لیکن وہ لوگ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

لیکن حسیب صاحب کو اپنی بیٹی کی وہ آنکھیں بھولتی ہی نہ تھیں جن میں علیل کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کا خوف، دہشت اور بے بسی امنڈ آتی تھی اور جب علیل پیار سے اس سے لپٹا تھا تو خوف سے کیسے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور بس چند ہی لمحوں کے بعد وہ ختم ہو گئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات تھی۔ وہ

کس بات سے اتنی خوف زدہ تھی کہ اس خوف نے اس کی جان ہی لے لی۔ وہ روتے ہوئے دل کے ساتھ بار بار یہ بات سوچتے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ علیل کو بھی کئی بار بلا کر انہوں نے کرید لیکن وہ بس معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر رہ جاتا۔

☆☆☆

اچانک انہیں دروازے پر کسی فقیر کی آواز سنائی دی جو عجیب سی آواز میں صدا لگا رہا تھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے مجھے کھانے کو دو۔“

چالیسواں کی فاتحہ کے بعد اس وقت تقریباً سب ہی مہمان جا چکے تھے۔ لیکن باورچی خانے میں کافی کھانا بچا ہوا رکھا تھا۔ انہوں نے ماسی سے کہہ کر ایک پلیٹ میں سالن اور روٹی نکلوائی اور خود پلیٹ ہاتھ میں لے کر دروازے کی جانب بڑھے تو راستے میں علیل نے اُن کو روک دیا۔

”ابو میں فقیر کو کھانا دے دوں وہ مجھے دعائیں دے گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا تم ہی دے دو۔“ وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولے اور پھر اپنی بیوی کے رونے کی آواز پر جلدی سے کمرے کی جانب بڑھ گئے کہ آج صبح سے وہ کچھ زیادہ ہی آپ سیٹ تھیں اور سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ علیل نے پلیٹ ہاتھ میں تھامی اور سامنے سے آتی رمشا کو آواز دی۔

”رمشا! آؤ میرے ساتھ وہ بھوکا ہے اور تم کو بلا رہا ہے اور پھر ہمیں بھی تو بھوک لگ رہی ہے۔“

علیل نے اپنے سرد ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں کے پتلے بالکل ساکت تھے اور ہونٹوں پر ایک خون آلود مسکراہٹ..... وہ رمشا کو لے کر مین گیٹ کی طرف بڑھا جہاں ایک عجیب الخلقت بوڑھا اس کا شدت سے منتظر تھا جبکہ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی ایک عورت گھونٹ میں منہ چھپائے بنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

پراسرار فیسر کی چشمی خاص کہانی

عرشی کون تھی؟

نادیہ ملک



چار ماہ تک ایک ملازمہ کے روپ میں وہ کس کے ساتھ رہے تھے پراسرار فیسر کی ایک بہت خاص کہانی

داخلے کے ساتھ ساتھ کینٹین کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ پہلے والے ٹھیکدار کے اسٹاف میں سے ایک ملازم سے بات ہوئی جو پچھلے دو سال سے یونیورسٹی کی کینٹین پر کام کرتا آ رہا تھا۔ اور کچھ سامان بھی پہلے والے ٹھیکدار سے خرید لیا۔ دوفریز

عرشی یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں داخلے کے لیے کئی اور یونیورسٹی کی کینٹین کا ٹنڈر بھردیا۔ نہ کینٹین کا کوئی تجربہ اور نہ ہی اس بات کا اندازہ کہ سوچ کر ٹینڈر فارم خرید لیا کہ بھائی کو ایڈجسٹ کر لوں گی۔ جو کھر پر فارغ ہی رہتا تھا۔



اور ایک ڈسپلے فریزر ابھی والوں کے پڑے تھے۔ ایک فریزر آکس کریم والے دے گئے، کینٹین میں پڑا فریج یونیورسٹی کی ملکیت تھا۔ مجھے صرف برتن اور کچھ اسٹومنٹ وغیرہ خریدنا پڑے تھے۔ ڈائریکٹر انانجھ شفیق صاحب بہت رکھ رکھا والے اور دھڑلے کے انتظام کار تھے۔ مجال ہے اسٹاف اور آل اسٹوڈنٹس ان کے اصولوں کی کوئی خلاف ورزی کرتے۔ پہلی مینگ میں انہوں نے کینٹین کے حوالے سے موٹی موٹی باتیں میری موجودگی میں بھائی سے کیں میں نے بڑی ذمہ داری سے سارا ذمہ اٹھاتے، کسی بھی شکایت کا موقع نہ دینے کا انہیں یقین دلایا۔ میں اپنے فریڈ ہیریڈ کینٹین کی نگرانی اور کینٹین کی سروس بہتر بنانے میں صرف کرتی۔ کینٹین کے معیار سے یونیورسٹی کا اسٹاف اور تمام اسٹوڈنٹس مطمئن تھے۔ ریٹ اور کھانے پینے کی چیزوں کو میں خود بخوبی تھی۔ آہستہ آہستہ کینٹین بہتری کی جانب بڑھ رہی تھی۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے دونوں چھوٹی بنیں اور والدہ بھی ہاتھ بٹانے آ جاتیں یوں ہم سب گھر والے مل جل کر کینٹین چلا رہے تھے۔ ہمارا رویہ اور خدمت ہماری پہچان بن گئی۔ تعلیم کے ساتھ رزق کی بھی آسانی ہو گئی۔ میرا معمول تھا کہ کھانے پینے کا جو سامان بچ جاتا میں کچھ گھر لے جاتی اور کچھ یونیورسٹی کے اسٹاف میں بانٹ دیتی۔ ڈائریکٹر صاحب میرے اس اقدام کو بے سارہ پکھے تھے اور بڑے اعتماد سے کہتے کہ میں ہر چیز تازہ ہوتی ہے۔ ورنہ تو آج کی پچی چیزیں کل کو بھی ہم کو کھانا پڑتی تھیں۔ میں پورے دن کا حساب کر کے دوسرے دن کے لیے سامان لینے بھائی کے ساتھ مارکیٹ جانے کے لیے کینٹین سے باہر نکل رہی تھی کہ چونکدار کو اپنی طرف آتے دیکھا جس کے ہمراہ ایک خاتون بھی تھی۔ میرے قریب آتے اُس نے مجھے سلام کیا اور اس کی جانب اشارہ کرتے بولا۔ ”یہ دودن سے میرے پاس آ رہی ہے کہ مجھے کینٹین میں کام دلاؤ۔“ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ مرہمایا ہوا چہرہ اور باسیٹ میں ڈوبی بے رونق آنکھیں۔ میں نے واپس کینٹین کے اندر آتے انہیں بیٹھے کا کہا اور مریم کو دو بوتلیں لانے کا اشارہ کیا جو والدہ صاحبہ کے ہمراہ سامان سینے میں مصروف تھی۔ میں نے اس خاتون کو مخاطب کیا۔

”اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے؟“

”جی ایک دو گھر والوں میں مکران کو میرا کام پسند نہیں آیا

اور جواب مل گیا ان کی طرف سے۔“

”کہاں رہتی ہو؟“

”قریبی گاؤں ہے میرا۔“

”شادی ہوئی؟“

”جی ہوئی تھی شوہر طلاق دے کر کسی اور عورت کو لے کر گاؤں چھوڑ گیا۔“

”کتنے بچے ہیں۔“

”جی ایک تھا جو سال کا ہو کر فوت ہو گیا۔“

”اگر تمہیں رکھ لوں تو روز گاؤں سے آیا کرو گی۔“

”نہیں اگر آپ کہیں تو آپ کے پاس ہی رہ لوں گی۔“

اس نے بڑی جھمی آواز میں جواب دیا۔

”کیا تنخواہ ملتی تھی تمہیں ان دونوں گھروں سے؟“

”پہلے والے تین ہزار اور روٹی کپڑا دوسرے والے ساڑھے تین ہزار اور کھانا وغیرہ۔“

”تو چلو ٹھیک ہے میں تجھے چار ہزار اور روٹی کپڑا رہائش فراہم کروں گی۔ ہر سہ ماہی تمہیں اپنے گاؤں جانا چاہو تو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بدستور دھیمی آواز میں رضامندی کا اظہار کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”عربی اس نے بوس خالی کر کے رکھتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اسے جاتے ہوئے گھر لے جانا آج سے گھر کا اور کینٹین کا کام کیا کرے گی۔ اور والے گھر سے میں اس کی چار پائی لگاوا دیجیے گا۔ یہ کہہ کر میں بھائی کے ساتھ مارکیٹ جانے کے لیے باہر آ گئی۔ جو باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سامان رکھوا کر ہم نے کینٹین بند کی اور یونیورسٹی سے باہر آتے ہی گھر کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

عربی برآمدے میں بیٹھی دھلے کپڑوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میرا معمول تھا کہ گھر آ کر کچھ آرام کرنی پھر اپنی بڑھائی میں لگ جاتی۔ دروازے پر دستک ہوئی میں نے کہا آ جاؤ۔ عربی تھی جو چائے کا کپ لے کر اندر آئی اور رکھ کر جانے لگی تو میں نے روک لیا۔

”جی آئی! اس نے واپس لینے پوچھا۔“

”کیسا لگا ہمارا گھر اور گھر کے لوگ؟“

”بہت اچھے ہیں سب۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”دل لگ جائے گا یہاں۔“ جواب دہارہ پناہم ورک کرنے میں لگ گئی۔

اسے میرے پاس کام کرتے تیسرا ماہ جا رہا تھا۔ اس دوران وہ دو بار اپنے گھر کی تھی۔ ”عربی ڈاکٹر شفیق صاحب کو دو کپ کوئی دے آؤ کوئی مہمان آیا ہے ان کا۔“ میں نے بھائی کو کوئی بنانے کا کہا اور دوبارہ گاؤں کی طرف متوجہ ہو گئی اسٹوڈنٹ لڑکیاں مل دینے کے لیے کھڑی تھیں۔

عربی شام کو کھانا اپنے ساتھ اوپر لے جاتی تھی۔ کینٹین پر بھی وہ ایسا ہی کرتی۔ اگر کھانے کی کوئی چیز دی جاتی تو وہ بچن کے اندر رکھ دیتی پتا نہیں وہ کب کھاتی تھی کوئی ضرورت نہیں پیش آتی ہمیں اس بات کی۔ کہ میں تصدیق کرتی اس کے کھانے پینے کی۔

سارا وقت کینٹین میں ٹھوڑا بہت رش رہتا تھا۔ مریم اور وہ کالیں روموں سے برتن اور خالی بوتلیں اکٹھی کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ جب میں اسے تنخواہ دینے کی بات کرتی تو وہ کہہ کر انکار کر دیتی کہ آپ اپنے پاس ہی جمع رکھیں جب ضرورت ہوئی لے لوں گی۔ مریم کے ساتھ وہ بڑی خوش راتی، جب ذرا فرصت ہوتی تو دونوں کینٹین سے نکل کر باہر کسی نہ کسی پلاٹ کے کونے میں جانتھیں اور ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ میں زیادہ تو اس لیے نہ جاتی کہ عربی کو میں نے اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔ وہ میری باتوں کے ساتھ بہت عزت اور محبت سے پیش آتی اور اس میں ایسی کوئی بھی عادت نہیں تھی کہ میں مریم کو اس سے دور رکھتی۔ میری والدہ صاحبہ اور بھائی بھی اس سے خوش تھے۔ وہ ہمارے گھر کا حصہ بن کر اوپر والے کمرے میں رہ رہی تھی۔ باؤکی اسے شکایت ہوئی تھی ہم سے اور نہ ہی ہمیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں تین دن کی چھٹیاں تھیں اور عربی اپنے گھر چلی گئی۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں مگر عربی واپس نہ آئی۔ مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں وہ بیمار وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔ میں نے عابد بھائی سے کہا کہ ہم چل کر اس کا پتا نہ کر آئیں۔ ایک تو اس کے گھر والوں سے ملاقات ہو جائے گی اور اس کی بھی خبر ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ عابد بھائی نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہم سنڈے کو دونوں بھائی بہن موٹر سائیکل پر اس کے

گاؤں جانے کے لیے چل پڑے۔ کوئی سوا گھنٹہ لگا ہمیں اس کے گاؤں پہنچنے میں اور پوچھتے پچھرتے ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا والد گھر کے باہر ہی مل گیا، میں نے عربی کے بارے میں پوچھا تو وہ بڑی حیرانگی سے میرا منہ کھلے لگا۔ میں نے کچھ نا سمجھے ہوئے جڑے سوال کر دیا۔

”سب خیریت تو ہے نا؟“

میرے اس طرح پوچھنے پر وہ چار پائی سے اٹھا اور ہم دونوں کو گھر کے اندر لے آیا۔ سامنے گھر کی خواتین اور دو لوگ اور بھی موجود تھے۔ اس نے اپنی ہم عمر بڑھیا کو مخاطب کیا۔ ”زبیدہ یہ تمہاری عربی سے ملنے آئے ہیں۔“

اس بزرگ کے لہجے کی رقت کو میں نے محسوس کرتے ایک بار پھر وہی سوال دہرایا کہ عربی ٹھیک ہے نا؟ اس بار عربی کی والدہ نے جواب دیا۔

”میں آپ کیسے جانتی ہیں میری عربی کو؟“

”تقریباً چار ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ میرے پاس کام کر رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

دوسری خواتین میں سے ایک اٹھ کر اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فریم تھا، جس میں عربی کی مسکرائی ہوئی بڑی سی تصویر تھی۔ ”ہاں یہی تو ہے عربی! میں نے اس کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے تائید کی۔ جب اس بزرگ کی طرف دیکھا تو وہ اپنے آنسو صاف کر رہا تھا۔

”آپ کچھ بتائیں گے؟“ میں نے زچ ہوتے ان سب کو مخاطب کیا تو عربی کی والدہ نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔

”جی عربی کو فوت ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت رہا ہے۔ اس نے زہر ہل کر گولیاں نکل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی طلاق کا دکھ تھا اور اسے شوہر کی دوسری شادی کا بھی اس لیے اس نے خودکشی کر لی تھی۔“

میں چکرا کر رہ گئی۔ عابد بھائی بھی پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تو کیا اس سارے عرصے میں ہم ایک روح کے ساتھ رہتے رہے؟“

میں نے دل میں سوچا پھر اس کے گھر والوں کے ساتھ گاؤں کے قبرستان میں آئے۔ عربی کی قبر پر اس کا نام اور تاریخ وفات اپنی آنکھوں سے پڑھتے فاتحہ خوانی کی اور اپنے پاس رکھے اس کی تنخواہ کے پیسے نکال کر اس کے والد کے سپرد دیے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔

☆☆☆



پراسرار ٹھہر کی ساتویں خاص کہانی

ہانڈی

شائستہ انور

اُس معصوم دوشیزہ کی دہشت ناک کہانی جسے کسی اور کے نام کی موت مل گئی تھی

”ڈاکٹر صاحب! میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہے اور جب.....“ زینیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر نو میر بول پڑے۔ ”اور جب..... جب آپ اسے سوچتی ہیں تو وہ سامنے ہوتا ہے۔“ ان کی مسکراہٹ واضح تھی۔ ”سوری ڈاکٹر! میں نے یہ کب کہا؟ آپ میری پوری بات سن تو لیں۔“

”پچھلے 80 منٹ سے کیا کر رہا ہوں؟“ ”اوہ پورا پورا حساب رکھتے ہیں اپنے وقت کا۔“ زینیا بھی مسکرا دی۔

”محبت کی ہے بھی آپ نے؟“ ڈاکٹر نو میر نے اچانک سے سوال کیا تو اسے لگا ”اس کی نشست کے نیچے زمین میں ارتعاش پیدا ہونے لگا ہو۔ ایک دم سے اسے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے پھوٹے محسوس ہوئے۔ نو میر نے فوراً کھٹی بجائی اور جن کی طرح قاصد آہنی دروازے سے برآمد ہوا۔

”پانی کا گلاس بدل دو ٹھنڈا لے آؤ۔“ قاصد نے پیسٹ کے آنے پر جو گلاس پیش کیا تھا وہ جوں کا توں میز پر دھرا تھا۔ وہ خاموشی سے گلاس اٹھا کر

ہوتی ہے۔ نو میر کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ بہت جلد بہت نو جوانی میں ہی اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا حالانکہ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ اتنا نہ تھا مگر ذہن اور اس کی خاص صلاحیت اس کی پچھلی حس نے بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو چٹکی بجاتے ہی حل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خان زوہیب کپاڑیہ نے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کی پراسرار خاموشی کے علاج کے لیے



رات کا جانے کون سا پہر تھا ہواؤں کی شاخیں
شاخیں نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔
درختوں پر لگے پتے جھجھکا رہے تھے۔ فضا میں
اچانک سے گھنگھروں کی آواز اس ماحول کو تھوڑی
دیر کے لیے مزید پر اسرار کرتی اور پھر ماحول کی
پراسرار گہمیرتا رات کے سینے میں اپنے نچے گاڑ
دیتی۔ کچھ ہی دیر پہلے کی تو بات تھی 'فضائیں دو محبت
کرنے والوں کی سانسوں کے جلتنگ بج رہے
تھے۔ پورے چاند کی رات تھی اور اس رات میں تو
دیوانے دل مدہوش ہو ہی جا کر تے ہیں۔
"میرے پیر چھوڑ دو پلیز....." اس نے کالی
ناگن کی زلفیں جو کہ بدست ہوا سے ادھر ادھر بکھر
کر چاند چہرے کو ڈھانپ چکی تھیں چہرے سے ہٹا
کر کہا۔

"کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہو؟" مگر جیسے وہ تو
کچھ سن ہی نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم آنسو
آ گئے۔ انسان چاہے کبھی جب کچھ نہ کر پائے تو بے
بسی سے بڑا دکھ کوئی نہیں ہوتا۔ اس سے وہ بھی اسی
کیفیت سے دوچار تھی۔ کھڑکی سے چھن چھن کر
آنے والی چاندنی سے صاف ظاہر تھا 'بادلوں کے
رتھ پر سوار پورا چاند مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
سے نکلنے والے آنسو راستہ بنا رہے تھے۔ چہرے پر
پھیلتی آن گت نمکین لکیریں سوکھی ابھری جال سا
پھیلا چکی تھیں مگر وہ بے بسی ہے اس کے سر پر ہاتھ
پھیرتی قدرت سے شکوہ کناں تھی۔

اچانک کھڑکی کا پٹ بڑی زور سے دھڑ دھڑایا
جیسے لکھت آن دھڑی نے پوری طاقت سے اس منظر
کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہو۔ اس نے دھڑ دھڑ کرتے
دل سے اسے خود سے جدا کیا اور آن کی آن میں
منظر تبدیل ہو گیا۔ بس وہ بھی اور کمرے میں کوکٹا
سناٹا۔ وہ بستر پر پڑی بری طرح یانپ رہی تھی جیسے
کہیں سے بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔
اس کیفیت نے اسے ادھ موٹی ہی تو کر دیا تھا جیسے
اور پھر آنسوؤں نے رات کے سینے میں رین بیرا
کر لیا۔ اس کا تکیہ بھیگتا چلا جا رہا تھا۔

"ہیلو بیٹا! ہاؤ آر یو سوئیٹی؟"
"فائن ڈیڈ!"
"اور بتاؤ، کیا چل رہا ہے؟"
"تھک ڈیڈ! آپ سنائیں۔"

خان زوہیب کیا ڈیہ اسے ایک عرصے بعد اس
طرح باتیں کرتا دیکھ کر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکے
تھے یعنی ڈاکٹر نو میر کا چادو چل ہی گیا۔ وہ اپنی دانست
میں سوچتے ناشتہ کرنے لگے۔ "میری بیٹی خوش ہے
اور بس کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ اسی طرح بولتی رہا
کرو۔ خاموش ہوئی ہو تو عجیب سا میل ہوتا ہے مجھے
جیسے میں تمہیں خوش نہیں رکھ پا رہا ہوں۔"
"اوہ! کم آن ڈیڈ.....! آئندہ شکایت نہیں ہوگی
آپ کو۔" زینا اتنا کہہ کر سنجیدگی سے ناشتے سے
انصاف کرنے لگی۔

"او کے سوئیٹی! Have a good day."
خان زوہیب کہا ڈیہ نے کرسی سے اٹھتے
ہوئے صوفے پر رکھا گوٹ اٹھا کر پہنا اور بریف
کیس اٹھا کر زینا کے پاس آ گئے۔
"او کے بیٹا! ٹیک کیئر۔" وہ اس کے سر پر
ہاتھ پھیرتے کارپوریٹ میں جانے کے لیے
نکلے۔ زینا ان کے پیچھے تھی وہ باپ کو دفتر روانہ
ہونے تک ان کے ساتھ رہی اور پھر جونہی کمرے
میں داخل ہوئی تو مسکرا کر رہ گئی۔ وہ اس سے پہلے
اس کی کرسی پر براجمان تھا۔ وہ اداس صورت لیے
اس کے پیروں پر لپٹ کر رونے لگا۔ زینب کی خوشی
کی انتہا نہ رہی اور وہ فوراً اسے گود میں لیے کاریں
آ گئی۔

"آئیے محترمہ! آپ بتائیے، کیا حال ہیں؟"
ڈاکٹر نو میر نے زینا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی
کہا۔ اس نے گلاسز اتارے تو نو میر کو حیرت کا
دھچکہ لگا۔

"کیا بات ہی! ایک تو آپ آئی ہیں پورے دو
ہفتے بعد اور آپ کی سوتی ہوئی آنکھیں..... کیا بات

"ہے بتائیے؟" اسے اس کوہلی سی لڑکی سے عجیب سی
الٹ 'انیت محسوس ہوئی تھی۔ ایک بے نام سا
ہنرہ اسے دیکھتے ہی بیدار ہوتا تھا جسے وہ اپنا خام
خیال جانتا تھا۔
"وہ....."

"جی بولیے، کچھ بھی اندر دل میں نہ رکھیں بول
"ہیں۔"

"وہ..... رانی کے پاس چلا گیا ہے رانی اسے
آنے نہیں دے رہی۔ وہ میرا ہے بس میرا....."
زینا یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور نو میر اس
کے بے ربط جملوں کا ربط جوڑنے لگا۔ اس کی سمجھ
میں یہ پیچیدہ لڑکی آ کے نہ دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر
اس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر بغیر کچھ کہے کمرے
سے باہر نکلے گی۔ نو میر اسے روکنا ہی نہ گیا مگر وہ نہ
رہی۔

پورن ماشی کا چاند پورے آب و تاب سے
پنک رہا تھا۔ قدیم جنگل میں جوگی گورکھ کی استھان
پہ بڑی رونق تھی۔ اس کے دو چار بھگت بڑی شان
سے آگنی پوجا میں مصروف تھے۔ گورکھ ایک مٹی کی
ہانڈی میں آلو کی آنکھیں اور پر رکھ کر اسی کے پتے
رکھ کر بیٹھا تھا اور قریب ہی اس کا بھگت شورے
اوٹ کے سینے کی سوکھی بڈی پیش کر سفوف بنا رہا
تھا اور آخر میں سور کی ناک جو کہ بڑی مشکل سے
حاصل کی گئی تھی، اس ہانڈی میں ڈالتا تھی۔ سارا
سامان مکمل تھا۔ گورکھ نے شورے کو آواز دی۔

"بالک! اسی چھو پھ ارپن کر دے با۔ سے
بیٹے جائے ہے۔ چاند کے گچھا سے نکلنے کے بعد
ہمارے آدیش میں کیول آدھا گھنٹہ رہ جاوے گا"
جلدی کر پتر.....

"مہاراج! بس آکھری جھکا دیو ہوں۔"
اور پھر شورے جلدی سے اوٹ کی ہڈی کا
سفوف لے آیا جسے گورکھ نے جاپ پڑھتے ہوئے
پوری ہانڈی میں بھرا اور پھیلا دیا اور پھر اس نے
الوکا خون ہانڈی کے کناروں پر پھیلا دیا اور پھر سور

کی ناک بیچ میں رکھی اور سہ کا کاٹنا اس ناک میں
بھونک کر اوپر سے ناشتہ بھر کر ہانڈی کے ڈھکن کو
درخت کی قدیم گوند سے جوڑ کر ہانڈی پیک کر دی۔
"اے کالی! ماتا..... اب ای سارا تھارے
واسطے اے اونی کے پاس ہمارا باگڑ بلا دل لگا بیٹھا
ہے۔ اوکالی ماتا ہم کا واپس او ہمارا باگڑ بلا دلانی
دیو اور اس کنیا کو رام رام ستے کر دیو۔" اور پھر
بھگت اور سوامی مل کر جاپ پڑھتے آگ کے اوپر
ہانڈی ٹانگے رخص کرنے لگے اور پھر دیکھتے ہی
دیکھتے ہانڈی اڑنے لگی۔

"ابھی کل ہی تو زینا میرے پاس آئی تھی۔"
ڈاکٹر نو میر کسی طرح یقین کرنے پر تیار نہ تھا
مگر اخبار کی خبر تھی نہ کرنے میں گنجائش ہی کہاں
تھی۔ "معروف صنعت کار خان زوہیب کہا ڈیہ کی
بیٹی زینا کہا ڈیہ گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی۔"
ڈاکٹر نو میر فوراً اپنی حیرت کی کھری اٹھائے
خان زوہیب کے گھر چل پڑا۔

جنگل میں آگ کی طرح یہ خبر پورے شہر کا
احاطہ کر چکی تھی۔ نو میر خان صاحب کے گھر پہنچا تو
فوراً اس نے خان صاحب سے زینا کے کمرے میں
جانے کی درخواست کی۔ خان صاحب کی حالت
ٹھیک نہ تھی مگر انہوں نے ملازمین سے ڈاکٹر
صاحب کی معاونت کی درخواست کی۔

زینا کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہ تھی۔ تب
کچھ تک سبک سے پڑا تھا۔ اچانک نو میر کی نظر
کمرے کی کھلی کھڑکی پر پڑی۔ اس نے باہر جھانک
کر دیکھا، ایک ٹوٹی ہوئی ہانڈی کے علاوہ اسے لان
میں کچھ نظر نہ آیا تھا۔

جنازہ تیار تھا مگر..... ڈولی کے پائے سے ایک
بلا چپٹا تھا جو بری طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔
وہ سفید نیلی آنکھوں والا مقناطیسی کشش رکھنے والا
بلا..... بڑی مشکل سے اسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

محبت!



ساتھیو!.....زیر نظر تصویر دیکھیے۔

آج کا زمانہ بھلے ہی جتنی بھی ترقی کر لے۔ آسمان کی بلندیوں کو چھو لے۔
آکاش کو زمین پر لے آئے..... لیکن محبت کی آغوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
والدین خدا کی نعمت ہیں تو ہمیں بھائی رب کی طرف سے عطا کردہ وہ رحمت
ہیں۔ جو اپنی محبت کے پُردوں کو چھو لے، ہمیں بھائیوں کے لیے وار کھتے ہیں۔
ہمیں بھائیوں کی محبت کی مثال..... زیر نظر تصویر میں نمایاں ہے۔ آنکھ کے
گہرے Zoom کریں اور محبت کی انتہا گہرائیوں کو اپنے دل میں
محسوس کر کے دیکھیے۔
یقیناً یقین ہے، اک قطرہ محبت آپ کی آنکھ سے ضرور باہر آئے گا۔

وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے، کوئی نہیں جانتا
مگر پورن ماشی کی رات کو قبرستان کے باہر بیٹھ کر
پوری رات اس کے رونے کی گواہی خود گورن اور
ارد گرد کے لوگ دیتے ہیں۔

دور نہیں بہت دور، گورکھ سوامی کا بھی اسی
رات دیہانت ہو گیا تھا جس شب زینیا کی موت
اس کی جیتی بانڈی کے زراثر واقع ہوئی تھی اور
وہاں بھی سفید نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا بلا
گیا تھا۔

وہ بلا سے بانگا، یہ راز، راز تو نہیں مگر یہ طے ہے
کہ زینیا سے عشق اس بلے نے ہی کیا تھا اور وہ بلا
گورکھ کی قید سے آزاد ہونے والا ایک بہت
جن تھا جو اپنی محبوبہ کی تلاش میں بلا بن کر گھوم
تھا اور گورکھ نے اسے جن سے بلا بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر نومیر کو یہ راز ایک بچے ہوئے
بزرگ نے بتایا جو کہ اچانک سے ایک دن اُس
کھینک میں آیا اور اُس کے ذہن میں اُٹھتے
سوالات کی قید سے اسے آزاد کر گیا تھا۔
☆☆.....☆☆

قبرستان میں قبر تیار ہوئی اور زینیا کو لحد میں
جیسے ہی اتارنے لگے، سفید بلے نے قبر میں چھلانگ
لگا دی۔

سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، سب
نے ہی کوشش کی کہ بلا قبر سے نکل جائے لیکن بلا قبر
میں جاتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اپنا سا اطمینان
کرنے کے بعد زینیا کو قبر میں اتار دیا گیا مگر بلا
..... وہ قبر میں ہی غائب ہوا تھا اور اسے قبر میں
جاتے سب نے دیکھا تھا مگر نکلتے؟؟.....

ڈاکٹر نومیر کا کہنا ہے کہ زینیا کی موت کے بعد
وہ کئی بار خان صاحب کے گھر گیا۔ اس نے لان
میں پڑی بانڈی اٹھوا کر سمندر میں پھینکوا دی تھی۔
بانڈی سے عجیب پسند پھوٹ رہی تھی جسے وہ آج
نہی اپنے فتنوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا جی
مالش ہونے لگتا ہے مگر ایک عجیب اتفاق ہے، زینیا
کے کمرے اور لان میں اس جگہ جہاں بانڈی ٹوٹی
پڑی تھی ایک سفید بلا نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا
بیشہ وہاں دیکھا گیا ہے۔

اقبال بانو کے چادو گر قسم سے نکلا وہ

شاہکار جولازوال ٹھہرا۔

دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل 20 ماہ شائع

ہونے والا یہ انمول ناول اقبال بانو کی پہچان بنا۔

”شیشہ گر“ وہ ناول، جس کا ہر ماہ انتظار

کیا جاتا تھا۔ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

کتاب ملنے کا پتا:

القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ اور بازار لاہور۔



ہم شکل

اشیائے راحت

جنگی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 18

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشہر کہ خاندان برہمنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ”ہم شکل“ بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برائن ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ”عالی“ کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی گرہ ایک اور ”ہم شکل“ اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ”عالی“ جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات یاد کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس

کے احسان مند ہو گئے اور شکر یہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے ساتھ ہم شکل ہوتے ہیں پس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکل کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاورا اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہول میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزار آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ ٹینک سے منسلک ہے۔ جس نے سیزار کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اسے کورونی ٹکر جاتی ہے۔ کچھ بندے اسے زبردستی اس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈیٹیل نے کورونی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

”میرا نام جو شان ہے اور میں برطانوی باشندہ ہوں۔“ اس نے کہا۔

شاہ زیب اور شورا اک اچھل پڑے، پھر شاہ زیب نے کہا ”لیکن برطانوی بھائی یہ تم روسیہ کیسے ہو گئے؟“

”میرے چہرے پر میک اپ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”دافنی کمال کامیک اپ ہے۔ لیکن کیا تم مقامی زبان بھی جانتے ہو؟“

”اچھی طرح۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ کون سی مصیبت تھی جس کی بنا پر تم برطانیہ چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے؟“

”خزانہ۔۔۔ سو نے کی چمک، ہیروں کی جگہ گاہٹ انسان سے اس کی عقل چھین لیتی ہے، ہیکال کا وہی روایتی خزانہ مجھے یہاں لے آیا ہے جس کی تلاش میں تم یہاں پہنچے ہو۔ انخاف کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا۔ صحرائے اعظم کے ان ہولناک علاقوں کا سفر کر کے یہاں آنے والے کسی چکر میں ہی آسکتے ہیں، تقریباً کوئی اتنے خطرات مول نہیں لے سکتا۔“

”چلو ٹھک ہے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ہم بھی خزانے ہی کی تلاش میں آئے ہیں، لیکن مسٹر جو شان، آپ تو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔“

”تم تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کیا کچھ کرنا پڑا اور کیا کیا قربانیاں دینا پڑی ہیں۔“

میرے ساتھ چھ افراد اور بھی تھے اور وہ چھ کے چھ ہلاک ہو گئے۔“

”اور تمہیں زندہ رہنے کے لیے یہ روسیہ ہی اختیار کرنا پڑی۔“

”ہاں۔ اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا، میں تقریباً چار سال سے ان لوگوں کے درمیان ہوں۔“

”میرے خدا، چار سال، لیکن تمہارے پاس اس کوئی کی موجودگی، کیا یہ چار سال پرانی کوئی ہے۔“ شاہ زیب نے ایک چہیتا ہوا سوال کیا وہ مسکرائے لگا پھر بولا۔

”ذہین آدمی ہو، لیکن یہ کوئی چار سال پرانی نہیں ہے، ہیکال کے اس خزانے کے سلسلے میں بہت سے

گروہ یہاں آکر ہلاکت کا شکار ہو چکے ہیں، کوئی کے لیے چار بڑے پیکٹ میں نے ایک گروہ ہی سے حاصل کیے

تھے۔ یہاں کے باشندے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، یہ ڈرائی فروٹس اور یہ تمام چیزیں بھی انہی کا

عطیہ ہیں۔“

”تو کیا یہاں باہر سے آنے والے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے؟“

”یہ ایک طویل کہانی ہے، اگر تم مجھے اس بات کا اطمینان دلا دو کہ میرے ساتھ مکمل تعاون کرو گے تو میں تمہیں

یہ کہانی سناسکتا ہوں۔“

”پیارے بھائی، اس سے پہلے جن گروہوں سے تم نے یہ کوئی وغیرہ حاصل کی تھی انہیں تم نے اپنے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا؟“ شاہ زیب نے دوسرا میٹر ہا سوال کر دیا۔ جو شان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔

”نہیں مجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ ہی کوئی ان وحشیوں کے چنگل سے نجات حاصل کر کے مجھ تک پہنچ سکا

ہے، تم پہلے دو افراد ہو جنہوں نے یہ جرأت اور ہمت کی ہے۔“

شاہ زیب نے مسکرائے لگا ہوں سے شورا کو دیکھا، لیکن شورا کا چہرہ سنا ہوا تھا، شاہ زیب سمجھ گیا کہ وہ اس

وقت کس احساس کا شکار ہے، باہر سے آنے والوں کے لیے موت کا تذکرہ سن کر اس کے ذہن میں یہ احساس جاگا

ہے کہ کہیں مسٹر گرج اور سونا را کو بھی قتل تو نہیں کر دیا گیا۔ بہر طور شاہ زیب اس داستان کو سننے کے لیے بے چین تھا

جو مسٹر جو شان سنا نا چاہتے تھے۔ چند لمحات کے بعد جو شان نے کہا۔

”دوستو! میرا تعارف ہو چکا ہے تم سے۔ کیا اب بھی اپنے بارے میں بتانا پسند نہیں کرو گے؟“

”کیوں نہیں مسٹر جو شان، میرا نام شاہ زیب ہے اور یہ۔۔۔“ شاہ زیب نے شورا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ میری دوست سونا را ہیں۔“ ان الفاظ پر شورا کے چہرے پر ایک اطمینان پھیل گیا تھا جسے شاہ

زیب محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ شورا انہیں چاہتی تھی کہ اسے شورا کی حیثیت سے

متعارف کرایا جائے۔

”تمہارا تعلق ایشیا سے ہے۔“ جو شان نے سوال کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے، تمہارے خدو خال ایشیائی ہیں اور یہ لڑکی غالباً امریکن ہے۔“

”تمہارا یہ سوچنا بھی بالکل درست ہے۔“

”دیئے اس کے چہرے میں ایک عجیب بات پائی جاتی ہے، خیر میڈم سونا را، میں آپ کو بھی خوش آمدید کہتا

ہوں، اگر آپ آرام کرنا چاہتے ہوں تو میں مداخلت نہیں کروں گا، دیئے میرا خیال ہے آپ انہی گرفتار ہونے

والوں میں سے ہیں جو ابھی حال ہی میں آخری بار ہیکال پہنچے ہیں۔“

”تمہارا کہنا بالکل درست ہے مسٹر جو شان، کیا تم اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر ہمیں یہ بتا سکتے ہو کہ

ہمارے بقیا سا بھی کہاں گئے، میری مراد ایک لڑکی اور ایک بوڑھے سا بھی سے ہے“ شاہ زیب نے کہا۔

وہ مایوس ہو کر ہونٹ کھینچ کر بولا۔

”افسوس نہیں۔۔۔ میری معلومات اب اتنی وسیع بھی نہیں ہیں۔ میں اپنے طور پر ان کے درمیان جی رہا ہوں اور

اس کے لیے مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”کاش۔۔۔ ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہو جاتا ویسے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں کو

قتل کر دیتے ہیں۔“

”اس کے پس پردہ ایک ایسے کہانی ہے۔“

”آہ ان دو پرانوں میں بھی ایسے پھرے ہوئے ہیں۔“

”ایسے کہاں نہیں ہوتے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شورا کا بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری تنہیدگی طاری تھی، ویسے بھی یہ لڑکی عام طور پر

مسکرائے کی عادی نہیں تھی اور شاہ زیب نے اسے زندگی کی دلچسپیوں سے دور پایا تھا۔

شاہ زیب کی فرمائش پر جو شان نے اپنی کہانی سنانی اس نے کہا کہ وہ ایک ہم جو ہے اور اپنے کچھ ساتھیوں کے

ساتھ ہیکال کے خزانے کی تلاش میں تھے، ان میں سے دوسرا بھی راستے کی مصیبتوں کا شکار ہو گئے، باقی صرف بائچ

افراد ہیکال تک پہنچ پائے تھے۔ ہیکال میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جو شان کے چاروں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا

افراد ہیکال تک پہنچ جائے تھے۔ ہیکال میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جوشان کے چاروں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا مگر جوشان ان کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، جوشان نے کہا۔

”میرے دوست تم نہیں جانتے کہ زندگی بچانے کے لیے مجھے کیسی ایسی اذیتوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا ہے۔“

☆☆☆

شاہ زیب کو جوشان کی گفتگو میں بڑا لطف آ رہا تھا اس نے کہا۔

”واقعی بڑی سخت جدوجہد کی آپ نے؟“

”زندگی کے لیے انسان نجائے کیسی سخت جدوجہد کرتا ہے؟“ مسٹر جوشان نے جواب دیا

”خیر پھر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں بس اس کے بعد یہاں کے بارے میں مجھے مکمل صورت حال معلوم ہونے لگی، خزانے کا علم مجھے آج تک نہیں ہوا، لیکن ہیکال کے اندر کی زندگی سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔“

”لیکن ہیکال میں تو کسی عورت کی حکمرانی تھی۔“ شوراک بول پڑی۔

”تمہاری باتیں بالکل درست ہیں ڈیزسونا میں تمہیں ایک ایسی حیرت انگیز بات بتاؤں گا کہ تم اس پر یقین نہیں کر سکو گی۔“

”حیرت انگیز باتوں کو ترتیب وار بتاتے جائیے۔ ہمیں لطف آ رہا ہے۔“ میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا اور مسٹر جوشان مکرانے لگے۔

”یہاں کی حکمران ایک عورت ہے، میسی سوناٹا ہے اس کا نام، وہ بوڑھی ہو چکی ہے، ہیکال میں بیرونی دنیا کے لوگوں سے صرف میسی سوناٹا کی وجہ سے نفرت کی جاتی ہے، دراصل بہت پہلے بھی کسی زمانے میں میسی سوناٹا کو ایک بیرونی دنیا کے

نوجوان سے محبت ہو گئی اور ان دونوں نے شادی کر لی، لیکن بیرونی دنیا کا وہ نوجوان میسی سوناٹا سے غلط نہیں تھا ان کی ایک بیٹی بھی پیدا ہو گئی اور میسی سوناٹا بہت اچھی زندگی گزارنے لگی، لیکن اس کے محبوب نے اس سے بیوفائی کی اور اپنے چند

دوستوں کے ساتھ فرار کے منصوبے بناتا رہا اور بالآخر ایک دن وہ یہاں سے اپنی بیٹی کو لے کر فرار ہو گیا، اس کے دوست اس کی بیٹی کو لے کر نکل گئے، لیکن وہ شخص گرفتار ہو گیا اور اس کے بعد ہیکال کے قانون کے مطابق سے موت کی سزا دی گئی۔“

شوراک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کرب کے آثار ابھر آئے، لیکن اس وقت مسٹر جوشان اس کی جانب متوجہ نہیں تھے۔

”پھر کیا ہوا؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”اپنے محبوب کی بیوفائی سے میسی سوناٹا نیم پاگل ہی ہو گئی اور اس کے بعد اسی طیش کے عالم میں اس نے ہیکال کا قانون بنادیا کہ باہر کی دنیا سے کوئی بھی شخص آئے اسے قتل کر دیا جائے، وہ اپنے اس قبیلے میں کسی اور لڑکی کے ساتھ ایسا

بیوفائی نہیں جاتی تھی، وہ قانون آج تک یہاں رائج ہے۔“

”لیکن میسی سوناٹا کہاں ہے، کیا وہ زندہ ہے؟“ شوراک نے پوچھا۔

”ہاں ابھی تک میسی سوناٹا ہی کی حکومت ہے، لیکن ان دنوں کچھ اور پر لطف واقعات پیش آرہے ہیں۔“

”وہ کیا؟“

”میسی سوناٹا یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی اقامت اختیار کر چکی ہے اور اب چونکہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، چنانچہ اس کی موت کے بعد کوئی نیا شخص ہی قبیلہ ہیکال کا سردار بنے گا، جبکہ میسی سوناٹا نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ

اس کی بیٹی شوراک یہاں واپس آ گئی اور اسی قبیلے پر حکومت کرے گی، اس دعوے کی بنیاد ایک بوڑھی جادوگر نے ہے بہت ہی عمر کی مالک ہے اور اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میسی سوناٹا کی بیٹی شوراک واپس آ گئی اور ہیکال پر اسی کی حکومت

ہو گی وہ کسی بھی عمر میں یہاں واپس آ جائے، لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر وہ میسی سوناٹا کی زندگی میں واپس نہ آ سکی تو پھر حکومت اس کے لیے نہیں رہے گی اور سرداری کسی اور کو منتقل کر دی جائے گی، بوڑھی جادوگر نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میسی سوناٹا کی زندگی میں ہی واپس آئے گی۔ میسی سوناٹا اس کا انتظار کر رہی ہے اگر کبھی یہاں کوئی بیرونی شخص یا قافلہ آ جاتا ہے تو اس میں شامل کسی عورت کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ مردوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ میسی سوناٹا اپنی بیٹی شوراک کی منتظر ہے اور اس کی آس میں جی رہی ہے یہ وہ عجیب و غریب کہانی میں سمجھتا ہوں ڈیزسوناٹا کہ اگر کوئی بھی میسی سوناٹا کی بیٹی کو اس کے ہالے کر دے تو میسی سوناٹا اپنے ہاتھوں سے ہیکال کا خزانہ اس شخص کو دے گی کیونکہ یہ خزانہ یہاں کے لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

”خوب بہت خوب...“ شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے مسٹر جوشان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور جو حیرت انگیز بات میں آپ کو بتا رہا ہوں مسٹر شاہ زیب اسے سن کر آپ شدت حیرت سے اچھل پڑیں گے۔“

”بتائیے میں اچھلنا چاہتا ہوں۔“ شاہ زیب نے اسی انداز میں کہا۔

”مسٹر جوشان شوراک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے “آپ کی یہ ساتھی لڑکی شوراک، میسی سوناٹا کی ہو، ہو، ہم شکل ہے۔ میسی سوناٹا یقینی طور پر عالم جوانی میں ایسی ہی رہی ہوگی، یہ حیرت انگیز شکل دیکھ کر میرے دل و دماغ پر کیا بیانی، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔“

شاہ زیب نے حیرت زدہ نگاہوں سے شوراک کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر مسٹر جوشان کو دیکھنے لگا۔

”میں نے اپنی حفاظت کے لیے یہاں بندوبست کر رکھا ہے، کئی بار اس جال میں ایسے لوگ پھنس چکے ہیں جنہوں نے یہ سوراخ تلاش کر لیے تھے لیکن میرے لیے ان کی ہلاکت ضروری ہوتی ہے تاکہ میرا راز ان غاروں سے باہر نہ چلا جائے۔“

”اوہ... گویا آپ نے یہ جال اسی لیے لگایا ہوا تھا۔“

”ہاں میں زندہ رہتا چاہتا ہوں اور میرے دل میں آج بھی یہ خواہش جاگ رہی ہے کہ ہیکال کا خزانہ مجھے مل جائے، چاہے وہ کتنی ہی مقدار میں ملے، لیکن ملنا چاہیے اور بس اس کے بعد میں اپنی دنیا میں واپس چلا جاتا گا، چنانچہ اس لیے اپنی زندگی کا تحفظ ضروری ہے اور میں اب تک آٹھ قتل کر چکا ہوں۔“

”بحان اللہ... اچھی خاصی مہارت معلوم ہوتی ہے۔“

”میں میرے دوست، سب کچھ مجھے بحالت مجبوری ہی کرنا پڑا، لیکن میں ان اقدار پسندوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی زندگی واد پر لگا کر اپنی اقدار کو چاٹتے رہتے ہیں۔“

”تو آپ کچھ اور کہہ رہے تھے؟“

”ہاں... میں نے جال میں تمہیں پھنسا ہوا دیکھا اور یقینی طور پر اپنا یہ راز باہر نہ جانے دیتا اگر تمہارے ساتھ یہ لڑکی نہ ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“

”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ یہ لڑکی میسی سوناٹا کی ہم شکل ہے اور اسی کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جاگا۔“

”منصوبہ کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیا ہم اسے شوراک کی صورت میں میسی سوناٹا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے؟“

شاہ زیب نے آنکھیں بند کر لیں، شوراک کو شوراک کی صورت میں دھوکہ دہی کے طور پر میسی سوناٹا کے سامنے پیش کرانے کے منصوبے بناتے جا رہے تھے، بہر طور یہ کافی دلچسپ بات تھی لیکن ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں شاہ زیب اہلکار کرایا تھا کہ جوشان کو حقیقت سے آگاہ کرنا غلط ہوگا ہاں اگر وہ اپنے طور پر جو کچھ کرنا چاہ رہے ہیں وہی کریں تو اس

سلطے میں ان سے تعاون کیا جاسکتا ہے، پھر شاہ زیب نے مسٹر جوشان سے کہا۔

”لیکن مسٹر جوشان، کیا میں سونا تا میری دوست سونا را کو شورا کی حیثیت سے قبول کر لے گی؟“

”اگر مس سونا را اس سلطے میں ہم سے تعاون کریں تو یقیناً ایسا ہو سکتا ہے، اس کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی جائے۔“

”کیا آپ ہمیں سوچنے کا موقع دیں گے مسٹر جوشان؟“

”تم لوگ اپنے آپ کو یہاں بالکل محفوظ تصور کرو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہاں تمہیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں پہنچ سکتا، میں تمہیں سوچنے کے لیے تمہاری ضرورت کے مطابق وقت دے سکتا ہوں۔“

”اگر آپ ایک کام اور کر سکیں مسٹر جوشان تو میں ذاتی طور پر آپ کی شکر گزار ہوں گی“ شورا نے کہا۔

”ہاں کہو، تم میرے لیے انتہائی قیمتی حیثیت رکھتی ہو۔“

”ہمارے ساتھ دو افراد اور تھے، ایک لڑکی اور ایک بزرگ، براہ کرم صرف یہ بات معلوم کر کے ہمیں بتاؤ کہ ان دونوں کا کیا ہوا، وہ کہاں ہیں؟“

”ہر چند کہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن میں تمہارے لیے اسے انجام دینے کی کوشش کروں گا، آؤ اب تمہیں ایک ایسی جگہ دکھا دوں جہاں تم آرام سے وقت گزار سکتے ہو، کھانے پینے کی بالکل فکر مت کرنا، میرے پاس ایسی اشیاء کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو تم دونوں کو پسند آئیں گی۔“ مسٹر جوشان نے کہا اور اس کے بعد وہ ان دونوں کو اٹھا کر اس عمارت سے باہر ایک اور چھوٹے سے عمارت میں لے گئے جہاں انہوں نے غالباً اپنی آسائشوں کا بندوبست کر رکھا تھا، یہاں کی زمین پر بہترین گھاس کا بستر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی پانی کا انتظام بھی تھا، مسٹر جوشان ہمیں چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ مسٹر جوشان کے اس انکشاف سے گرج کی کہانی کی بھی تصدیق ہوئی تھی، کافی دیر خاموشی میں گزر گئی اور اس کے بعد شورا نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مسٹر شاہ زیب، میں بہت زیادہ ذہین نہیں ہوں اس سلطے میں آپ کا مشورہ چاہتی ہوں، آہ کاش.. مسٹر گرج ہمارے ساتھ ہوتے اور اس وقت یہ انکشافات ہوتے تو مجھے کس قدر خوشی ہوتی، لیکن میں میں ان کے لیے بے حد پریشان اور افسردہ ہوں۔“

”میں جانتا ہوں شورا، مسٹر گرج نے تمہارے سلطے میں زبردست قربانیاں دی ہیں، ہو سکتا ہے ہمیں جوشان کے ذریعے مسٹر گرج کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں، لیکن اب اس سلطے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں، ویسے تم نے تہا مت ذہانت سے کام لیا کہ میرا نام سونا را بتایا اور اسے میری حقیقت نہیں بتائی، ویسے یہ جان کر مجھے انتہائی رنج ہوا کہ میرا باپ اس دنیا میں نہیں ہے، ویسے مسٹر گرج اسے بہت چاہتے تھے اور ان کے دل میں ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ وہ دوست کی امانت اسے واپس کر دیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں اس خزانے میں دلچسپی تھی جیسے وہ بحالت مجبوری چھوڑ چکے تھے، لیکن کاش میں اس سلطے میں ان کی کوئی مدد کر سکتی۔ البتہ میں یہ چاہتی ہوں کہ جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے اس پر جس قدر جلد ممکن ہو، عمل کیا جائے، ہو سکتا ہے میری اصل حیثیت مجھے مل جانے کے بعد مسٹر گرج اور ان کی بیٹی کی کچھ مدد کر سکیں۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں اس کے پہلو پر غور کرنا چاہیے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مسٹر جوشان ہمیں شورا کی حمایت کرنے کے لیے کیا پروگرام رکھتے ہیں، ہم ان کے پروگرام پر غور کریں گے۔“

”یقیناً.. میں نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ ساتھ کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤ۔“

”مم.. میں..“ شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیا تمہیں مسٹر جوشان کی یہ بات یاد نہیں کہ بیرونی دنیا سے آنے والے مردوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔“

”ارے باپ رے...“ شاہ زیب کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز نکلی ”واقعی میں بھی تو مرد ہی ہوں۔ اب تو مجھے اپنی زندگی کا بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔“

”اے لیے تو میں چاہتی ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے مسٹر جوشان کے پروگرام کو عملی جامہ پہنادیں، بہتر ہے، میں اس لیے خاموش ہو گئی کہ تم سے اس بارے میں مشورہ کر لوں، ورنہ شاید میں اسی وقت اس بات کا فیصلہ کر لیتی کہ میں مسٹر جوشان کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے شورا کے بننے کے لیے تیار ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، مسٹر جوشان سے دوسری ملاقات پر مکمل تعاون کا فیصلہ سنا دیں گے۔“

شورا کا خاموش ہو گئی اس کے بعد وہ مسلسل دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی رہی تھی، نجانے کتنا وقت گزر گیا، بہر طور تقدیر ان کو یہاں لے آئی تھی ورنہ اگر باہر ہوتے تو نجانے کیا ہوتا، یہ ابھی تک چٹانیں چل کر تھا کہ مسٹر گرج وہاں سے خود فرار ہوئے اپنی بیٹی کو لے کر یا پھر ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا، پھر یہ لوگ بے چینی سے مسٹر جوشان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے اور پھر بھوک لگنے لگی۔ شاہ زیب نے بے تکلفی سے باہر آ کر وہ تمام چیزیں دیکھیں جو کھانے پینے کی تھیں اور اس کے بعد کافی تیار کرنے لگا، کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بلند ہو رہی تھی کہ مسٹر جوشان کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک لمحے کے لیے تو یہ لوگ بھونچکے سے ہو گئے تھے، لیکن مسٹر جوشان کو دیکھ کر سکون ہوا مسٹر جوشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا کہ خود ہی اپنے لیے انتظامات شروع کر دیے میری طرف سے تمہیں مکمل اجازت ہے کہ یہاں جو کچھ بھی موجود ہے اسے استعمال کرو۔“

”شکر یہ مسٹر جوشان..... ہاں آپ بتائیے ان دونوں کے بارے میں کچھ بتا چلے گا؟“

”وہ دونوں وہاں سے فرار ہو گئے ہیں، یہ بات میں نے معلوم کر لی ہے۔“

”تو کیا ہو کر قاتل نہیں ہوئے؟“

”نہیں۔“ مسٹر جوشان نے جواب دیا اور پھر بولے ”دشمن انہیں تلاش کر رہے ہیں۔“

”میرے خدا، کاش وہ ان کے ہاتھ نہ آئیں۔“ شورا اک آہستہ سے بولی۔

مسٹر جوشان کافی دیر تک ان دونوں سے گفتگو کرتے رہے، انہوں نے شاہ زیب کو ہر طرح تعاون کا یقین دلایا اور بولے۔

”جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کی تکمیل تمہارے لیے بہت سودمند ثابت ہوگی، تم اطمینان رکھو۔“ شاہ زیب نے انہوں سے ملا دی تھی،

پھر مسٹر جوشان بھی ان دونوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے ٹھونڈ لیتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، بہر حال ان لوازمات سے فارغ ہونے کے بعد وہ تینوں اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں آ گئے۔ مسٹر جوشان ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

”یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم لوگ میری تجویز سے متفق ہو مجھے بہت خوشی ہوئی ہے، میں بلند و بالا گئے تو نہیں کرتا البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہماری تجویز پر مکمل طور سے کامیاب ہو گئی تو ہم بہترین خزانہ لے کر یہاں سے فرار ہو جائیں گے، یہی سونا تا اپنی بیٹی کے لیے بہت ہی مضرب ہے، بوڑھی جادوگر نے ساریہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور ساریہ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ جب میں سونا تا بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو جائے گی تو شیکال کی سربراہی کے لیے اس کی بیٹی شورا کا خود بخود وہاں پہنچ جائے گی، بوڑھی نے اپنے اس دعوے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے اور ایک خانقاہ میں رہتی ہے اس نے اپنے اور تمام آسائشیں حرام کر لی ہیں اور اسی طرح عبادت کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ اس کی یہ عبادت رنگ لائے گی اور یونانی کسی نہ کسی طرح شورا کو اس خانقاہ میں بھیج دیں گے، تب وہ شورا کو کسی سونا تا کے سامنے پیش کرے گی، اس کے اس دعوے کا ابتداء میں بہت مذاق اڑایا گیا، لیکن اسے میں سونا تا کی حمایت حاصل ہے اور میں سونا تا اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہے، چنانچہ یوں ہوگا کہ سونا را کے میں تم اور ہمارا دوست شہزاد وہاں چلیں گے، ہم چالاکی سے تمہیں اس خانقاہ میں پہنچا دیں گے اور اس کے بعد تمہیں اداکاری کرنا ہوگی، تم اپنے آپ کو شورا کا خاہر کر دو گی

اور بوڑھی کو یقین دلادو گی کہ تم واپس آگئی ہو اس کے بعد ظاہر ہے بوڑھی تمہیں میسی سونا تاکہ سامنے پیش کرے گی، تمہیں اس طرح کا اظہار کرتا ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہاری بہترین اداکاری ہی ہماری زندگیوں کی ضمانت بن سکتی ہے، اس دوران ہم خافہ سے زیادہ دو رنکس رہیں گے اور جب تم میسی سونا تاکہ پر اپنا اعتماد قائم کر لو تو پھر ہمیں طلب کر کے ہماری سفارش کرنا اس طرح ہمیں خزانہ حاصل ہو جائے گا۔ پھر وہ راستے میں جانتا ہوں جہاں سے ہم واپس اپنی دنیا میں جاسکتے ہیں اس کا تمام بندوبست کر لوں گا یہ ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو۔

شوراک نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہم اپنی منزل کی جانب کب روانہ ہوں گے؟“
”کل رات کو، مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت اور دے دیا جائے، اس دوران میں وہ تمام تیاریاں کر لوں گا جس کے تحت ہم آسان راستوں سے پہاڑوں کے دوسری جانب جاسکتے ہیں۔“
شوراک نے گردن ہلا دی کافی دیر تک مسٹر جوشان ان سے گفتگو کرتے رہے اور پھر واپس چلے گئے، ان کے جانے کے بعد شوراک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے مسٹر شاہ زیب کیا بوڑھی ساریہ کی پیشگوئی غلط ثابت ہوئی؟“
”میں سخت حیران ہوں، بلکہ اس وقت میں اسی انداز میں سوچ رہا تھا طریقہ کار کچھ بھی ہو جادو گرئی کی پیشگوئی تو بالکل درست رہی۔“

”ہاں میں بہت چھوٹی سی عمر میں اپنے اس قبیلے سے نکل گئی تھی، لیکن میرے بزرگ میرے محترم میرے محسن اور میرے سب کچھ مسٹر گرج نے مجھے اپنے قبیلے کے رسم و رواج اور وہاں کی روایتوں سے لاعلم نہیں رکھا مجھے بہت ہی اطمینان کے ساتھ افریقی زبان سکھائی گئی تاکہ جب میں اپنے قبیلے میں پہنچوں تو کسی کے لیے اجنبی نہ رہوں۔“
شاہ زیب گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ بلاشبہ اس سلسلے میں مسٹر گرج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، عجیب و غریب انسان تھے اگر ان کے دل میں صرف خزانے کے حصول کی خواہش ہی تو انہوں نے اتنا طویل عرصہ انتظار کیوں کی، اگر اپنے دوست کی محبت ان کے دل میں تھی تب بھی اس کے لیے انہیں مضطرب ہونا چاہیے تھا، نجانے کوئی قوت انہیں آج تک اس کام کے لیے مجبور کرتی رہی تھی۔ شاید یہ بوڑھی جادو گرئی کی پیشگوئی ہی کا کوئی جادوئی اثر ہو۔ شاہ زیب یہی باتیں سوچتا رہا تھا۔

وہ لوگ یہاں وقت گزارتے رہے یہاں کوئی دقت نہیں تھی، ویسے بیرونی طور پر ہوشیار رہنا پڑا تھا۔ خاص طور سے ان اوقات میں جب مسٹر جوشان یہاں موجود نہیں ہوتے تھے۔ پھر وہ وقت آگیا جب مسٹر جوشان شاہ زیب اور شوراک کے پاس پہنچ گئے، وہ اپنے ساتھ بہت سا ساز و سامان لائے تھے۔

انہوں نے کئی جڑی بوٹیوں سے وہی مخلول تیار کیا تھا جس نے انہیں روسیہ کر دیا تھا اور اب وہ خصوصاً شاہ زیب کو اپنے جیسا بنانے پر تلتے ہوئے تھے، اس کا اظہار انہوں نے کیا تو شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مسٹر جوشان، اپنے بارے میں آپ کو بتا دوں تو آپ ان معاملات کو بھول کر مجھ پر ریسرچ کرنے بیٹھ جائیں گے، مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ میں زندگی کے نجانے کون کون سے مرحلوں سے گزر چکا ہوں اب اگر یہ روسیہ ہی بھی مقدر میں ہے تو آپ یہ سیاهی بخوشی میرے وجود پر قبول دیجئے۔“

”مسٹر شہزاد یہ بے حد ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر تم دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر سن نہیں کر سکو گے، کہیں بھی اپنی اصل حیثیت سے ان لوگوں کی نگاہوں میں آگئے تو تو تمہارا حشر بھی ان بیرونی افراد سے مختلف نہیں ہوگا جو بے کسی کی موت مر چکے ہیں۔“

شاہ زیب نے گہرا کر جلدی سے اپنا لباس اتار دیا تاکہ مسٹر جوشان اس پر طبع آزمائی شروع کر سکیں اور درحقیقت لطف ہی آگیا تھا، ایک بڑے برش نما جمال سے شاہ زیب کے جسم پر سیاهی رنگی یہ براؤن مائل سیاهی تھی جو مقامی لوگوں کے رنگ سے مطابقت رکھتی تھی اور بلاشبہ اس کا اثر اتنا کچا تھا کہ آدمی تصور بھی نہ کر سکے، البتہ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے

مسٹر جوشان سے کہا۔

”کیا میری روسیہ اب بھی دودھ بھی ہو سکے گی؟“

مسٹر جوشان مسکرا دیے پھر بولے ”ہاں کیوں نہیں اس کا تو ذمہ بھی موجود ہے، لیکن عام انداز میں یہ سیاهی نہیں اتر سکے گی۔“

شاہ زیب نے گردن ہلا دی تھی۔ مسٹر جوشان اپنی ہمارتہ کاروائیوں میں مصروف رہے اور شاہ زیب کے نقش و نگار بھی بدل ہو گئے۔ پھر انہوں نے کسی جانور کی ٹھونڈی کی آٹھ ہڈیوں کی مالک شاہ زیب کے گلے میں ڈال دی۔

”یہ کیا۔“ شاہ زیب نے اچھٹے ہوئے کہا۔

”چپ چاپ رہیے جناب وحشی صاحب۔“ جوشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر اگلے سیدھے موتی، پتوں کا ایک تاج سنا کر شاہ زیب کے سر پر سجایا گیا اور ایک جانور کی کھال بدن کے اوپر سے پر منڈھ دی گئی، گویا یہ شاہ زیب کا بناؤ سنگھار ہو چکا تھا، شاہ زیب نے شوراک کی طرف دیکھا وہ ٹھنڈی نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی شاہ زیب سے اس کی نگاہیں ملیں وہ بے اختیار مسکرا دی، تب شاہ زیب نے جوشان سے کہا۔

”ایک بات تو بتائیے مسٹر جوشان، کیا مقامی خواتین یہ رنگ و روپ نہیں رکھتی، آخر مردوں پر ہی کیا قیامت ٹوٹی ہے، کیا میڈم سونا راکے لیے کوئی میک اپ ضروری نہیں ہے؟“

”ایک دلچسپ سوال ہے جس کا جواب کچھ یوں ہے، اتفاق سے کہ یہاں جتنی حکمران خواتین رہیں ان کا تعلق کسی کسی بیرونی مرد سے ضرور رہا اور اس کے بعد جوان کی اولاد پیدا ہوئی وہ مخلوط شکل رکھتی تھی۔ موجودہ میسی سونا تاکہ سے پہلے کی عورت کے بارے میں تو میں نہیں جانتا لیکن میسی سونا تاکہ یہاں کی تمام خواتین سے مختلف ہے، بس یوں سمجھ لو کہ میڈم سونا راکہ کا لباس اسی طرح یہاں کی دوسری لڑکی جو حکمران بنے گی انہی کی شکل و صورت سے مطابقت رکھتی ہوگی، اس کا بار بار تذکرہ ہی آیا ہے اور سنا گیا ہے کہ میسی سونا تاکہ کی بیٹی اپنی ماں کی ہم شکل ہے۔“

”خوب۔۔۔“ شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے شوراک کی طرف دیکھا اور وہ جھینپ گئی، وہ شاہ زیب کی مسکراہٹ کا طلب سمجھتی تھی، تاہم شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”اگر اتفاق سے میڈم سونا راکہ کو یہیں رہنا پڑے تو پھر آنے والی نسلوں کی حکمران بھی کوئی متاثرہ شخصیت نہیں ہوگی۔“
شوراک خاموش رہی تھی، بہر طور مسٹر جوشان فارغ ہو گئے اور اب شاہ زیب ایک اعلیٰ پائے کا وحشی لگ رہا تھا۔

مسٹر جوشان نے ایک نیزہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”اب کم از کم اس خطے کا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم مقامی آدمی نہیں ہو۔“

”لیکن مقامی زبان۔۔۔“

”اودہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اشاروں کی زبان ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور پھر اس نسل میں بھی گو گلے لوگوں کا وجود ہے۔“

”میری میرے لیے مناسب ہوگا۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”اور اب مس سونا راکہ براہ کرم آپ لباس تبدیل کر لیجئے، ہر چند کہ آپ کو یہ لباس عجیب محسوس ہوگا لیکن آپ اسے پہوری تصور کریں۔“

لباس دیکھنے کے قابل تھا، عجیب قسم کے جانوروں کے بالوں یا شاید کسی اور چیز سے یہ لباس بنایا گیا تھا، بس تھوڑا سا

حصہ اوپری بدن کے لیے تھا باقی جسم پتوں سے چھپایا گیا تھا۔

”اس طرح آپ کو ہمارے ساتھ سفر کرنے میں آسانی ہوگی، ویسے جب آپ کو شوراک کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا تو اس وقت آپ کے جسم پر دوسری قسم کا لباس ہوگا اس کا بندوبست بھی میں نے کر لیا ہے۔“

”ہمیں روانہ کب ہوتا ہے؟“

”اب سے تھوڑی دیر کے بعد۔“ مسٹر جوشان نے کہا۔

اس کے بعد مسٹر جوشان نے کھانے پینے کی چند چیزیں اپنے پاس محفوظ کیں، نہایت اعلیٰ قسم کی کافی پی گئی اور اس بعد ان آسانوں کو خیر باد کہہ دیا گیا جنہوں نے یہ بھلا دیا تھا کہ یہ لوگ صحرائے اعظم کے ایک انتہائی غیر مہذب حصے میں ہیں، پھر یہ لوگ غاروں ہی کے ذریعے باہر نکل آئے۔ درحقیقت مسٹر جوشان کی زندگی اسی لیے محفوظ تھی کہ انہوں نے یہاں بے شمار سنگس اور غاروں یافت کر لیے تھے۔ ایک طویل ترین سرنگ میں انہیں تقریباً پینتالیس منٹ چلنا پڑا اور اس کے بعد وہ لوگ اس کے دہانے سے باہر نکل آئے۔ پہاڑیوں کا سلسلہ تاحہ نگاہ پھیلا ہوا تھا اور ان لوگوں کو اسی سلسلے درمیان سفر کرنا تھا۔ مسٹر جوشان نے بتایا کہ اس طرح یہ لوگ بستی سے کافی دور نکل آئے ہیں۔

شاہ زیب نے شورا کے چہرے پر جذبات کے سائے لرزے دیکھے تھے، نجانے کتنی طویل زندگی کے بعد وہ اپنی ماں کے حضور جارہی تھی، یہ بات تو جوشان کے فرشتوں کے علم میں بھی نہیں تھی کہ جس لڑکی کو وہ مصنوعی شورا کی حیثیت سے لے جا رہا ہے وہ اصل میں بھی وہی لڑکی ہے جس حیثیت سے وہ اسے پیش کرنا چاہتا ہے، اب پیش کار کا مسئلہ تھا کہ پیشکاری کس طرح ہوتی ہے اور مسٹر جوشان اپنی مرضی کے مطابق کامیاب ہو بھی پاتے ہیں یا نہیں۔

سفر جاری رہا، پہاڑوں سے گزرنے کے بعد یہ لوگ جنگلوں میں داخل ہو گئے۔ خوش قسمتی تھی کہ راستے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے ہمیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا اور اس کے بعد جب یہ لوگ ایک بلندی سے ڈھلان میں اترے تو شاہ زیب اور شورا کے ڈھلان کے انتہائی سرے پر ایک بستی آباد دیکھی۔ اسے کوئی بستی کہنا تو حماقت تھی۔ یہ ایک وسیع و عریض شہر تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اور کئی کئی منزلہ عمارتوں پر مشتمل نہیں تھا، ہاں یہاں جی ٹی اور پہاڑی پتھروں سے مکانات ضرور بنائے گئے تھے، لیکن ان مکانات کی تعداد اگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، زیادہ تر گنبد نما چھوٹے تھے جو عجیب و غریب نظارے پیش کر رہے تھے اور ان چھوٹوں کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ایک بہتر بڑا کٹاؤ تھا جس میں یہ بستی بھیلی ہوئی تھی، طرف میں ڈھلان اور ناقابل عبور پہاڑ تھے یعنی طور پر بستی سے باہر جانے کے لیے جو راستے بنائے گئے ہوں گے انہیں انہی پہاڑوں کو کاٹ کر ترتیب دیا گیا ہوگا۔

جی ٹی اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارتوں کے بارے میں مسٹر جوشان نے بتایا کہ یہ شیکاگل کے ان معزز لوگوں کی رہائش گاہیں ہیں جو کسی نہ کسی طور حکومت میں دخل رکھتے ہیں، پھر انہوں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اور وہ جو ایک سفیدی جگہ نظر آرہی ہے وہ خانقاہ ہے جہاں بوڑھی جادوگرنی ساری رہتی ہے اور ہمیں اس خانقاہ تک پہنچنا ہے۔“

”کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم اسی جگہ سے ڈھلان عبور کرتے جہاں خانقاہ موجود ہے۔؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”نہیں ان ڈھلاؤں سے اترتے ہوئے ہمیں دیکھا بھی جاسکتا ہے۔“

”ہم یہاں اس غار میں پوشیدہ ہو جائیں گے جو چند گز کے فاصلے پر نظر آرہا ہے اور پھر رات کی تاریکیاں پھیلنے کے بعد اپنا بقعہ سفر طے کریں گے، ویسے جب جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو وہ ایسی نہیں تھی جہاں سے نیچے اتر جاسکے۔ نیچے اترنے کے لیے یہی جگہ مناسب ہے اور تم خود دیکھ لو کہ اس خانقاہ کے اوپر جو بھیلی ہوئی پہاڑی ہے وہاں ایسی جگہ نہیں ہے کہ ہم وہاں پاؤں جما کر نیچے اتر سکیں۔ اس جگہ سے اترنا زندگی کا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا، چنانچہ میں نے یہ جگہ منتخب کی ہے۔“

”یوں لگتا ہے مسٹر جوشان جیسے آپ پہلے ہی یہاں آچکے ہوں۔“

”ہاں شیکاگل کے سارے اطراف میں دیکھ چکا ہوں اور اس کی وجہ بہتر جانتے ہو۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“

”خزانے کی تلاش میں نے ہر وہ جگہ دیکھ ڈالی ہے جہاں خزانہ موجود ہونے کے امکانات تھے۔“

جوشان کی بات پر شورا کے اور شاہ زیب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے، بہر حال ڈھلان میں تھوڑا سا اترنے کے بعد ان اس پہاڑی کٹاؤ میں جا چکے جو ان کو دوسروں کو نگاہوں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے بستی میں ہونے والی آوازاں دیکھی جاسکتی تھیں۔ ایک باقاعدہ دنیا آباد تھی، ایک باقاعدہ زندگی تھی، چھوٹوں کی ترتیب قطاروں میں تھی اور بڑوں کی زندگی میں ایک ترتیب ہے، لیکن وہ ابتدائی حصہ وہاں بے ترتیبی کی تھی، غالباً اسے اس لیے چھوڑ دیا گیا ہوگا کہ اس چروٹی لوگ پہنچ جاتے تھے اور ان سے سننے اور انہیں روکنے کے لیے وہاں بے ترتیبی ہی مناسب تھی۔

وقت گزرتا رہا اور پھر شام کے سائے بستی میں اتر آئے، بستی میں جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے اور رات کی تاریکی میں وہ بستی عجیب لگنے لگی، ناقوسوں کی آوازیں آرہی تھیں، گویا یہاں عبادت بھی کی جاتی تھی، یہ لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد جوشان کے اشارے پر اپنی جگہ سے نکل آئے، اب ان کا رخ اس خانقاہ کی جانب تھا جو دور سے اب بھی سفید نظر آرہی تھی، غالباً سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی، پتا نہیں یہاں اور بھی لوگ موجود تھے یا نہیں، دور سے چھوٹی نظر آنے والی خانقاہ اندر والی وسیع تھی اور یہاں سے نیچے جانے کے لیے پتھروں میں سڑھیاں تراشی تھیں جو نیچے گہرائیوں تک لے جاتی تھیں۔ ان لوگوں کی نگاہوں میں بوڑھی جادوگرنی کی بجائے کیا حیثیت تھی، بہر طور ایک ایک قدم سنسنی خیزی کا حامل تھا، سونا ریا شورا کے ہاتھ کی کاسے بوڑھی کے سامنے جا کر کیا کرتا ہے، اور اس وقت ظاہر ہے شاہ زیب اور جوشان اس کے ساتھ نہ ہوں گے، لیکن بات سے جوشان واقف نہیں تھا کہ شورا کے وہاں جا کر کیا کرے گی؟

یہ لوگ خانقاہ کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو گئے، بہت سکوت چھایا ہوا تھا وہاں، اندر ایک عجیب سی پوچھلی ہوئی تھی، اس نے ہی ایک لمبی آگ کی تکیہ نظر آرہی تھی جس میں سرخ سرخ انگارے دھک رہے تھے اور انگاروں کے عقب میں ایک سی جادو نظر آرہا تھا، یہی بوڑھی جادوگرنی ساری تھی، اس کے سامنے کوئی سفیدی چیز رکھی ہوئی تھی جو قیمتی طور پر لوہان کی تھی، وقفے وقفے سے وہ آگ میں یہ تمام چیزیں ڈالتی جارہی تھی اور آگ سے ہلکا ہلکا دھواں خارج ہو رہا تھا اور یہ بوڑھی اس دھواں کی تھی جو بالکل ناگوار نہیں تھی، غالباً کوئی خاص قسم کی پسلی ہوئی شے تھی جس سے یہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شورا کے شاہ زیب کی جانب دیکھا پھر جوشان کو دیکھنے لگی اور پھر آہستہ سے بولی۔

”خبر ان خیال ہے آپ لوگوں کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“

”مطمئن نہیں، ہم وہاں جانا بھی نہیں چاہتے، دیکھو ہم اس جگہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں یہاں سے ہم وہ سب کچھ بھی دیکھ سکتے ہیں جو تم کوئی اور اس کے بعد تنہا رہی معاونت بھی کرتے رہیں گے۔“

جوشان نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی یہاں سے دور نہیں تھی اور جوشان اور شاہ زیب نہ صرف یہاں سے شورا کی کاروائی دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کی آواز بھی سن سکتے تھے اور یہ جگہ محفوظ بھی تھی چنانچہ دونوں اس جگہ پوشیدہ ہو گئے۔ شورا کے دیے قدموں چلتی ہوئی آگ کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، یہاں داخل ہونے سے پہلے اس نے وہ لباس بھی اٹھایا تھا جسے جوشان اپنے ساتھ لایا تھا کیونکہ اسی لباس میں شورا کو بوڑھی جادوگرنی کے سامنے پیش ہونا تھا اور بلاشبہ اس وقت آگ کے پس منظر میں کھڑی ہوئی شورا کو کوئی آسانی دیوی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب نے اس کے پیچھے پر ایک عجیب سی ٹھکنٹ ایک عجیب سا دھواں دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس بات کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ شورا کے حامی لڑکیوں سے مختلف ہے۔ بہر حال ان دونوں کی نگاہیں شورا کی ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دھواں بوڑھی ساری نے اپنی خوشبو آگ میں ڈالی اور اس بار بلند ہونے والا دھواں بہت زیادہ تھا، اس کے ساتھ ہی ساری نے اپنے سامنے ہونے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بجانے شروع کر دیے۔ وہ بڑی دیوانگی کی کیفیت میں پتھروں کے یہ ٹکڑے بجا رہی تھی اور اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلی رہی تھیں، شاہ زیب نے ان آوازوں کو سنا تو اسکی لیکن سمجھ لایا جبکہ جوشان کے انداز میں ایک عجیب سی حیرت پیدا ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں اس سے اس حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولا۔

”جانتے ہو بوڑھی ساریہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”جانتا تو تم سے پوچھتا“ شاہ زیب نے کہا۔

”وہ کہہ رہی ہے اے مقدس خوشبو... اے جلتی ہوئی آگ، اے چمکتے ہوئے تارو۔ اے جگمگا ہوئے چاند اے پتھر... مجھے بتاؤ... میرا خواب پورا ہوگا یا نہیں جو کچھ میں نے کہا وہ ممکن ہے یا نہیں، ہاں یہ میرے آخری لمحات ہیں میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہوں، اگر مقدس ملکہ کو میں اپنے دعوے کی تصدیق پیش نہ کر سکی بدنام ہو جاؤں گی میرا جادو کا تارہ تار ادا جائے گا اور مجھے جھوٹا کہا جائے گا، میں جانتی ہوں کہ میرا بیچ ثابت کر دو، مقدس ہواؤ... میرا بیچ ثابت کر دو، میں جھوٹی مرنا نہیں چاہتی، اسے میرے سامنے بھیج دو، مجھے حکم دے مقدس ہواؤ کہ میں اسے کہاں تلاش کروں، آہ یہ لمحات میرے لیے بے حد قیمتی ہیں، اگر میں اسے پاگئی تو زندگی پاؤں کی ورنہ مرنے کے بعد بھی میرا روح ان چٹانوں میں پھنسی پھرے گی۔“

شاہ زیب کو یہ الفاظ بے حد عجیب محسوس ہوئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ بوڑھی اس لمحے خاص طور سے اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ شورا اک اس کے سامنے آجائے گی، بوڑھی نے ایک بار پھر سامنے رکھا خوشبودان اٹھالیا اور اس میں خوشبودان گول پر ڈالے لگی، تب ہی شورا اک کے منہ سے ایک آواز نکلی وہ مدہم لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور یہ زبان قیمتی طور پر مقامی تھی، اس بار بھی جوشان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھر رہے تھے۔

”ارے ارے یہ لڑکی یہ زبان جانتی ہے۔؟“

شاہ زیب جواب دینے بغیر ادھ دیکھتا رہا، جیسے ہی شورا اک کے منہ سے الفاظ نکلے، بوڑھی ساریہ دیوانہ وار کھڑی ہو گئی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور دھکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیئے، اس کے چہرے سے مسرت چھوٹ رہی تھی، تب ہی شورا اک نے تیزی سے آگے بڑھ کر بوڑھی جادو کرنی کے دونوں ہاتھ انگاروں سے ہٹا لیے اور بوڑھی کے حلق سے ایک دلدروازہ نکل گئی، وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کے پوچھنے پر جوشان نے اسے بتایا۔

”آہ آگئی تو ہواؤں کی بیٹی تو آگئی، ملکہ زادی مجھے یقین تھا تو آئے گی، آہ وقت نے مجھے سچا ثابت کر دیا، ساریہ کے لیے اس سے حسین موقع زندگی میں نہیں آیا تو آگئی میری بچی، تو نے میری لاج رکھ لی“ اس نے آگے بڑھ کر شورا اک کے سینے سے لگا لیا۔ شورا اک اس کے جلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی بوڑھی نے پھر کچھ کہا اور جوشان نے شاہ زیب کو اپنی زبان میں بتایا

”آہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے جا رہی تھی، میں سوچ رہی تھی کہ جھوٹی ہونے کے بجائے میرا امر جانا بہتر ہے، یہ زخم کچھ نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، تو آگئی مجھے زندگی کی ساری خوشیاں مل گئیں، لوگو ہیکال کے لوگو... تمہاری ملکہ تمہارے درمیان آگئی، ساریہ بیچ بولتی ہے اور تم یہی کہنا کہ ساریہ بچی تھی، میرا سارا جادو اسی وقت کے لیے تھا، آ میری بچی میں اعلان کرادوں میں بتا دوں کہ مقدس ملکہ ہمارے درمیان آگئی ہے، ہیکال کے سونے والو، آج کی رات سونے کی نہیں جانے کی رات ہے۔ جشن منانے کی رات ہے۔“

بوڑھی ساریہ دیوانہ وار اچھل رہی تھی، اس کے کمزور بدن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی وہ شورا اک کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جانب بھاگی۔ جوشان اور شاہ زیب نے اندازہ نہیں لگایا تھے کہ وہ اسے کہاں لیے جا رہی ہے وہ یہ باہر جانے کر راستہ نہیں تھا بلکہ کچھ بلندی کچھ سیرھیاں سی تھیں جسے عبور کرنے کے بعد وہ کسی مخصوص جگہ پہنچ گئی، یہاں سے یہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، جوشان نے شاہ زیب کا بازو دھاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری دوست نے تو کمال ہی کر دیا، وہ اس سے افریقی زبان میں بات کر رہی تھی، میں اس کے الفاظ تو نہیں سن سکا، لیکن بوڑھی کا اندازہ یہی بتاتا تھا جیسے اس نے شورا اک کی آمد کا اعلان سنا ہو۔“

شاہ زیب نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی، البتہ اب یہ لوگ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے یہ لوگ اس تمام صورت حال کا نظارہ کر سکیں۔ بہر حال یہ لوگ بھی سیرھیاں چڑھنے لگے، سیرھیاں بلندی تک گئی تھیں، لیکن ایک راستہ

انسان سے کشتا تھا اور وہ ایک چٹان پر جا کر ختم ہوتا تھا، ابھی یہ لوگ چٹان تک نہیں پہنچے تھے کہ بوڑھی ساریہ کی آواز گئی، جبکہ جوشان شاہ زیب کا مترجم بنا ہوا تھا، بوڑھی کہہ رہی تھی۔

”ہیکال کے سونے والو، سور ہے ہو، سونا بہتر نہیں ہے جا کو کہ جا گئے والی رات آگئی، آو اس خانقاہ کی طرف اور دیکھو اس کے بیچ کی تصدیق کرو اور سنو تمہاری دیوی تمہارے درمیان آگئی ہے، دیکھو میں تمہارے سامنے اپنا بیچ پیش کر رہی ہوں۔“

اس کی کمزور آواز اس قدر نہیں تھی کہ ہستی تک پہنچ جاتی، چنانچہ اس نے کچھ اور کاروائی کی اور چند ہی لمحات کے بعد ایک ہیکال کی آواز فضا میں گونجنے لگی، یہ زنگیہ کی آواز تھی، غالباً کسی بہت بڑے زنگیہ کو بھونکا جا رہا تھا اور اس آواز کے اثرات ہستی والوں پر فوراً ہی ظاہر ہو گئے، ہستی کے زیادہ تر لوگ سوچتے تھے روٹھنا کچھ گئی تھیں، لیکن زنگیہ کی مسلسل گونجنے والی آواز سے لوگ جا گئے تھے اور ہر گھر میں روشنی ہوئی جا رہی تھی، لوگ اس زنگیہ کی آواز کو کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے، پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو جھوپڑوں سے نکلنے ہوئے دیکھا گیا، وہ ہنڈی دل کی طرح اپنے اپنے جھوپڑوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے چمکیوں کی طرح کر رہے تھے، بہر طور یہ لوگ سکتے کی سی کیفیت میں جائزہ لیتے رہے، جوشان بھی بالکل خاموش اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا، جہاں تک نگاہیں کام کر رہی تھیں وہاں تک انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے، پھر یہ مشعلیں تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئیں اور جوشان نے شاہ زیب سے کہا۔

”بہتر ہے کہ تھوڑی سی آڑ میں ہو جاؤ، اس وقت سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم سے تھوڑی بلندی پر سونا راہی کے ساتھ موجود ہے۔“

شاہ زیب نے جوشان کی ہدایت پر عمل کیا آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی تیز رفتاری سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

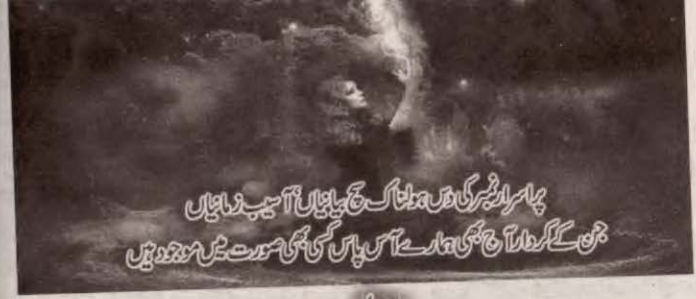
”ہو سکتا ہے ان آنے والوں میں بھی سونا نا بھی شامل ہو۔“

شاہ زیب اور جوشان ان لوگوں کو دیکھتے رہے، چھ گھوڑے سوار تھے ساتواں سوار ان سے کسی قدر آگے گھوڑے پر سرفراہ تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس راستے پر آ گئے جہاں سے خانقاہ کی دریاں آتی تھیں اور پھر شعلوں کی روشنی میں اس قدر اور غور کو دیکھا گیا جو گھوڑے سے اکثر سیرھیاں کی جانب بڑھ گئی تھیں، بقیہ سیرھیاں اس کے عقب میں چلے آ رہے تھے، یہ عورت میسی سوناٹا کے علاوہ پھیلا اور کون ہو سکتی تھی، رات کی تاریکی میں اس کے خدوخال تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی اور وہ تیزی سے خانقاہ کی دریاں عبور کرتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔

اور یہ بوڑھی ساریہ تھی۔ ”ہیکال کی ملکہ دیکھ ساریہ نے تیری عزت رکھ لی، دیکھ ساریہ نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا، دیکھ اس کے بیچ کی تصویر تیرے سامنے ہے، ساریہ جھوٹ نہیں بولتی، ہیکال کی ملکہ مقدس دیوی تیرے سامنے آگئی، تیری بیٹی میرے پاس موجود ہے، اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر۔“ اور اس کے بعد وہ غالباً اس راستے سے نیچے اترنے لگی جس سے چڑھ کر وہ اوپر پہنچتی تھی۔

شاہ زیب اور جوشان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پھر اس جگہ پہنچ جاتے جہاں سے ان واقعات کا نظارہ اور تجربہ کیا جاسکتا، تاہم انہوں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے کلدی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ تو نظر آئے۔ پھر میسی سوناٹا سیرھیاں عبور کر کے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ چہرے کا کردار وقار اور حکمت بالکل جوانوں جیسی تھی اور انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کی ملکہ ہے۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے شاہ زیب کی آخری منزل کیا ہوگی.....؟ جاننے کے لیے آخری قسط کا انتظار کیجیے)



ہمارے شہر کی فسادات کا عجیب و غریب
جن کے گھر آج بھی ہمارے پاس گئی صورت میں موجود ہیں

سرخ لکھنؤ

محمد یوسف لغاری



اس نوجوان نے چادوئے کو کھیل بھر کر ایک ایسی غلطی کر ڈالی جس کا غیازہ اسے تا عمر بھگتنا پڑا

پہلیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلکے اور کاغذ ایک طرف ساتھ پڑے ڈبے میں ڈالے اور بیچ سے اٹھ کر چھل قدمی شروع کر دی۔ ابھی میں چل پھر ہی رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز مجھے اپنے عقب سے سنائی دی۔ ”اسلام علیکم!!“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک نقاب پوش لڑکی نے مجھے پکارا تھا۔ ”جی جی علیکم السلام!!“ میں نے حیرانگی سے کہا، کیونکہ میں اس کو پہچان نہ پایا تھا۔ ”میں نازیہ ہوں، عبدالکریم کی بیٹی، آپ احسان ہیں نا؟“ اس نے کہا۔ ”نازیہ!“ میرا ذہن یکدم دس سال پیچھے چلا گیا۔ ”وہ نازیہ!!“

”جی میں احسان ہی ہوں اور آپ کیسی ہیں۔“ میں نے بہت اذیت سے پوچھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں اور آپ یہاں کیسے۔“ نازیہ نے مجھ سے پوچھا۔

”میں جاب کرتا ہوں تو میں ادھر ملتان دوستوں کے پاس آیا ہوا تھا پھر ہم سب یہاں سے اکٹھے جاتے ہیں اور آپ ادھر کیسے؟“ میں نے نازیہ سے پوچھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں اور میں اپنے شوہر کے پاس

میں اس وقت ملتان پلیٹ فارم پر موجود تھا اور سردیوں کی بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اس لیے پلیٹ فارم پر اکاڑ کا مسافر تھے اور دوسرا یہ کہ میرے جن دوستوں نے میرے ساتھ ڈیوٹی پر جانا تھا ان کی شیشیں بھی بک تھیں۔ ان کی ابھی کال آئی تھی کہ بارش کی وجہ سے وہ سب ایک ہی مشترکہ پلان بنا چکے تھے کہ ہم نے آج نہیں جانا کیونکہ ایک تو یہ کہ سردیوں کی بارش تھی اور دوسرا صبح سے شروع ہوئی تھی اب شام کے پانچ بجنے والے تھے مگر بارش دوپہر میں ذرا دیر کے لیے بھی اور پھر اپنی پوری آب تاب کے ساتھ شروع ہو گئی۔ سردی جسم کو چیر کر اندر جاری تھی، میں نے بھی اپنے آپ کو لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت پلیٹ فارم پر جتنے بھی مسافر موجود تھے سب کے سب سردی کی شدت سے بچنے کے لیے ایک طرف کونوں میں دبکے ہوئے تھے مگر میں ایک اکیلا واحد برآمدے میں اپنی کچھ یادوں کو اپنے دل میں دبانے کے لیے مونگ پھلی سے دل بہلا رہا تھا۔ میں ہمیشہ اسٹیشن پر وقت سے پہلے پہنچ جاتا تھا پھر پلیٹ فارم میں مسافروں کی گہما گہما میں مصروف ہو جاتا اور پھر گاڑی آ جانی اور میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتا۔ میری مونگ

میں بچپن سے ہی ایک نمبر کا شرارتی تھا اور اپنے اندر بھر پور مزاح رکھتا تھا اس لیے محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا۔ اوٹ پٹانگ کام کرنا اور زیادہ تر جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھنا میرا شوق تھا حتیٰ کہ یہ شوق میرا ایف اے تک جاری رہا۔ جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھ کر میرا بھی دل کرتا کہ کاش میرے پاس بھی ایک جن یا کوئی طاقت ہوتی تو میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتا اور دنیا کو حیران کر دیتا مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

پھر میرے ہاتھ ایک منزلوں کی کتاب بھی لگی جس کو صبح شام پڑھنے کے باوجود بھی میرے ہاتھ کچھ نہ لگا اور پھر میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

میں نے ایف اے کے پیپر دیے اب فراغت ہی فراغت تھی، تو سوچا کیوں نہ ملتان تایا جی کے پاس چلتے ہیں۔ ملتان میں تایا کے رشتہ داروں کے علاوہ ہمارے اور بھی کافی رشتہ دار رہتے تھے اس لیے میں

☆.....☆.....☆



اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ملتان چلا گیا۔ چند دن تو دعوتیں کھائیں پھر ہر روز دوسرے رشتہ داروں کے لڑکوں کے ساتھ زمینوں پر گھومنے پھرنے نکل جاتے۔

ایک دفعہ ہم سب زمینوں پر الگ الگ گھوم رہے تھے۔ میں گھومتے گھومتے لیوں کے درخت کی طرف جا نکلا وہاں میں نے دیکھا کہ ایک عجیب شکل کا لڑکا بیٹھا ہوا ہے اور اس نے ایک ہاتھ میں لیوں پکڑا ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ میں پتا نہیں کیا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”اوئے لیوں چوری کرتا ہے تو؟“ میں نے غصے سے اس لڑکے کو پکارا۔

مگر وہ ڈھیت بن کر خاموش بیٹھا رہا اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا تھا۔

”اچھا ایک منٹ رُک میں اپنے دوستوں کو بلا کر لاتا ہوں۔“ میں لیوں کے درخت سے پیچھے ہٹ آیا اور تیز آواز لگا کر اپنے کزن امجد کو بلایا وہ تھوڑا دور تھا، میں نے اس کو ساری بات بتلائی، ہم جیسے ہی دوبارہ اس درخت پر پہنچے تو وہ لڑکا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔

”یہ کہاں گیا؟“ میں نے حیرانگی سے کہا۔

”جب تم مجھے بلانے گئے تو ڈر کے مارے بھاگ گیا ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

ہم چند دنوں بعد ہم پھر زمینوں پر گئے تو میں بے خیالی میں گھومتے گھومتے پھر اس لیوں کے درخت کے نیچے آ گیا۔ میں نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور ابھی لیوں کے درخت سے لیوں کاٹنے ہی والا تھا کہ میری نظریں پڑی۔ میں دیکھا کہ ایک رومال پڑا ہوا تھا میں نے جلدی سے اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک لیوں تھا۔

”اس کا کیا مطلب؟؟ کاٹنے پر ہی کچھ پتا چلے گا۔“ میں نے خود ہی سوچا۔

ابھی میں اس کو کاٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک طرف سے زور کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

☆.....☆.....☆

”اس کو مت کاٹیں گا۔“ میں نے سامنے دیکھا تو وہی عجیب سا لڑکا تھا۔ وہ منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اُس کے پڑھنے والے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

”کیوں تیرے چاچے کا کھیت ہے۔ ایک چوری کرتا ہے دوسرا بد معاشی کرتا ہے۔“ میں نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

ابھی میں پھر اس کو کاٹنے ہی والا تھا وہ پھر منہ کرنے لگا کہ اس کو نہ کاٹو مگر پھر اچانک اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

مگر میں نے ایک نہ سنی اور لیوں کو کاٹنا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس کے اندر سے سرخ لہو نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔ تم لیوں کے زیریہ کوئی جادو کرتے تھے۔“ میں بڑبڑا رہا تھا کہ اچانک اس نے قریب آ کر مجھ سے وہ سامان مانچ لیا۔

”یہ تم کو کیسے نظر آ گیا اور تم نے اس کو کیوں کاٹ دیا۔“ وہ لڑکا بے حد افسوس ناک لہجے میں بولا۔

”ایک تو ہمارے لیوں چوری کرتے ہو اور پھر اس پر تعویذ وغیرہ کرتے ہو اور اتنا سوال بھی مجھ سے کر رہے ہو اس دن تو تم بھاگ گئے تھے آج میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میری دنیا تو تم نے اجاڑ دی ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تم نے یہ لیوں کاٹ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کا حساب تمہیں دینا پڑے گا۔ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ درختوں کے جھنڈ میں گھسنا ہی چلا گیا۔

میں نے جلدی سے امجد اور دیگر دوستوں کو بلایا۔ وہ سب آئے، ہم نے اس جھنڈ میں اس کا پیچھا کیا مگر حیرانی کی بات تھی کہ وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مگر میں نے ان کو لیوں کے سرخ لہو والی اور جو اس نے مجھے کہا تھا کہ حساب دینا پڑے گا وہ بات بالکل نہیں بتائی تھی۔ کیونکہ سرخ لہو والی بات پر مجھے ایک شرارت سوچ رہی تھی۔

ہم مزید کوئی بیس دن ملتان رہے اور پھر ہماری اپنے شہر لے واپسی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

پہنچے تو ایک بہت بڑی خوش خبری ہماری منتظر تھی کہ ابو کے بہت ہی قریبی رشتہ دار، چاچا کریم کی بیٹی فاریہ کی شادی تھی۔ یہ فاریہ، نازیہ کی بہن تھی۔ اور ہم دونوں کے گھر والے نازیہ اور میری دادی کو رونا چاہتے تھے، تو اس لیے میرے لیے یہ بڑی خوش خبری تھی کہ ہم نازیہ کے گھر جا رہے ہیں۔

ہم شادی سے دو دن پہلے پہنچ چکے تھے۔ ہمیں دادی میں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا کہ یہ شہر سے آئے ہیں کیونکہ ان کا گھر دیہات میں تھا۔

رات کو شادی کی رونق عروج پر تھی۔ امی نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھیں کہ چاچا کریم کی بیوی امی سے اس لیے کہنے لگی کہ باجی دعا کرنا۔ فاریہ کا پانچ دنے زور چوری ہو گیا ہے مل جائے۔“

”کیا، کیسے۔“ امی اور میرے منہ سے تقریباً ایک ساتھ نکلا۔

”کچھ پتا نہیں ہم نے آج ہی دیکھا تو وہاں نہیں تھا۔“ چاچا جی نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ میرے ساتھ آئیں اور یہ دیکھیں کہ زور کس جگہ پڑے تھے۔“

”اس کمرے میں، اور کس میں۔“ انہوں نے میں سے ہی مجھے بتلایا۔

”اس زور کے بارے میں کس کس کو پتا تھا کہ اس میں پڑا ہے۔“ میں نے سوال کیا۔

”جن جن کو پتا تھا انہوں نے نام بتا دیے۔ اندر کمرے میں تمام خواتین، لیکن فاریہ اور نازیہ سب دل چپ اور حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔“

”ٹھیک ہے جن کو پتا ہے ان سب کو ادھر بلائیں۔“

”میری کوئی بات نہیں کرنی۔“

”باجی باہر چلی گئی تھوڑی دیر بعد آئی تو ان کے ساتھ پھر عورتیں تھیں، میں سب کو غور سے دیکھتا رہا۔

پھر نہ جانے کہاں سے میرے اندر ایک ایسی طاقت آ گئی جو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ فلاں فلاں چوری کی ہے۔“

”چاچا اس عورت کا نام!“ میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹا یہ نیسہ ہے مگر یہ ہماری قریبی رشتہ دار ہیں۔“

”جی چاچا اس نے ہی زور چرائے ہیں، پوچھو اس سے۔“

”نہیں میں نے نہیں چرائے۔“ وہ عورت چلاتے ہوئے بولی۔

”چاچا اس کا گھر کہاں ہے۔“

”ادھر قریب ہی ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر پولیس اور سارے مہمانوں کو بلا کر سب چلتے ہیں۔ جب زور مل جائیں گے۔ بے عزتی بھی ہوگی اور جیل بھی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ یہ عورتیں تمہارے ساتھ چلتی ہیں تاکہ تم کو خود ہی زور دے سکیں تاکہ یہ بے عزتی اور جیل سے بچ سکے۔“

وہ پولیس اور بے عزتی کا سن کر ڈر گئی اور فوراً مان گئی کہ اس نے زور چرایا ہے جو اس کے گھر پڑا ہے اور وہ دینے کو تیار ہے۔

”یہ کیا یوسف بھائی! آپ کو کیسے پتا چلا کہ زور اس کے پاس ہے۔“ ان سب کے جانے کے بعد اچانک فاریہ نے مجھ سے پوچھا۔

”اصل میں میرے قبضے میں جن بھوت ہیں، وہی مجھے سارا کچھ بتاتے ہیں۔ ایک جن کے ذمے ایک کام لگایا ہے کہ کسی کے دل کو قابو کرنا ہے مگر بولتا ہے کہ سر یہ مشکل کام ہے۔“ میں نے نازیہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر آ کر مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ یہ سب میں نے کیسے کیا اور وہ عورت کیا واقعی چور تھی۔ اگرچہ چور بھی پھر میرے ذہن میں اس بات کا اشارہ کیوں اور کیسے آیا، کہ وہ چور ہے۔ میں جتنا زیادہ سوچتا جاتا مانع اتنا زیادہ ابھتا جاتا۔

☆.....☆.....☆

شادی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا کل رات جو میں نے زور برآمد کیے تھے اس واقعے سے میری اچھی خاصی

شہرت ہو چکی تھی۔ یہ دیہات کا سادہ سا ماحول تھا۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر اس بات پر یقین کرتے تھے کہ ہم پر تعویذ کرانے گئے ہیں کوئی کدہ رہا تھا کہ ہم پر جادو ہے اور ان سب کے بیچ میں ہیں ”عامل بابا“ بن کے بیٹھا تھا جس کو جتنا دنیا کی الف ب کا بھی پتا نہیں تھا پتا تھا تو صرف کہانیوں کی حد تک۔ ہر عورت یہ چاہتی تھی کہ میرا مسئلہ پہلے حل ہو۔ ان کی سادہ لوحی پر میرا دل چاہ رہا تھا ادھر ایک پیری فقیری کا آستانہ ہی کھول لیا جائے اور خوب پیسے کماؤں کیونکہ ان بے چاری عوتوں کے اتنے مسائل نہ تھے جتنے ڈر و خوف تھے۔ ان کے مسائل حل کرنے کے لیے بچپن میں پڑھی گئی جنوں بھوتوں کی کہانیاں خوب کام آ رہی تھیں۔

میں نے ہر عورت سے کہا کہ میں جو تمہیں علاج بتاؤں گا انہی میرے سامنے کرنا ہوگا بس اس کی صرف ایک ہی خوراک ہے اور یہ فی سبیل اللہ ہے۔ اور اس کے بارے میں کسی اور عورت کو اگر بتایا کو اس علاج کا اثر ختم ہو جائے گا۔“ مطلب سب کا علاج ایک ہی تھا، مگر عورتیں ایک دوسرے سے بے خبر تھیں۔ مجھے وہ لڑکا اور لکیوں والا واقعہ یاد تھا میں سرخ سیاہی کو لکیوں میں انکشن کے ذریعے داخل کر دیتا پھر وہ عورت کو دے دیتا اس کو کہتا کہ تمہارے اور تعویذ تھے مگر میں نے اپنے عمل سے ان سب کو اس لکیوں میں بند کر دیا ہے۔ اب تم اس کو کاٹو۔“

پھر وہ اس کو کاٹتی تو جیسے ہی سرخ سیاہی نکلتی۔ میں عورت کو کہتا کہ دیکھو یہ تمہارے حاسدین کے کام جنھوں نے تم پر جادو وغیرہ کروایا اس کا خون نکل رہا ہے وہ سب فنا ہو گئے۔ اب تم پر کوئی تعویذ نہیں۔ جس سے وہ عورت حیران ہو کر خوش خوش چلی جاتی۔ بس اس طرح ہی ہم نے کسی کو کس طرح مطمئن کیا اور کسی کو کس طرح اپنی چرب زبانی سے، باتوں سے مطمئن کیا۔ آخر شادی کا تیسرا دن سب مہمان رخصت ہو گئے۔ فارہ آبی بھی آئی ہوئی تھی، نازیہ اور وہ باتیں کر رہی تھیں تو مجھے بھی ان سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

”یوسف بھائی بہت شہرت سن رہی ہوں میں آپ کی۔ یہ کیا چکر ہے؟“ فارہ آبی نے مجھ سے کہا۔ میں انہی جواب دیتا کہ اچانک نازیہ بیچ میں پڑی۔

”فارہ آبی اس سے بولیں کہ پلیز یہ کمرے سے باہر چلا جائے۔ اس نکل سے جب یہ تعویذوں والا کام شروع کیا ہے، مجھے سخت اچھٹن ہو رہی ہے۔“ اس نے ٹھوڑا غصیلے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے میڈم جی ہم کمرے سے تو کیا، ہم آج شام کو ہی گھر جا رہے ہیں۔ پھر اداس ہوئی رہنا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اداس ہوتے ہیں میرے دشمن۔“ وہ باہر جاتے زور سے ہوئے بولی۔

جب ہم شام گھر کو آ رہے تھے نازیہ بخار میں رہی تھی اور میرا دل کٹ رہا تھا مگر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم وہاں مزید نہیں رک سکتے تھے کیونکہ ابو کے آفس کی چٹھیاں ختم ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆
واپس آ کر میں بہت اداس رہا۔ مجھے پتا تھا کہ اب گاؤں میں ہمارا چکر دو ماہ بعد لگے گا۔ یہ دو ماہ میں نے بہت مشکل سے کاٹے کیونکہ ابو کی روٹین تھی کہ ہم چاچا کریم کے ہاں دو ماہ کے بعد ہی جاتے تھے۔ اور پھر ہم دو ماہ بعد چاچا کریم کے گھر تھے، سب نے خوشی بہت کا اظہار کیا مگر نہ جانے کیوں نازیہ اداس تھی یا اس کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

شام ہوئی تو کسی طرح ارد گرد کی عورتوں کو میرے آنے کی ہنک پڑ گئی۔ میں بھی ”عاملیت“ کا سامان ساتھ لایا تھا، وہی سرخ سیاہی اور لکیوں دیا اور بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔

اس پورے دن میں مجھے ٹھوڑی دیر کے لیے نازیہ باہر نظر آتی باقی مجھے وہ سارا دن نظر نہ آئی۔ دوسرے دن ہم صبح ہوتے ساتھ ہی کچھ اور رش داروں کے گھر چلے گئے۔ جب چند گھنٹے کے بعد واپس آئے تو نازیہ باہر بیٹھی تھی پھر کچھ دیر تک تو باہر

رہی پھر اندر کمرے میں چلی گئی۔ اس کی کیا بات تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ سکا۔ کیا وہ میرے لڑکوں والے کام کرنے پر ناراض تھی یا کچھ اور وجہ تھی۔ شام کو ہماری واپسی تھی اور میں ایک تجسس، لاشی میں گھر لوٹ آیا۔

☆.....☆.....☆
اگلا چکر ابو کی مصروفیت کی وجہ سے جلدی نہ لگ سکا۔ ہم تقریباً چار ماہ بعد آئے۔ اس دفعہ فارہ آبی آئی ہوئی تھیں۔ چند گھنٹے تو نازیہ ہمارے پاس موجود رہی مگر پھر وہی حال.....

میں نے مجبور ہو کر فارہ آبی کو سارا حال بتایا اور تعویذ والی بات پر معذرت بھی کی کہ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ پلیز آپ نازیہ سے بات تو کریں کہ اس سے بات کیے ہوئے مجھے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔“ فارہ آبی نے مجھے شام نے کو بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں جس وہ زرا پڑھائی میں مصروف ہوئی ہے۔ ”مگر آبی پڑھائی تو پہلے بھی ہوتی تھی، اب کوئی خاص پڑھائی ٹھوڑی ہے۔“ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا مگر کچھ بات نہ بن سکی۔

ہم دو دن بعد لوٹ آئے اور میں اس آس پر لوٹا کہ ہم کب جا سکیں گے؟

☆.....☆.....☆
جب ہمارا اس دفعہ چاچا کریم کے ہاں جانے کا ارادہ بنا تو میرا یونیورسٹی کا فکشن تھا جس کو چھوڑنا ناممکن تھا اور میں دوسری طرف نازیہ کا رویہ دیکھ چکا تھا تو مجبوری کی بنا پر چاچا کریم کی طرف نہ جاسکا۔ اور یہ سوچ لیا کہ چلو اچھی دفعہ ہی سہی۔

دوسرے دن گھر والوں کی واپسی ہوئی تو آتے ہی میں بھائی کو کونے میں لیے گیا اور نازیہ کا حال پوچھا تو بھائی نے حیرانگی سے کہا کہ وہ اس دفعہ تو بالکل ٹھیک تھی سارا دن ہمارے ساتھ رہی حتیٰ کہ اس نے ہماری وجہ سے اپنے کالج سے بھی چھٹی کی تھی۔“

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی کہ وہ صرف میرے سامنے نہیں آ رہی تھی اور پڑھائی کا تو اس نے محض بہانا کیا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ اس بار جا کر

نازیہ سے ہر صورت لازمی بات کروں گا۔ اگلی بار جب ہم پہنچے تو صورت حال بالکل ویسی کی ویسی تھی تو میں نے تجویز کیا کہ دوبارہ ادھر نہیں آؤں گا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی کہ آخر میرا جرم کیا تھا۔

☆.....☆.....☆
وقت گزرتا گیا اور نازیہ سے بات کیے ہوئے مجھے ڈیڑھ سال گزر گیا۔ بھائی کی زبانی مجھے پتا چل جاتا کہ میری غیر موجودگی میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ ایک دفعہ چکر لگایا تو نازیہ کا وہی رویہ رہا تو میں نے بالکل ہی جانا چھوڑ دیا اور میرا معقول بہانہ وہاں نہ جانے کا یہ بھی تھا کہ میری جاب ہو چکی تھی تو میں نہیں آ سکتا۔ مگر پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جو شاید مجھے بھی نہ بھولے۔ نازیہ کے بھائی کی شادی تھی سب گھر والے جا رہے تھے۔ میرا جانا بھی لازمی تھا۔ تو اس موقع پر دونوں گھر والوں نے میری اور نازیہ کی منگنی کا سوچا۔ میرے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری تھی مگر پریشانی اس بات کی تھی کہ نازیہ نے تو مجھ سے ڈیڑھ سال سے بات نہیں کی تھی۔ کیا وہ مان جائے گی۔

شام کو میں نے الگ سے فارہ آبی کو بلایا اور کہا کہ آبی آپ کو پتا ہے میری اور نازیہ کی منگنی کی بات چل رہی ہے مگر کیا وہ راضی ہے؟“

”ہاں بھیا امی نے مجھے کہا ہے کہ تم نازیہ سے پوچھو کیونکہ امی، ابو اور میں بھی یہی چاہتی ہوں مگر میں نے نازیہ سے بات کی ہے اس نے ”ناں“ میں جواب دیا ہے۔“ فارہ آبی نے انفرادہ لہجے میں کہا۔ ”مگر آبی کوئی وجہ تو ہوگی نا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں نے نازیہ سے پوچھا تھا تو اس نے کہا کہ وہ یہ منگنی یا شادی ہرگز نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے آپ دونوں کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہیں۔“ ”ٹھیک ہے آبی کوئی بات نہیں بس نازیہ سے کہیں کہ میری صرف ایک بات سن لے۔“

”وہ کیا بھائی؟“ آبی نے کہا۔ ”آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کی شادی پر کھوئے ہوئے زیور والی چور کو پکڑا تھا۔ پھر عورتوں

کے کچھ جناتی مسائل ہوئے تھے وہ حل کر کے دیتا تھا۔ اب اگر نازیہ نے کہا ہے کہ اس کی منگنی یا شادی سے ہم دونوں کی زندگیوں کو خطرات ہیں تو آپ ایک لیٹھوں لے آئیں آپ کو اس پر ایک خاص عمل پڑھ دوں گا۔ اس لیٹھوں میں ہماری آنے والی ساری زندگی کے خطرات ہوں گے۔ نازیہ پھری سے خود اس کورات کی تنہائی میں کانٹے لگی۔ اس سے سرخ خون نکل جائے گا۔ جو اس بات کی نشانی ہوگا کہ ہماری آنے والی زندگی سے خطرات نکل گئے ہیں۔ پلیز آپ میں نازیہ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

”مگر بھائی یہ کیسے ممکن ہے؟“ فاریہ آپ نے کہا۔

”آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں میں نے آپ کے زیور کیسے برآمد کیے تھے۔ اصل میں یہ سب میرے ساتھ ایک نیک بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے تو میں وہی کلام پڑھتا ہوں۔ تو یہ سب کچھ ہو جاتا ہے میں کچھ بھی غلط نہیں کرتا اور میرا مقصد غلط نہیں ہے۔“ میں نے بہت بڑا جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ میں نے شام کو آپ کو لیٹھوں دیا مگر اس دفعہ اس میں کوئی سرخ سیاہی نہیں ڈالی تھی کہ اگر اس کو کاٹا جائے تو اس میں کچھ بھی نہ ہو تو میں یہ کہوں گا یہ دیکھو کہ ہماری آنے والی زندگی میں کوئی خطرات نہیں پھر چاچی کو بولوں گا کہ چند ان عورتوں کو لے آؤ جب انہوں نے مجھے لیٹھوں دیے اور میں نے واپس کیے انہوں نے کانٹے تو ان میں سرخ خون تھا۔ اس طرح نازیہ کے پاس جو لیٹھوں ہوگا وہ بھی سفید ہوگا، اس طرح میرا مقصد کامیاب ہو جائے گا۔

پھر رات ہوگئی مجھے صبح کا شدت سے انتظار تھا۔ اگلے دن شادی تھی۔ نازیہ تو کہیں نظر نہ آئی مگر جیسے ہی فاریہ آپ کو دیکھا تو ان سے پوچھا تو ان نے کہا کہ نازیہ نے سختی سے منگنی وغیرہ سے منع کر دیا ہے اور اس کو شدت سے بخار ہے۔

”مگر آپ کیا انہوں نے وہ لیٹھوں کا کاٹا تھا؟“

”ہاں کاٹا تھا۔ اس میں سے ایسے خون نکلا جیسے

کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔“

”کیا آپی میں لا۔“ چلا اٹھا۔

”ہاں نہیں یقین نہیں آتا یہ دیکھو میں کمرے سے اٹھا کر لاتی ہوں۔ وہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا ہے۔“

آپ تھوڑی دیر بعد آئیں تو ان کے ہاتھ میں شاپر تھا جو انہوں نے مجھے دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شاپر کو کھولا پھر اندر لیٹھوں کپڑے میں سرخ ہوا پڑا تھا۔ میں نے جیسے ہی کٹے ہوئے لیٹھوں کو کھولا سرخ خون کا فورہ نکلا جو میرے ہاتھوں کو لال کرتا ہوا زمین پر گر ا۔ اب صورت حال عجیب تھی اگر میں لیٹھوں کو بند کرتا خون بند ہو جاتا اگر لیٹھوں کو کھولتا تو خون ایسے نکلتا جسے کوئی تازہ خون۔ میں خوف زدہ ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی میں اس لیٹھوں کو ساتھ بے تہ کھال کے پانی میں ڈالا اور خود اندر شادی والے گھر کی طرف بھاگا۔

میں اچھا خاصا ڈر گیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ میں چاہتا تھا ہم جلد از جلد ادھر سے نکلیں۔ یہ شکر تھا ہم نے آج ہی آنا تھا تو ہم گھر واپس آ گئے۔

گھر واپس آتے ہی مجھے خوف کی وجہ سے اگلی کئی دن بخار رہا۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ میں نے سفید لیٹھوں دیا تھا تو اس کی یہ حالت کیسے ہوگی۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کے تین سال بعد میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہوا اور چاب کی وجہ سے میں بھی مکمل طور پر ملتان شفٹ ہو گیا تھا۔ اس بار جب میں گھر آیا تھا یہ خبر سننے کو ملی کہ نازیہ کی شادی کے ساتھ ابو کے ایک اور رشتہ دار کی بھی شادی ہے۔

مجھے نازیہ کی شادی میں کوئی دلچسپی نہ تھی میں نے سوچا کہ دوسری شادی میں شرکت کر لی جائے اور گاؤں کا سیر سا نا بھی ہو جائے گا۔

مگر ادھر کیا حسین اتفاق ہوگا۔ مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ جب ہم اپنی کار میں شادی پر پہنچے میں بھائی کو نازیہ کی شادی پر لے جانے کی بجائے

دوسری شادی پر لے گیا۔ پھر ہم وہاں سے لاٹھ ہونے کے بعد جیسے ہی چاچا کریم کے گھر کے راستے پر آئے تو ایک بچی سنواری کا کھڑی تھی جس کا ادھر اس سے پیچھے چھاڑ کر رہا تھا۔ اور ارد گرد سارے ہمارے جاننے والے بندے کھڑے تھے۔

ڈائریور نے ہمیں دیکھ کر رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم گاڑی روک کر پیچھے اترے، پتا چلا کہ اشارت نہیں ہو رہی۔

میں نے جیسے ہی ان کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اندر ایک طرف فاریہ آپ، درمیان میں دہن بن کر بیٹھی نازیہ، ساتھ نہ جانے کون تھا۔ سب کی توجہ باہر کار کی طرف تھی جبکہ جو حیران کن بات تھی وہ یہ تھی کہ نازیہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

میں اپنی توجہ بھائی اور کار اشارت کرنے لگا۔ تھوڑی سی تنگ و دو کے بعد کار اشارت ہو گئی۔ میں کار سے باہر نکل آیا اور اداس آنکھوں سے نازیہ کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا اور اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ آج اتنے سالوں بعد مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائی ہے۔ کچھ پوچھ سکا نہ بتا سکا۔ بس خاموش نظروں سے دھول اڑانی کار کو دیکھتا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹرین کی زوردار آواز نے مجھے یکدم نیند سے بیدار کر دیا۔ میں اٹھ بیٹھا کوئی انشین آیا تھا جس سردی تھی میں بھاگ کر پکڑے لے آیا۔

نازیہ اب شادی شدہ تھی، اس کا احترام اب بھی میرے دل میں تھا مگر کچھ سوال چل رہے تھے اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”احسان ایک بات پوچھوں۔“ اچانک نازیہ نے خود ہی لب کھولے۔

”ہاں پوچھو۔“ میں نے کہا۔

”کیا تم واقعی تعویذوں والا کام جانتے تھے۔“

”نہیں میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کے بارے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔“

”تو پھر تمہیں یاد ہوگا کہ فاریہ آپ کی شادی پر وہ

زیور تم نے کس طرح تلاش کیے تھے۔“ نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں زیور والی بات تو مجھے بھی یاد ہے مگر اتنے سالوں بعد تم نے دوبارہ یاد کروائی ہے۔ اس بارے مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے اس عورت کو کیسے پکڑا تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ عورت یہ ہے، مگر اس واقعے کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس بات کی سمجھ نہیں آئی۔“ نازیہ نے مجھ سے کہا۔

چند باتیں تو میں نے بھی تم سے پوچھنی تھیں؟

”کیا۔“ نازیہ نے جوابا کہا۔

”نازیہ اب تم شادی شدہ ہو۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں مگر میں وہ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جو مجھے گذشتہ دس سالوں سے تکلیف دے رہی ہیں کہ تمہارا رویہ میرے ساتھ اتنا کیوں بدل گیا تھا۔ تم نہ جانے اتنی بدل کیوں گئی تھیں۔ ہو کیا گیا تھا۔ تم میری شکل دیکھنا پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ میں جب بھی آتا میری نظروں سے دور ہو جاتی تھیں۔ ناں اور جب میرے گھر والے آتے تو تم ان کے سامنے بیٹھی رہتی تھیں، یہ معذرت آج تک میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ نہ جانے میرا ایسا کیا قصور تھا جس کی سزا تم نے مجھے دی۔“ میں نے بولتے ہوئے کہا کیوں کہ آج مجھے ہر سوال کا جواب چاہیے تھا۔

”جواب ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس پر یقین نہیں کرو گے۔ جس رات تم نے زیور برآمد کیے اس سے اگلے دن مجھے تم سے خوف آنے لگا، پھر بخار ہو گیا پھر جب تم ہر دفعہ آتے تو مجھے تمہارے سائے سے بھی خوف آتا کیونکہ تمہارے سر پر ایک بڑا سا اڑدھا بیٹھا ہوتا تھا اس کی خوفناک آنکھیں ہوتیں یا اس میں سرخ لیٹھوں ہوتے تھے۔ اب مجھے یہ پرانی بات یاد نہیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ میں نے کسی لڑکی کو کہا کہ تمہارے سر پر کیا ہے تو اس نے کہا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب کہ مجھے وہ صاف نظر آتا۔ میں جدھر جاتی وہ مجھے ٹھوکتا رہتا اس لیے میں نے تمہارے سامنے آنا چھوڑ دیا پھر جب تم نے مجھے کانٹے کے لیے لیٹھوں دیا تھا اس سے

بھی سرخ ہو نکلا تو مجھے یقین ہو گیا تمہارے قبضے میں کوئی پراسرار قوت یا جن ہے۔“

”کیا واقعی ایسا ہی تھا۔“ میں حیرت سے کہا۔
”ہاں بالکل مگر کیا تمہیں اس بارے کوئی علم نہیں تھا۔“ نازیہ نے حیرت سے کہا۔

”اف نہیں میں، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اس بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا لیکن پھر تمہاری بات جاری تھی تو اتفاق سے گاڑی خراب ہو گئی تھی تو میں ٹھیک کرنے کے لیے اندر آیا تو تم اس وقت کیوں مسکرائی تھیں۔“

”جیسے ہی کار خراب ہوئی سب کار سے باہر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے شیشے سے باہر کی طرف جھانکا تو تم نظر آتے دکھائی دیے مگر اس دفعہ مجھے تم سے کوئی خوف نہ آیا اور نہ ہی تمہارے سر پر کوئی اثر دھا وغیرہ تھا۔ تو اب تم مجھے پلیٹ فارم پر ملے تو بھی کوئی خوف نہ ہوا پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ اثر دھا ہی میرا دشمن تھا۔ جس سے شاید تم جنوں بھوتوں کو پکڑتے رہے تو تم نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔“ نازیہ نے کہا۔

”میں نازیہ میرا یقین کرو۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔“ میں نے اس کو اپنا یقین دلانے کی بہت کوشش کر مگر وہ نہیں مانی۔
ثرین کی رفتار اب دھیمی ہو رہی تھی۔

نازیہ کی منزل آگئی تھی۔ وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔
ثرین بالکل ساکت ہو گئی۔ نازیہ نے اپنا سامان اٹھا لیا اور نیچے اتر گئی۔ میں اس کو دوسری بار کھور ہا تھا وہ بھی کوئی اپنا بیچتا ہے بنا کیونکہ میرے پاس کہنے کے لیے لفظ ہی نہ تھے!!!

☆.....☆.....☆

ثرین تھوڑی دیر کے بعد پھر چل پڑی۔ میں شیشے سے باہر کے منظر کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو وہاں ایک عجیب سا شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ یہ نہیں وہ کب اندر آیا تھا۔
”بھائی شاید آپ غلط سیٹ پر بیٹھ گئے ہیں کیونکہ

یہ سیٹیں بیک ہیں۔“ میں نے اس آدمی سے بہت دیر سے بات کرتے ہوئے کہا۔

”جانتا ہوں احسان صاحب یہ سیٹیں بیک ہیں۔ مگر آج آپ کے ساتھ بیٹھے اور بات کرنے کے دل چاہ رہا ہے۔“ اس عجیب و غریب آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کھ کیا مطلب تم کون ہو؟؟ اور میرا نام کیسے جانتے ہو اور مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔“ میں نے تھوڑا اذیت پسند لہجے میں اس سے پوچھا۔

”بس ایک بہت پرانا قرض باقی تھا۔“
”کیسا قرض!“ مجھے سخت الجھن ہوئی۔

”یاد کرو جب تم بچے تھے اور اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں گئے تھے۔ تمہیں ان کی زمینوں سے کیوں کے درخت کے نیچے سامان میں جو چیزیں ملی تھیں، اس میں ایک کیوں بھی تھا۔ تم نے اس کاٹ ڈالا تھا حالانکہ کوئی تم سے تنگی مرتبہ کہتا رہا تھا کہ اس کو مت کاٹو مگر تم نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کیوں کاٹ ڈالا اور اس میں سے لہو بھی نکلا تھا۔ یاد ہے یا یہ بات۔“ اس نے مجھ سے کہا۔

”ہاں، ہاں یاد ہے مگر وہ تو بہت پرانی بات ہے۔ وہ تو کوئی لڑکا تھا اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہ لڑکا میں ہی ہوں اور تمہارے لیے وہ پرانی بات ہوگی میرے لیے جیسے کل کی بھی نہیں بلکہ آج کی بات ہے کیونکہ تمہاری وجہ سے میری ”شکلا“ ہمیشہ کے لیے مجھ سے ٹھوکی۔ ہم اس دنیا کے لوگ نہیں تھے۔“
”تو آپ کون تھے اور یہ شکلا کون تھی؟ آپ پوری بات بتلائیں۔“ مجھے سخت الجھن ہو رہی ہے۔“ میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”ہم اُس دنیا کے لوگ ہیں جس میں تم بہت دلچسپی رکھتے تھے اور عورتوں کو تعویذ بنا کر دیتے تھے مگر اس بارے پتا کچھ بھی نہیں تھا، یعنی پراسرار دنیا۔ ایک دفعہ ہم سب اپنے پورے خاندان کے ہمراہ اس دنیا میں آئے۔ ہم ابھی تمہاری دنیا کی سیر کر ہی رہے تھے کہ ہماری دنیا پر ہمارے دشمنوں نے حملہ کر دیا۔

تھا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔
”مگر کاش تم مجھے پہلے مل لیتے۔ سب باتیں نازیہ کے سامنے بتا دیتے تاکہ اس کو میری باتوں کا یقین آ جاتا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میں تمہارے سامنے جان بوجھ کر نہیں آیا اور اس کو بچ نہیں بتایا اور تم پر ایک خاص عمل کر دیا ہے کہ تم بھی اب اس سے بھی مل نہیں سکو گے۔ تاکہ تمہیں ساری زندگی احساس رہے کیونکہ تم نے تعویذ کے نام پر کئی جھوٹ بولے تھے۔ وہ بھی اس وقت جب تم بچے نہیں تھے۔ ایک بات یاد رکھنا، ہماری جناتی دنیا بہت وسیع دنیا ہے۔ اس میں شر بھی ہے، بد بھی ہے اور اچھائی بھی ہے۔ اور یہ ہماری دنیا کوئی ایسی عام طاقت نہیں کہ جو تمہاری دنیا کے ہر دعوے دار کے قبضے میں آ جائے گی۔“ پھر اس کے بعد اس نے ایسا قہقہہ لگایا جس کی آواز سے مجھے ایسے لگا جیسے کئی ٹرینیں آپس میں ٹکرائی ہوں اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

ثرین کے وصل کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گذشتہ حالات پر غور کیا۔ میں اتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا، باہر جھانکا میری منزل آگئی تھی۔ میں جلدی سے اپنا سامان اٹھا کر باہر لے آیا۔ میں مجرم نہ ہونے کے باوجود بھی مجرم تھا نازیہ کا بھی اور شکلا کا بھی۔ اور اب اس جرم کی سزا مجھے ساری زندگی برداشت کرنا تھی۔ میں نے ثرین سے اترتے وقت کھڑکی کے شیشے پر اپنا عکس دیکھا تو مجھے 1100 والٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ میرے سر پر واضح طور پر ایک اثر دھا، سرخ کیوں جیسی آجھیں لگے گھور رہا تھا۔

میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ کیونکہ اب مجھے اس اثر دھ سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں ”شکلا“ کے محبوب پر ہوئے ظلم پر اپنے خدائے دل ہی دل میں معافی مانگ رہا تھا۔ بے شک خدا کی مخلوق کا شمار نہیں۔ خدا مجھے معاف کرے گا اور اس عفریت سے نجات دلوائے گا۔ یہ یقین میرے دل میں دور تک گھر کرتا جا رہا ہے۔ آپ بھی میرے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔

☆.....☆.....☆



دوسری خوفناک کہانی

سنیپو لیے



علی حسنین تابش

حاسدوں کے شر سے نکلی ایک روح فرسا خوف بیتی

پوچھتا ہوں لیکن پھر خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بزرگ خود مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”بیٹا! تمہارے من میں بہت سے سوال ہیں۔ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“ ان کی بات سے میں بہت حیران ہوا کہ انہیں کیسے معلوم پڑا؟ میں نے ان سے کچھ پاتے ہوؤں سے پوچھا۔

”باباجی! یہ کون کون ہوا ہے؟“ اس سے زیادہ میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔ انہوں نے اک نگاہ مجھ پہ ڈالی اور کبھی سانس لی۔

”لگتا ہے تم اجنبی ہو یا پھر اس بڑے اسرار واقعے کے بارے میں نہیں جانتے۔“ میں نے باباجی کی طرف دیکھا اور ان کو بتایا کہ میں یہاں کا ہی رہنے والا ہوں مگر اس واقعے سے نا آشنا ہوں جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

”بیٹاؤ! گا میں تمہیں سب کچھ جنازہ بڑھنے کے بعد۔“ باباجی نے کہا اور ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ میرے دماغ میں یہ الفاظ بار بار برقی لہروں کی طرح چکر کاٹتے رہے ”پر اسرار واقعہ“۔ بے چینی تو پہلے ہی تھی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہم چلتے گئے اور قبرستان پہنچ گئے۔ ساتھ میں ہی جنازہ گا رہی۔ میت کو جنازہ گاہ میں رکھ دیا گیا۔

”باباجی! آپ نے مجھے اس عورت کے بارے میں نہیں بتایا؟ آپ میرے ساتھ کلینک پہ چلیں۔“ باباجی راضی ہو گئے اور ہم کلینک پر آ گئے۔ میری کو لیک پہلے سے موجود تھی۔ میرے کہنے پر چائے منگوائی گئی۔ اب میں باباجی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”باباجی اب بتائیں یہ عورت کون تھی؟“ باباجی نے گہری سانس لی اور کہنے لگے۔

”بیٹا! یہ اک عجیب وغریب سی کہانی ہے۔“ اتنا ہی کہا تھا کہ چائے آ گئی اور باباجی نے اپنی بات جاری رکھی۔

جب جنازہ پڑھایا گیا تب معلوم پڑا کہ یہ عورت می۔ تدفین کے بعد باباجی میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اک حیرت کا جھٹکا اور لگا اُس عورت کی قبر عام قبروں سے مارٹ لکھی تھی۔ لگتا تھا ۹ یا ۱۰ فٹ لی لمبی قبر تھی۔ یہ چیز کے اور حیرت کی وادیوں میں لے گئی۔ سب لوگ واپس ہارے تھے اور ہر کوئی اک دوسرے سے گوشیاں کر رہا تھا۔ مجھ پر حیرت کے در پچھلتے گئے۔ باباجی نے کہا۔

”بیٹا! تم شہر میں کہاں رہتے ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اپنا نام اور کلینک کا ایڈریس بتا دیا۔ وہ میرے ابو کے پرانے دوست نکلے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ

”کیکنہ کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ کیکنہ دو بھائیوں سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ سب گھر والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی پرورش تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا گیا۔ لاہور کے ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں کیکنہ کو داخل کروایا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ ہر سال اپنی کلاس میں ٹاپ کرتی تھی۔ اس کی کزنیں اس سے جلا کرتی تھیں۔ کیکنہ کو اس بات کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں مکمل طور پر

اک لمبا عرصہ سعودی عرب میں گزار کر آئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہ سکتے تھے۔ کیونکہ جب انہوں نے مجھے دیکھا میں ایک سال کا تھا۔ باباجی میرے ساتھ جلتے جلتے روڈ تک آ گئے تھے۔ باباجی مجھ سے اجازت لے کر کہنے لگے۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی اب مجھے اجازت دو میں باقی لوگوں کے ساتھ واپس جاؤں۔“ لیکن میں نے ان کو روک لیا اور کہا۔



مگن تھی۔ اسکول سے ٹیوشن اور رات کو بھائیوں کے ساتھ بارک جانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ سیکنہ زندگی خوشگوار انداز میں جی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیکنہ نے میٹرک میں ٹاپ کیا تو اس کے سب گھر والے بہت خوش ہوئے۔ سیکنہ نے اس خوشی کے موقع پر بڑی دعوت کی خواہش ظاہر کی۔

اس کے والدین راضی ہو گئے۔ اس پارٹی میں سیکنہ کی تمام سہیلیاں، اساتذہ اور رشتے دار شامل تھے۔ دونوں بھائیوں نے بھی اپنی لاڈلی بہن کو قیمتی تحائف دیے۔ وہ دن بھی آگیا جس دن پارٹی تھی۔ سیکنہ کی سب کزنیں اس کی یہ کامیابی دیکھ نہ سکیں۔ اور حسد کی آگ میں اس قدر جھیلیں کہ سیکنہ کی ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔

پارٹی کے روز جب سیکنہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اس کی اک کزن سب کے لئے مشروب لائی اور ایک خاص گلاس سیکنہ کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ جسے سیکنہ نے خوشی سے لپی لیا۔ اس کی کزن کے چہرے اور آنکھوں میں اک چمک نے اٹھرائی لی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے مقصد کی تکمیل ہو گئی ہو۔ پارٹی ختم ہوئی اور سب مہمان جا چکے تھے۔ رات کو سیکنہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اس کے سر میں بڑا سخت چکر آیا اور وہ اک جھٹکے سے زمین پہ جا گری۔ دونوں بھائیوں نے جلدی سے اسے اٹھایا اور کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا۔ ایک نے ڈاکٹر کو فون کیا۔

ڈاکٹر جلدی سے دوڑا دوڑا آیا۔ چیک کرنے پر اس نے بتایا ”زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔ سر میں چکر آیا ہے تھکان کی وجہ سے آرام کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر تو سب کو مطمئن کر کے جا چکا تھا۔ سیکنہ کی طبیعت کچھ نارمل تھی۔ لیکن جو انہونی ہوئی تھی وہ تو ہو ہی چکی تھی۔ کزن کا پلایا ہوا مشروب اپنا کام کر چکا تھا۔ رات گئے سیکنہ کو اس قدر گرمی محسوس ہوئی کہ برداشت نہ ہو سکی۔ حالانکہ کمرے میں اسے سی لگا ہوا تھا۔ گرمی اتنی بڑھ گئی کہ سیکنہ کے پسینے چھوٹنے لگے۔ بے چینی بڑھتی گئی۔ سیکنہ نے فوراً نہانے میں عافیت بھی۔ وہ نہانے چلی گئی۔ نہاتے وقت اس کے بال ہاتھوں میں آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے

سارے بال جھڑ گئے۔ اس کا سر بالکل گنجا ہو چکا تھا۔ اس کی چھینٹیں سن کر اس کی امی کمرے کی طرف بھاگیں۔ واش روم کا دروازہ کھولتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ بہت مشکل سے سیکنہ کی امی نے خود پہ قابو پایا۔ سیکنہ زور زور سے روئے جاری تھی۔ امی نے اُس کو سلی دی اور کپڑے پہنا کر کمرے میں لے آئیں۔

☆.....☆.....☆

اُس کی حالت دیکھ کر گھر کے سب لوگ بے حد پریشان تھے۔ سیکنہ کو اک چپ سی لگ گئی۔ وہ سارا دن کمرے میں بند بس چھت کو ہی گھورتی رہتی تھی۔ ہوا میں وہ پتا نہیں کس سے باتیں کرتی تھی۔ اس کی اس حالت سے والدین اور بھائی بہت پریشان تھے۔ مقامی ڈاکٹر وں سے علاج کرواتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ کوئی شفاء یابی نہ ہو سکی۔ بہت سے آئٹمز استعمال کروائے لیکن مایوسی کا ہی سامنا رہا۔ اس کے بال واپس نہ لوٹ سکے۔ یہاں تک کہ اس کی یادداشت بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ پریشانی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ سیکنہ کے والدین نے اب انگلینڈ سے علاج کروانے کا فیصلہ کیا۔ وہ سیکنہ کو لے کر انگلینڈ چلے گئے۔

کانی علاج کے باوجود نا اُمیدی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ وہ وطن واپس لوٹ آئے۔ سیکنہ کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کا علاج اب عاملوں سے شروع کروایا گیا۔ کوئی آئیوب کا سایا بتائے تو کوئی کہے اس پہ جن عاشق ہے۔ ہر عامل اس معصوم بچی پہ اپنے ہی قانون مسلط کرتا رہا۔ ہر در سے نا اُمید ہو کر وہ گھر بیٹھ چکے تھے۔ لیکن رب کریم کے در سے ان کو آج بھی شفاء کی اُمید تھی۔

☆☆☆

اک روز وہی کزن اور اس کے گھر والے سیکنہ کے گھر آئے۔ اس کے دل میں اب بھی ترس کا نام تک نہ تھا۔ کہنے لگی اک بہت بڑے بابا ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے علاج سے شفاء یابی ہو جائے۔“ سیکنہ کے والدین تو پہلے ہی ایسی خیاء کے متلاشی تھے کہ جس سے ان کی اندھیر نگری میں آجالا ہو سکے۔ سیکنہ کی امی نے اس سے اس بابا

کا ایڈریس پوچھا تو سیکنہ کی کزن نے کہا۔ ”میں نہیں ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان سے بات کروں گی۔“ اس کے دماغ میں اک اور شیطانی سوچھ لائی تھی۔

چند دن بعد وہ پھر آئی تو کہنے لگی۔

”آجی بابا نے کہا کہ اک بڑا سانا پ مار کر زمین میں دبائیں۔ اس پر سروسو لگائیں۔ جب وہ پک جائے تو اس کا تیل نکالو اور سیکنہ کے سر پہ لگائیں۔ بابا بتا رہے تھے کہ سیاہ لہے اور گھنے بال آئیں گے۔“

سیکنہ کی امی اس بے رحم کزن کی باتوں میں آ گئیں۔ انہوں نے اک بہت بڑا سیاہ سانا پ منگوا کر اپنی زمینوں میں دفن کروا دیا۔ اب اس پر سروسو لگائی گئی۔ ڈوبتے کو تھکے کا سہارا۔ یہی حال اب سیکنہ کے والدین کا تھا۔ وہ اپنی جان، اپنی بیٹی کو ہر حال میں ٹھیک دیکھنا چاہتے تھے۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے دن ختم ہوئے۔ سروسو کا تیل نکلا اور سیکنہ کے سر پہ لگایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لمبے اور سیاہ بال آنے لگے۔ جو تیزی سے بڑھنے لگے۔ بالوں کے بڑھنے کی تیزی دیکھ کر سب حیران تھے۔ اس دوران سیکنہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں اس قدر درد تھا کہ جیسے ہر بندہ اندام کو کانٹوں پہ لٹا کر کھینچا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بال پورے بیڈ پر پھیلنے لگے۔

حیران کن بات یہ کہ اسکے بال آگے سے دو شاخہ ہوتے گئے۔ پھر وہ پنپو لیے بنتے گئے۔ ان پنپولیوں کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح جل رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر سب پہ خوف و ہراس اور سکتہ طاری ہو گیا۔ انہی پنپولیوں نے سیکنہ کے بدن کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز، چیخ و پکار اس قدر دردناک تھی کہ کوئی بڑے سے بڑے دل والا بھی اس دردناک آواز کو نہ برداشت کر سکے۔ سیکنہ کی چھینٹیں بلند ہوتی گئیں۔ اب تو محلے والے بھی کوٹھی میں جمع ہو گئے۔ یہ ہولناک منظر کوئی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کچھ لوگ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ لوگوں پہ ایسا سکتہ طاری ہوا کہ دیر تک وہ کچھ نہ بول سکے۔ چند گھنٹوں بعد یہ قیامت تھی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سب لرز کر رہ گئے۔ کمرے میں

ہر طرف بال ریشما ہو کر اُڑ رہے تھے۔ سیکنہ کا مکمل جسم بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کے پاؤں اُٹے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کی جگہ پنپو لیے نمودار ہو چکے تھے۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سیکنہ کے والدین بے ہوش ہو گئے اور اب وہ کومہ میں ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ یہ ان کا آبائی قبرستان ہے۔ اس لیے میت کو یہاں لایا گیا ہے۔ یہ خبر تیزی سے پھیل گئی۔

یہ جہوم بھی سیکنہ کو دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا ہے۔ مگر ان کو روک دیا گیا۔ جب اس کا سر ہی نہ تھا تو لوگوں کو کیا دکھاتے۔

کہانی سننے وقت مجھ پہ بھی سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ میرا ہاتھ چائے کے کپ سمیت ایک جگہ جامد تھا۔ بابا جی مسلسل روتے ہوئے اور اس معاشرے کے حاسد لوگوں کو بددعا میں دے رہے تھے۔ بابا جی نے بتایا کہ قبر پانچ فٹ بنائی تھی۔ تدفین کے بعد وہ دس فٹ کی ہوئی۔ اس بات سے بابا جی اور میں حیرت زدہ تھے۔ جانے اس میں کیا راز ہے۔ مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مجھے وہ رہ کر سیکنہ کی کزن پہ بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟ سیکنہ نے اس کا کیا گڑا تھا؟ بہت سے الجھن میں ڈالنے والے سوالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔

بابا جی نے بتایا کہ وہ ان کی بھانجی تھی۔ جس کزن کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ سیکنہ کے بھائی نے اسے گولی مار دی۔ اب وہ قیل میں ہے۔ میں نے بابا جی کو حوصلہ دیا۔ ان کے آنسو صاف کئے۔ چند منٹ بعد انہوں نے مجھ سے اجازت لی۔ پھر وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ لیکن میں دیر تک سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن رہا۔ کچھ دن بعد بازار میں بابا جی سے اتفاق ملاقات ہوئی۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سیکنہ کے والدین بھی اس دنیا سے پروہ کر گئے ہیں۔ سیکنہ کے ایک بھائی کو سزا موت ہو گئی۔ دوسرا ان تمام غموں کی مالا گلے میں پہنے زندگی کے پہنے کو آگے دھکیل رہا ہے۔

اک بار پھر سے سوالات نے میرے ذہن کا حصار باندھنا شروع کیا۔ ایک لڑکی کی وجہ سے کتنی زندگیاں برباد ہوئیں.....؟

☆☆☆.....☆☆☆



تیسری خوفناک کہانی

تمہارے ساتھ ساتھ!

نازیہ بتول رضا

ان جنات کا قصہ خاص جوانوں کے دوست بن کر رہنا چاہتے تھے

اُس وقت رات کے دس یا ساڑھے دس کا عمل رہا ہوگا۔ لائٹ حسب معمول نہیں تھی۔ میرے دونوں بیٹے سات سالہ احمد اور پانچ سالہ اسجد سو رہے تھے۔ جبکہ دونوں بڑی پچیاں دادی کے ساتھ برابر والے کمرے میں سو رہی تھیں۔ چونکہ بچے صبح اسکول کی وجہ سے جلدی سو جاتے تھے اور میں رضا (شوہر) کے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔

میں بیڈ پر لیٹی تاراج کی روشنی میں 'بچی کہانیاں' پڑھ رہی تھی۔ یہ میرا اب بھی معمول ہے کہ میں دوپہر میں سونے لیٹوں یا رات میں میرے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ میری کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی کہ میرے دونوں بیٹے سو رہے تھے کہ ایک دم احمد بڑبڑاتا اور روتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ وہ نہ جانے کس کو دیکھ رہا تھا۔ ہوش میں بالکل نہیں تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

"احمد کیا ہو بیٹا سو جاؤ۔" میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا جو نہ جانے کہاں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا ڈرا ڈرا سا ہورہا تھا۔ میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک روتے روتے بولا۔

"ماما..... ماما یہ اتنا لمبا کیسے ہو گیا؟" میرے تو

ہوش اڑ گئے نہ جانے اسے کیا نظر آ رہا تھا، بہر حال میں نے اس پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کیا اور لٹا دیا۔ وہ فوراً ہی گہری نیند میں چلا گیا، جیسے اٹھا ہی نہ تھا لیکن میری نیند اڑن چھو ہو چکی تھی۔ کیونکہ یہ آج پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ جب سے میں اوپر شفٹ ہوئی تھی احمد بھی بکھار ڈر کے اٹھ جایا کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس پر دم کر کے سلا دیا تھا۔ لیکن اب تو وہ مستقل ایک ہفتے سے برابر دس سے گیارہ کے درمیان اٹھا کرتا تھا اور پھر میرے دم کرنے پر چپ چاپ سو جایا کرتا تھا۔ جیسے کہ آج ہوا تھا۔ میں بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔

رضا بھی اب تک نہیں لوٹے تھے۔ میں نے فوراً رضا کو فون ملایا۔ رضا نے بھی اُسی وقت ریوکیا۔ رضا کی آواز سنتے ہی میں رونے لگی اور انھیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے احمد کے ڈر کے بارے میں جب بھی بتایا وہ ٹال گئے اور مجھے بھی یہ کہتے ہوئے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں بچے اکثر خواب میں ڈر جاتا کرتے ہیں۔ تم آیت الکرسی پڑھ کر دم کر دیا کرو۔"

"لیکن کب تک؟" میں نے رضا سے کہا۔ "پلیز

آپ اس بات کو معمولی نہ سمجھیں بلکہ احمد کے لیے کوئی ارے بچاؤ کا تھوپ لائیں۔ یا احمد کو کسی اچھے بابا کو دکھائیں۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ یہ کام آپ کو آج اور ابھی کرنا ہے۔"

"اچھا بابا ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر رضا نے فون رکھ دیا۔

میں احمد کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت پرسکون سو رہا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

مجھے یاد ہے جب ہم سرجانی ٹاؤن والے گھر میں شفٹ ہوئے تھے تو ماموں سر نے بتایا تھا کہ ان گھر میں جنات کی پوری فیملی رہتی ہے۔ لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں بھی کہ شاید انھوں نے مجھے ڈرانے کے لیے ایسا کہا ہے لیکن اب جبکہ یہ سب ہو رہا تھا تو کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ میں کیا کروں کہ رضا کی کال آگئی وہ بولے۔

"نازیہ میں نے ابھی ایک دو لوگوں سے معلوم کیا ہے۔ ایک دوست نے مجھے حافظ صاحب کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ تھوڑا بہت علم بھی جانتے ہیں اور فی سبیل اللہ دم وغیرہ کرتے ہیں۔ میں ابھی ان ہی کے

گھر جا رہا ہوں۔ ان کو لیتا ہوا آتا ہوں، ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رضا نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے تسلی دی تو مجھے کچھ سکون ملا کہ اب احمد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد گیت بجا، میں نے تک آئی لائٹ بجھی آچکی تھی۔ گیٹ ماموں نے کھول دیا تھا۔ جو بچے نانی ساس کے ساتھ رہتے تھے۔ رضا گھر میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ کوئی تھا۔ میں جلدی سے بچوں کو کمرے میں چلی گئی۔ رضا حافظ صاحب کو لے کر بیڈروم میں چلے گئے۔ جہاں احمد سو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد حافظ صاحب کی تلاوت کی آواز آنے لگی۔ وہ دہمی آواز میں پڑھ رہے تھے اس لیے سمجھ نہیں سکی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی جھانک رہی تھی کہ کیا ہوتا ہے۔

"حافظ صاحب نے کہا تھا کہ اگر جنات کا کچھ اثر ہوگا تو بچہ اٹھ بیٹھے گا ورنہ نہیں۔" اور قاری صاحب کے تلاوت کرنے سے احمد اٹھ بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب مسکرانے لگے۔ انھوں نے شفقت سے



احمد کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دوبارہ سلام دیا۔ وہ پھر سے پرسکون ہو کر سو گیا۔ جبکہ حافظ صاحب رضا کو لے کر باہر چلے گئے۔ میں بیڈروم میں گئی۔ احمد سو رہا تھا۔ میں بے چینی سے رضا کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ رضا جب واپس آئے تو مجھے زیادہ فکر مند نہیں لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو دھیرے دھیرے بتانے لگے۔

”ہمارے بیڈروم میں ایک جنات کی فیملی رہتی ہے۔ ان کا ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ یہ فیملی مسلمان ہے اور اچھی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں انھوں نے بھی پریشان بھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ڈرا یا دھمکا یا۔“

پھر تائیدی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے میکائی انداز میں سر ہلایا تو وہ پھر بتانے لگے۔

”در اصل وہ بچہ تھوڑا شرارتی اور کھیل کود کا شوقین ہے اور وہ ہمارے احمد کو دوست بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے جب احمد رات کو سوتا ہے تو وہ کھیلنے کے موڈ میں احمد کے پاس آتا ہے اور اسے جگا دیتا ہے۔ جبکہ احمد ڈر جاتا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ صبح اٹھ کر احمد سب بھول بھی جاتا ہے اور اسے رات کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

رضا پوچھنے لگے تو میں نے بتایا کہ میں جب احمد سے صبح پوچھتی ہوں کہ رات میں ڈر کیوں اٹھے تھے۔ تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ نہیں ماما میں تو رات میں نہیں اٹھا، تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں کہیں یہ بچہ ہمارے احمد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ میں نے ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ صرف کھیلنے کی غرض سے آتا ہے۔ بہر حال یہ حافظ صاحب نے احمد کے پینے اور نہانے کے تعویذ دیے ہیں۔ یہ تعویذ پینے کے ہیں۔ یہ پینے کے پانی میں ملا دو اور یہ تعویذ نہانے کے ہیں۔ احمد کو ایک تعویذ روز پانی میں ڈال کر نہلانا ہوگا اور ہاں یہ ایک تعویذ احمد کے گلے میں موم جامد کر کے ڈالنا ہے۔ تم ذمہ داری سے صبح سے سارے کام کر لینا اور پریشان مت ہونا۔ جب ہم انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے تو وہ بھی ہمیں کوئی

تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی سی مخلوق میں سے وہ بھی ہیں۔ اب سکون سے سو اوکے!“

رضانے لمبی تقریر کے بعد کہا تو میں سونے لگی۔ لیکن ذہن مختلف خیالات کی آجگاہ بن رہا تھا۔ پھر صبح اٹھ کر میں نے پینے کے پانی میں تعویذ ڈالائے جب اسکول سے آئے تو میں نے احمد کو تعویذ کے پانی سے نہلایا اور اس کے گلے میں تعویذ بھی ڈال دیا۔ سارا دن گزر گیا پھر سے رات ہو گئی۔ سب سو گئے۔ میں اور رضا، احمد کے لیے جاگتے رہے۔ وہ بچے کے بعد ہم چوکنے ہو گئے تقریباً گیارہ بجے احمد اٹھ بیٹھا اور روتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ وہ نجانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ رضا اور میں تیار تھے میں نے جلدی سے احمد پر آیت الکرسی پڑھ کر چھوٹی اس کو پکڑ کر لایا تو وہ پرسکون ہو کر سو گیا۔ جیسے اٹھائی نہ تھا۔ میں پریشان نظروں سے رضا کو دیکھنے لگی۔ رضانے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تلی دی اور سونے لیٹ گئے اور مجھے بھی سونے کی تاکید کی۔ میں بہت دیر تک جاگتی رہی۔ ایک عجیب سا احساس تھا کہ ہمارے کمرے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی فیملی رہتی ہے کہ وہ بھی جنات کی فیملی..... اور ایک جن زادہ میرے بچے سے دوستی کرنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ یہ سب روکنے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن میں اپنے خدا کی ذات سے مطمئن تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ غلط نہیں ہونے دے گا۔ میں ہر نماز کے بعد بچوں پر دم کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ہم سب محفوظ تھے۔ انہی سوچوں میں نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

خواب میں دیکھا کہ میں اور احمد ایک ویران سی جگہ پر ہیں کہ دو میاں بیوی اور ایک چھوٹا بچہ میرے سامنے آتے ہیں۔ بچہ تقریباً ڈیڑھ سال کا ہے۔ باؤنسر میں لیٹا ہے۔ ان تینوں کا قد بھی چھوٹا ہے۔ بچہ اچانک اچھل کر باپ کے کاندھے پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں تو اب بچے کی ماں بڑے پیار

اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بتاتی ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے اور یہ بہت شرارتی ہے۔ ہر وقت کھیلنا چاہتا ہے۔ ان ہم آپ کو بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

میری ایک دم آنکھ کھل گئی گو کہ خواب ڈراؤنا تھا لیکن میں دہل کر رہ گئی تھی۔ میں نے چاروں جانب نظر گھما کر دیکھا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے بچوں کے ماتھے پر پیار کیا تو بے حد سکون ملا۔ اللہ پاک نے ماما بھی کیا چیز بتائی ہے۔ تکلیف پہنچے کو ہوتی ہے اور نیند ماں کی اڑ جاتی ہے۔ کاش بچے کی بڑے ہو کر ماں باپ کا ایسے ہی احساس کریں، میں نے صدق دل سے کہا اور مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔ صبح فجر میں گزرا کہ اللہ پاک سے اپنے شوہر اور بچوں کی سلامتی مانگی جو میرا معمول تھا۔ پھر بچوں پر دم کیا اور اسکول جینے کی تیاری کرنے لگی۔

بچے جب معمول کسماتے ہوئے اٹھے اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگے پھر بچوں کے جانے کے بعد میں نے بچن وغیرہ سمیٹ کر رضا کو اٹھایا۔ رضا نے اٹھتے ہی پوچھا۔

”بچے اسکول چلے گئے۔“

”جی۔“

”رواتے ہوئے تو نہیں گئے۔“ یہ ان کا روز کا سوال تھا۔

”نہیں۔“ پھر میں مد سے پر آئی۔ ”رضانے نے خواب میں اس فیملی کو دیکھا جو ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہتی ہے۔“

رضا چوکنے ہوئے بولے۔

”اچھا کیا دیکھا؟“

میں نے خواب من وعن سنایا تو رضا مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگے اور بولے۔

”میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ اب تو مطمئن ہونا۔“

”جی لیکن رضا وہ سب بہت خوب صورت تھے، چھوٹے قد کے تھے۔ لیکن روشن چہرے والے تھے۔“

”اصل میں وہ تمہارے خواب میں اپنے اصل

چہرے کے ساتھ تو نہیں آئے ہوں گے۔ ورنہ تم ڈر جاتیں اور وہ مسلمان ہیں اسی لیے ان کے چہرے روشن ہیں۔“

”ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”اچھا اب چلو جلدی سے ناشتا وغیرہ بناؤ میں تب تک نہا کر تیار ہو جاؤں۔“ رضا اٹھتے ہوئے بولے۔ میں مطمئن انداز میں بچن میں چل دی۔

☆☆☆

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ احمد رات میں کبھی اٹھتا میں دم کر کے دوبارہ سلا دیتی۔ وہ بے خبر سو جاتا اور صبح اسے کچھ یاد نہ ہوتا۔ میں دوپہر میں بچوں کو سلائے لٹاتی، چھوٹے اجد کو عادت تھی کہ میں جب تک اس کے پاس نہ لیٹ جاؤں وہ سوتا نہیں تھا اور اب تک اس کی یہی عادت ہے۔ ہاں تو میں اجد کو سلا رہی ہوتی سلائے کے بعد لاؤنج میں جاتی تو احمد اکیلا بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا ہوتا۔ میں سمجھ جاتی کہ یقیناً وہ بچہ بھی احمد کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔ میں سارے کھلونے سمیٹ کر احمد کو سلائی لیکن پھر لاؤنج میں آتی تو کھلونے مجھے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ میں پھر سمیٹ دیتی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں حسب معمول صبح سویرے اٹھی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو لاؤنج سے باہر کرسی پر نظر پڑی۔ میں ہکا بکا کرسی کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ ہمارے پورٹن میں دو کمرے اور لاؤنج کے بعد ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی جسے ہم رات میں ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے بطور محن استعمال کرتے تھے۔ اس میں ایک چھوٹا سا پلنگ اور ایک کرسی رکھی تھی، پھر جب ڈسٹلی پھیلا تو رضانے بچوں کی حفاظت کے خیال سے پورا کھلا حصہ نیٹ سے ڈھک دیا تھا کہ اس میں جھری کے برابر بھی جگہ خالی نہ تھی اور اب میرے سامنے کرسی پر بہت سارا تار کول پڑا تھا۔ تار کول سے بھری ڈسٹلی تھی جو کرسی پر لپیٹی ہوئی پڑی تھی۔ میں حیران تھی کہ اس تار کول کو دیکھتی اور کرسی گرین جالی کو جس کے اندر سوراخ برابر بھی جگہ نہ تھی۔ میں حیران تھی کہ یہ تار کول آیا کہاں سے؟ جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں رات کے

ایک بجے تک اسی کرسی پر بیٹھ کر رضا سے باتیں کر رہی تھی اور جب تک میں سوئی بھی ایسا کچھ نہیں تھا، یہیں قریب روڈ بھی نہیں بن رہا تھا پھر آخر یہ تارکول آیا کہاں سے۔ میں نے گھوم گھوم کر سب جگہ سے دیکھ لیا لیکن یہ تارکول کامعد صل نہ ہوا۔ پھر بچے اٹھے وہ بھی اسے غوبے کی طرح دیکھنے لگے۔

”ارے ماما یہ کیا چیز ہے؟“ احمد کو تجسس ہوا۔
”تارکول ہے بیٹا اسے چھوڑو آپ تیار ہو جاؤ جلدی سے۔“

”یہ کیا ہوتا ہے ماما۔“

”ارے بیٹا اس سے سڑک بنتی ہے جس پر گاڑیاں چلتی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”اچھا تو یہ ہمارے گھر میں کہاں سے آیا؟“ احمد جیسے بال کی کھال نکالنے پر تلتا تھا اور باقی سب بھی معلومات میں اضافے کے لیے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔
”بیٹا آگیا ہوگا کہیں سے کسی بچے سے کھیل کھیل میں ہمارے گھر میں پھینک دیا ہوگا۔“ میں نے بچوں کو ٹالا۔

”لیکن ماما کہاں سے ہمارا گھر تو سب طرف سے بیک ہے۔“

میرے ذہن میں مچلتا ہوا اب بچوں کی زبان پر تھا۔ میں کیا جواب دیتی بڑی مشکل سے جان چھڑوائی پھر بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد نیچے ماموں سے پوچھا۔

”کیا آپ تارکول لائے ہیں گھر میں؟“
تو وہ بولے۔ ”نہیں بیٹا میں کیوں لاؤں گا۔“
اب تو میرا دماغ گھوم گیا۔ پھر میں نے اوپر بلا کر انھیں کرسی پر بڑا تارکول دکھایا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ پھر کہنے لگے۔

”حیرت ہے یہ تارکول یہاں کیسے آیا ہمارے گھر سے دو اسٹاپ دور سڑک تعمیر ہو رہی ہے وہاں تک تو گلی کے بچے بھی نہیں جاتے ہوں گے۔“ وہ حیرت میں ڈوبے بیچھے چلے گئے اور میں سمجھ گئی کہ ہونہ ہو یہ بھی ہمارے گھر میں رہنے والے بچے کی کارستانی ہے۔ میں سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

”ارے رضا نے مجھے تسلی دی۔“

”ارے نازیہ تم ایک بچے سے ڈر گئیں، یقیناً وہ تمہارے پاس سونے آیا ہوگا لیکن تم ڈر گئیں تو اسے جانا پڑ گیا۔“ رضا ہنسی میں اڑا رہے تھے۔
”میرا مذاق اڑا رہے ہیں ابھی اگر آپ کے پاس آیا ہوتا تو پوچھتی۔“

”نہیں ابھی میرے پاس کیوں آئے گا۔ تم سے اتنی سی تمہارے ہی پاس آئے گا۔“
”اچھا چلو سو جاؤ میں صبح حافظ صاحب سے مشورہ کروں گا۔“

پھر میں نے خود پر اور بچوں پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کیا اور سو گئی۔
”عونیہ کا فائدہ یہ ہوا کہ احمد کے ڈر کر اٹھنے میں کمی آگئی تو میں بھی پرسکون ہو گئی۔“

☆☆☆

پھر کچھ عرصے بعد ہم نے وہ گھر شفٹ کر لیا۔ ہم دوسری جگہ چلے گئے تو رضا کہنے لگے۔
”یار میں سوچ رہا ہوں ذرا گھر کا چکر لگاؤں۔“ ہم تو شفٹ ہو گئے تھے لیکن نیچے کے پورشن میں نانی ماموں رہتے تھے۔ انھوں نے وہ گھر میں چھوڑا تھا۔ میں نے کہا۔

”ہاں ضرور جائیں اور ذرا اوپر کے پورشن (جو ہمارا تھا) میں بھی چکر لگاتے آئیے گا۔ وہاں اب کیا حالات ہیں۔“

رضا۔ اوکے، کہہ کر روانہ ہو گئے۔ تو میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد رضا واپس آئے میں نے خیر خیریت پوچھی تو کہنے لگے۔

”نازیہ ہمارے یہاں چلے آنے سے وہ لوگ بہت ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔“

”کون لوگ؟“ میں حیرانگی سے بولی۔
”وہی تمہارے پڑوسی جنات کی بیٹی۔“

”مگر کیوں؟ اور آپ کو کیسے پتا۔“ میں الجھ گئی تھی ان کی باتوں سے۔

”ارے ابھی میں ابھی گھر گیا تھا تو ماں اور خالہ بتا رہے تھے کہ جس دن ہم یہاں آئے ہیں اسی دن رات کو بہت شور شرابے سے خالہ کی آنکھ کھلی۔ اوپر ہمارے پورشن میں کوئی اٹھا بیٹھ کر رہا تھا۔ خالہ آواز سننے اور دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ نیچے لاؤنج میں گئیں تو ان کی الماری کے اوپر رکھا سارا سامان دھڑا دھڑا خود بخود نیچے گر گیا۔ جیسے کسی نے غصے میں پھینکا ہو۔ خالہ اور ماموں حیران تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد سکون ہو گیا۔“ رضا نے مجھے تفصیل بتائی تو میں ہکا بکا رہ گئی۔

”یقیناً وہ ہمارے شفٹ ہونے سے ناراض ہیں پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”کرنا کیا ہے۔“ رضا بولے۔ ”میں اوپر کے پورشن میں جا کر بول آیا ہوں کہ یہاں خالہ ماموں کو تنگ نہ کیا جائے بلکہ اگر ہمارے ساتھ رہنا ہے تو میرے ساتھ چلیں جہاں میں رہتا ہوں آپ لوگ بھی وہیں میرے ساتھ رہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے وہ آئے ہوں گے آپ کے ساتھ؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہاں تو کیا مضائقہ ہے اگر وہ آج بھی جائیں تو انھوں نے بھی ہمیں نقصان نہیں پہنچایا بلکہ بقول حافظ صاحب کے وہ ہمیں فائدہ ہی پہنچائیں گے کیونکہ وہ ہم سے خود دوستی کرنا چاہتے ہیں۔“

رضا ٹھیک ہی کہہ رہے تھے انھوں نے کبھی ہمیں تنگ نہیں کیا تھا بلکہ شاید آئندہ وہ کچھ فائدہ ہی دے سکتے تھے۔

”چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“
اور پھر دوسرے دن جب میں احمد کو اسکول کے لیے اٹھانے لگی تو احمد نے نیند میں مجھ سے کہا۔

”ماما تین لوگ ہمارے گھر میں آ گئے ہیں۔“

میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کس کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔“ اور بچوں کو اسکول بھیجنے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆



دوسری دنیا کا آخری عشق!

منعم اصغر

اس دوشیزہ پر بچپن ہی میں ایک جن عاشق ہو گیا تھا کروہ.....

گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ابو گاؤں میں ہی کھیتی باڑی کرتے تھے۔

میں جس گاؤں میں پیدا ہوئی۔ وہاں یہ بات زبان زد عام تھی کہ اس گاؤں میں جنات کا بسیرا ہے اور جس بستی میں، میں رہتی ہوں۔ وہاں بھی تقریباً ہر دوسرے بندے پر جنات ہیں۔ خیر ہماری بستی کچھ توڑا دور مٹی سے بنی ایک کوچی تھی۔ جس میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جو مٹی سے بنا ہوا تھا اور ہمیشہ بندی رہتا تھا۔ اس کے ارد گرد اینٹوں کی دیواریں تھیں اور وہاں کسی کوچی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بڑوں کا کہنا تھا کہ وہ جگہ بھاری ہے اور وہاں کسی بُرے سائے کا بسیرا ہے۔ اس لیے وہاں کوئی عورت تو کیا رات میں مرد بھی جانے سے ڈرتے تھے۔ وہ جگہ دن میں بھی بہت پُر اسرار لگتی تھی۔ بستی سے توڑا دور کھیتوں میں وہ کوچی واقع تھی۔ ارد گرد کھیت اور درمیان میں وہ کوچی..... اس کے قریب ہی ایک بڑا اور گھٹا سا درخت جسے دیکھتے ہی روکنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جس زمین پر وہ کوچی اور درخت تھا اس زمین کا مالک کئی بار اس کوچی کو ختم کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر کوئی بھی وہ کوچی توڑنے اور درخت کاٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جب اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح ہی یہ آج بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کسی نے اسے گہری غند سے زبردستی جگایا ہو۔ اس نے ہاتھ سے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور آہستہ سے اٹھ کر باب کا پتھر دبا یا۔ پل بھر میں پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی جو کہ باہر کی طرف کھلتی تھی اور وہاں سے کھیت صاف نظر آتے تھے۔ اس نے وہاں نظر ڈالی تو وہ کھلی ہوئی تھی اور اسی لمحے اُسے ایک تاریک سایا اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کانپتے ہونٹوں کے ساتھ درود شریف اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

☆☆☆

میرے ساتھ یہ پہلا بار ہرگز نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں پندرہ سال کی تھی اور نیم جماعت میں پڑھتی تھی۔ میرے دو بھائی اور ہم دو بہنیں تھیں۔ میں ذریعہ غازی خان کے ایک قریبی



سی ہوا چلی، اور اس درخت کے پتے زور سے پھڑپھڑائے، اس آواز پر سب نے اوپر دیکھا اور سب ہی خوف سے لرز گئیں۔ اس طرف تو کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ ہم آخر کہاں بیٹھے ہیں۔ پھر سب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یک دم بھاگنا شروع کر دیا اور ان سب میں، میں سب سے زیادہ خوف زدہ تھی اور پوری جان لگا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک دم زور سے گری اور پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اگر میں ابھی بھی وہاں ہوتی تو مر چکی ہوتی مگر پھر جو میں نے سنا میرے ہوش اڑ گئے۔

”اسماء تمہیں پتا ہے تم پورے دو دن بعد ہوش میں آئی ہو۔ ہم سب کتنے ڈر گئے تھے۔ جب تم بے

زکریا مارمولوی کو بلا کر وہاں قرآن مجید پڑھا کر اس سائے کو ختم کروانے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر قرآن مجید شروع کرتے ہی وہاں سے ایسی خوفناک آوازیں آنا شروع ہو جاتیں کہ روح تک کانپ اٹھتی تھی، سو وہ آج تک اسے ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے تھے۔ خیر مجھے بھی وہاں جانے سے منع کیا گیا تھا اور میں وہاں جاتی بھی نہیں تھی۔ مگر میری قسمت مجھے وہاں تک لے گئی۔

☆☆☆

اس دن عید کا دن تھا اور ہم خوب تیار تیار ہو کر، خوشبو لگا کر باہر سیر کو نکل پڑے۔ میرے ساتھ میری بہن اور گاؤں کی لڑکیاں بھی تھیں۔ ہم کھوتے کھوتے پتا نہیں کیسے اس جگہ پہنچ گئے تھے۔ مگر کسی نے دھیان ہی نہ دیا اور ہم اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران ہم نے جو مونگ پھلیاں لے رکھی تھیں، وہ سب ختم ہو گئیں اور پھر ہلکی

ہوش ہو گئی تھیں تو میں بھاگ کر گھر سے ابواور ماموں کو بلالائی تھی مگر ہم وہاں پہنچے تو تم زمین کی بجائے اوپر درخت پر لگی ہوئی تھیں اور اب ہوش میں آ رہی ہو۔“ یہ سب سن کر میں بہت ڈر گئی تھی۔ مگر پھر سب مجھے خوش رکھتے تو میں بھی یہ سب بھولی چلی گئی۔

☆☆☆

اس کے بعد کئی بار میں نے ایک کالا سیاہ سایا دیکھا تھا۔ جو میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس سے اندر آتا دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے کوئی ہر وقت میرے آس پاس موجود رہتا ہے اور پھر میں آہستہ آہستہ اس کی عادت ہوئی چلی گئی۔ تنہائی میں اس سے باتیں کرنے لگتی۔

”تم جو بھی ہو مجھے نظر تو نہیں آتے مگر مجھے پتا ہے کہ اللہ کا ایک خاص کرم ہے مجھ پر اس لیے تو تم ہر وقت میرے قریب رہتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔ ہمیشہ میرے پاس ہی رہنا۔“ میں بس ایسے ہی کہہ دیا کرتی تھی۔ کبھی یہ وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا تھا کہ میں اس سے باتیں کر کے اپنے لیے کتنی مشکلیں کھڑی کر رہی ہوں۔ میں تو یہ بھی نہ سوچتی کہ وہ ہے کیا؟ بس یہ سوچتی کہ میرا وہم ہے۔ پھر اصل حقیقت تو تب پتا چلی جب میں پندرہ سال سے بیس سال کی ہوئی اور میری شادی طے ہو گئی۔

☆☆☆

اس دوران میں بہت ہی خوش تھی مگر ایک رات وہ ہوا جو میں بھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

اس رات میں سوئی ہوئی تھی۔ رات کا تیسرا پہر تھا جب ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے وہ سایا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس رات پہلی بار مجھے اس سے خوف آیا تھا پھر وہ سایا آہستہ سے چلتا ہوا میرے قریب آیا اور میں سن ہو کر رہ گئی۔ اس دوران صرف مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ سایا انسانی شکل اختیار کر چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں جیسے اپنی مرضی سے بل بھی نہیں پارہی۔

پھر میں نے خود کو کہتے سنا تھا۔
”تم ہمیشہ سے میرے ساتھ رہے ہو اور میں صرف تمہاری ہوں صرف تمہاری۔“ پھر وہ اسی راستے سے باہر نکل گیا جیسے آیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میری طبیعت عجیب سی تھی، نہ کھانے میں دل لگا اور نہ ہی گھر کے کسی کام میں۔ پتا نہیں کیسے مگر اب مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ کچھ تو ہے میرے ساتھ اور میں نے یہ بات اب تک کسی کو بتائی بھی نہیں تھی۔ اگلی رات پھر وہی ہوا تھا مگر اب یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور پورے گھر کو میری کیفیت پتا چل گئی تھی۔

☆☆☆

اس رات بھی میں اپنے کمرے میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ سوئی تھی کیونکہ اب بقول اماں کہ تیری شادی ہونے والی ہے اس لیے اب انکی نہ سویا کر۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کھڑکی کھلنے کی آواز آئی اور میری دونوں آنکھیں کھل گئیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں ڈر سے کانپنے لگی۔ مگر میں آہستہ سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں وہ کونسی اور درخت دکھائی تو نہ دینے چاہیے تھے مگر وہ دونوں میں آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ میں آہستہ سے مڑی اور بنا پلکیں جھپکائے گھر سے باہر نکل کر کھیت کی طرف جانے لگی۔

اس کے بعد مجھے تو کچھ یاد نہ رہا مگر میری بہن نے بتایا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے کھڑکی سے مجھے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ سب کو جگا کر میرے پیچھے لے آئی۔ میں آہستہ سے اس درخت کے نیچے گئی اور اس کے گلے لگ گئی۔ گھر والے یہ دیکھ کر بہت ڈر گئے تھے۔ سب نے مل کر مجھے اتنا زور سے کھینچا۔ مگر پتا نہیں مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں ایک انچ نہ ہلی، پھر تھوڑی دیر بعد میں نے

میں پر بیٹھ کر زور سے ہنسی ہنسی بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھلی تو کچھ یاد نہ تھا مگر میرے جسم کی ٹڑی دل درد کر رہی تھی۔ صبح ہی ابو پیر جی کو بلالائے تھے۔ ان بابا کا نام تو مجھے یاد نہیں مگر وہ بہت ہی قابل ہستی تھے۔ پورا گاؤں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ خیر اسی صبح ظاہر ہو گیا کہ میرے اوپر کوئی سایا ہے۔ گھر والے بہت پریشان ہو گئے تھے اور میرے سرال والے جو کہ رشتے میں میرے پچو یا پچوئی تھے۔ وہ بھی بہت پریشان تھے اور جب تک یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ میرے اوپر کوئی سایا ہے۔ تب تک میں اتنی نہیں ڈرتی تھی مگر اب تو ہر موڑ پر میرے ساتھ ساتھ تھا اور اب میں پہلے جیسی اسا نہیں رہی تھی۔ اب تو میں کوئی سو سال کی ہزار بوڑھی دکھائی دینے لگی تھی۔ واش روم جاتی تو لاکٹ چلی جاتی، بچن میں جاتی تو دودھ و امیاں (والدہ) دکھائی دے لگتیں۔ پھر وہ پیر جی آئے اور انھوں نے بتایا کہ سادگی سے میرا نکاح کر دینا چاہیے مگر چونکہ پچوئی کو بھی سب پتا تھا اس لیے وہ بھی کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔ پھر ابو نے منت کی کہ میری جوان بیٹی ہے اس طرح برباد ہو جائے گی اور بالآخر پچو پو مان لگیں اور اس طرح جھڑپ کی شام کو میری سادگی سے نکاح کر کے رخصتی کر دی گئی۔

☆☆☆

کہا تو یہ گیا تھا کہ شادی ہوتے ہی مجھے تمام مسائل سے چھٹکارا مل جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ شادی کی پہلی رات جو کئی دعاؤں اور مرادوں کے بعد آتی ہے۔ شادی جیسے رشتے کے بارے میں سوچتے ہی دل میں الجھی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر میں جانتی تھی کہ کچھ تو ہوگا ہی اور پھر وہی ہوا۔

سہیل جو نہی میرے قریب ہوئے کیے بعد دیگرے تین پھپھران کے منہ پر پڑے تھے اور پھر ہر دفعہ ہی یہی ہوا۔ اس وقت مجھے خود سے زیادہ سہیل پر ترس آ رہا تھا۔

اگلی صبح پیر جی خود تشریف لائے تھے اور سب سنتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے اور اگلے دن

آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ آئے تھے تو ان کے ساتھ ایک اور بھی پیر تھے اور ساتھ میں کچھ گاؤں کے مرد بھی تھے۔ پیر جی نے مجھے کہا تھا کہ پانچ وقت کی نماز ادا کرنا۔ مگر پانچ وقت کی تو کیا میں تو ایک وقت کی نماز بھی نہ ادا کر پاتی تھی اور ہفت ہفت نہائی تک نہ تھی۔ اس دن پیر جی نے بہت مشکل سے مگر اس سائے کو قابو کر ہی لیا تھا اور انھوں نے اسے مجھے چھوڑنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا اور پھر اپنی اصل شکل میں آ گیا۔

لبے لبے اور کھڑے بال، بدنما چہرہ، بڑے بڑے دانت، جسے دیکھتے ہی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر پیر جی نے اُس سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میں نے اسے بچپن میں دیکھا تھا۔ عید کے دن اور تب سے میں اسے اپنا بھتیجا ہوں اور یہ بھی مجھ کو اپنا بھتیجا ہے اور تو میرا کچھ نہیں لگاڑ سکتا۔ میں اسے لے جاؤں گا یہاں سے اور تب تک نہیں جاؤں گا یہاں سے جب تک یہ ساتھ نہ چلیے گی۔“ ایک دم سے تیز تیز آندھی چلنے لگی مگر پیر جی نے شاید آج اسے ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے بولے۔

”اوہ اچھا تو اب جنوں کی بھی لوا سنوری ہونے لگی، خیر تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو یہاں سے چلا جا کیونکہ جائے گا تو تیرا باپ بھی۔ تو نہیں جانتا کہ میں کتنا خطرناک ہوں۔“ انھوں نے کہا اور کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔ پل بھر میں وہ آگ میں جلنے لگا۔

اس کی دردناک آواز سے کان پھٹنے لگے اور زور سے آندھی چلن تھوڑی دیر بعد سب کچھ صاف ہو گیا۔ پیر جی نے مجھے ایک تعویذ یاد دلائے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں اور پیر جی کو دعا دیتے نہیں بھکتی۔

اب تو اللہ کے کرم سے میرے دو بچے ہیں اور میں دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتی ہوں اور شپ میں کیسٹ لگا کر ہر روز سورۃ یسین کی پورے گھر میں تلاوت کرتی ہوں۔ اب پھر سے کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا اور نہ ہی اب ڈر لگتا ہے۔

☆☆☆

ہمارے اوپر والے پورشن جو بیڈروم ہے اس بیڈ کے نیچے ہر وقت ایک سوئی کالی سیاہ بی بیٹھی رہتی تھی۔ اس بی بی کو بھی کسی نے نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آتا نہیں دیکھا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اوپر کے میسر کا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند رہتی تھیں۔ اس بی بی نے اس بیڈ کے نیچے بھی کوئی گندگی نہیں کی، بس ہر وقت اس بیڈ کے نیچے بیٹھی ہوئی سب کو گھورتی رہتی تھی۔ اس کو بھگانے کی بھی بہت کوشش کی گئی پر وہ وہاں سے کس سے کس نہ ہوئی۔ عجیب سی پراسرار سی کشش تھی اس کی آنکھوں میں۔ مجھے ہمیشہ اُسے دیکھتے ہوئی لگتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر۔۔۔۔۔

☆☆☆

ایک دن ہمارے گھر میں دعوت تھی۔ رات جب سب مہمان چلے گئے تو میں اور ممانی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ٹی وی لاؤنج سے جالی اور گھر کی جانب میڑھیوں پر ممانی نظر تھی۔ ان کو اس طرف دیکھتے پا کر میری نگاہیں

اوپر میں وہاں گھنٹوں ایکلی کیلی رہتی۔ حالانکہ اس ممانے ڈانٹ بھی پڑی کہ نیچے رہا کرو میرے گھر میں ان کی باتیں اُن سنی کر کے ہر وقت اوپر میں کیلی رہتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اوپر میں کیلی تھیں ہوں اور بھی بہت سارے لوگ ہیں۔ اب میں کے دوران مجھے واش روم سے پانی گرنے کی آواز صاف سنا دی۔ جب میں جا کر واش روم میں پہنچی تو واش روم کے فرش کیلے ہوتے۔ صاف لگتا تھا کہ ان کو استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ اوپر کے واش روم بھی استعمال میں نہ تھے۔

ایک رات ایک بجے میں صحن میں بیٹھی تھی کہ صحن میں لگے درخت میں سے مجھے کسی کی آواز سنا دی۔ اس آواز پر غور کرتی ہوئی جوں ہی درخت کے پاس لی تو درخت میں سے بھاری اور تیز آواز میں سے کسی نے 'رباب' کہا۔ میں خوف سے بدحواس ہو کر اندر گھر کی جانب بھاگی۔



پانچویں خوں ناک کہانی

آٹھ کہانیاں اک کروار!

فرح انیس

کراچی سے ایک دو شیزہ کے ساتھ پیش آنے والی پراسرار انہونیائیں

اور پھر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتی۔

☆☆☆

اب ہم دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی۔ ڈبل اسٹوری پر بنا ہوا، بنگلہ میرے پاپا کو کافی پسند آیا تھا اور انھوں نے وہاں خریدا تھا۔ جس دن وہ ہمیں گھر دکھانے لے کر آئے، واقعی دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میری نگاہیں میں لگے نیم کے درخت پر پڑی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”بھوت بنگلہ“ جس پر میرے پاپا نے مجھے غلطی سے گھورا۔

وہ گھر کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ پر نبجانے کیوں مجھے اور میری ممان کو اس گھر سے دشت ہوتی تھی۔ ہمارے خوف کو دیکھتے ہوئے پاپا نے ہمارے ایک روحانی بزرگ کو بلوایا۔ انھوں نے پورا گھر دیکھا، قرآنی آیات کا نقش اوپر اور نیچے گھر میں لگوایا اور کہا۔ ”جو تھے ہم نے ان کو باندھ دیا ہے، پر آپ دھیان رکھیے گا۔“

ہم لوگوں کی رہائش نیچے گھر میں تھی، اوپر کا گھر بس سیٹ کیا ہوا تھا۔ مجھے اوپر والے پورشن میں زیادہ

میرا نام رباب علی ہے۔ مجھے شروع سے ہی پراسراریت میں دلچسپی رہی ہے۔ جہاں پر آسیب وغیرہ ہوتا ہے، مجھے خود بخود محسوس ہو جاتا ہے۔ میری زندگی میں بھی ایسے واقعات گزرے ہیں جن کا تعلق پراسراریت سے ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر سات سے آٹھ سال تھی۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے۔ وہاں ویسے تو سب کچھ ٹھیک تھا پر اکثر وہاں یہ میرے ساتھ ایسا ہوتا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد مجھے نیند میں محسوس ہوتا کہ کوئی میرا نام رباب کہہ کر پکار رہا ہو۔

میں آٹھ کر اپنے کمرے سے نکل کر میسر پر آ جاتی۔ ہمارے میسر سے سامنے کی جانب ایک گھر دکھائی دیتا تھا۔ جو نبجانے کب سے بند پڑا ہوا تھا۔ اس گھر کا ہمارے گھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں جب ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا، اس گھر سے مجھے اپنے نام کی پکار صاف سنا دی۔ جتنی اور میں کھڑی ایک ٹک اس پرانے گھر کی جانب دیکھا کرتی۔ جب تک وہ آواز آتی رہتی میں کھڑی رہتی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے میرے قدموں کو جکڑ لیا ہو۔ فجر ہوتے ہی آواز کا سلسلہ رک جاتا اور میرے قدم ڈھیلے پڑ جاتے



بڑی سیوں پر گئیں تو سیریلوں کے ساتھ دیوار پر ایک بچے کا سایا آتا دکھاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس پر ماما بولیں۔
”رباب بیٹا اوپر کوئی بچہ رہ گیا ہے۔ جاؤ لے کر آؤ۔“

اوپر جا کر میں نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا پر وہ مجھے بچہ دکھائی نہ دیا۔ اس ہی طرح ابھی ایسا ہوتا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کپڑے لاکر صوفے پر رکھو تو کپڑے ساتھ رکھے کپڑوں کے اسٹینڈ پر لٹکے دکھائی دیتے۔

☆☆☆

ہمارے بڑوں میں ایک بچی رہتی تھی۔ پانچ سے چھ سال کی۔ میں اکثر اس بچی کو اپنے گھر ملا لیتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی کہ میرا ایک دوست ہے جو میرے ساتھ کھیلتا ہے اور میرے ساتھ سب جگہ ہوتا ہے۔“

ایک بار میری ماما کو کام سے کہیں جانا تھا۔ میں نے اس بچی کو بلایا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ماما نے چاول بنائے تھے کھانے میں کہ تم دونوں کھا لینا۔ میں نے چاول بڑی پلیٹ میں نکال کے لے آئی۔ پہلا نوالہ لیتے ہی چاولوں میں تیز مرچیں لگنے لگیں۔ مجھے ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس بچی کے لیے کچھ اور بنالوں ایک تو اس میں اتنی تیز مرچیں ہیں کہ میں نہیں کھا پارہی تو یہ کیسے کھائے گی۔ اوپر سے وہ بچی کھاتی بھی بہت کم تھی۔ چاول کی پلیٹ دیکھ کر وہ میرے پاس آگئی اور مجھ سے کہنے لگی۔
”آپنی میرا دوست بھی کھائے گا کھانا۔“

مجھے اس کی بات پر زور سے ہنسی آگئی۔ میں نے شرارت سے کہا۔
”چلو بلاؤ اپنے دوست کو۔“ میرے کہنے پر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کسی کو بلایا۔ اس کے ہاتھ کے اشارے پر میں اس جانب دیکھنے لگی۔ پر مجھے اب بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچی اپنے برابر زمین پر ہاتھ مارنے لگی کہ یہاں بیٹھو۔ میں ابھی تک اس کی بات پر ہنس رہی تھی کہ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے چاولوں پر بچی نے ڈھیر ساری چٹنی ڈالی اور کچھ ہی لمحوں میں چاول کی پوری پلیٹ خالی کردی۔ میں جو ابھی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ اب گھبراہٹ ہوئی اس بچی کو دیکھ رہی تھی۔

اب وہ بچی میری میری طرف دیکھ رہی تھی کہ اور چاول دو۔ میرے دوست کو بھوک لگی ہے۔“
میں نے اور چاول دیے تو وہ بھی جلدی جلدی کھانے لگی۔ تیز مرچوں کی وجہ سے جن چاولوں کا وہ نوالہ مجھ سے نہیں لیا گیا وہ بچی اس کی دوسری ہاتھ کھا گئی تھی۔ اب میں چپ چاپ خوف میں گھر رہی۔ کوئی میں بیٹھی تھی اور وہ بچی پورے گھر میں پھر رہی تھی۔ مغرب کی اذان جیسے ہی شروع ہوئی وہ ہاتھ آگے بڑھا کر باری باری سب کو سلام کرنے لگی۔
میرے پاس آ کر وہ بولی۔
”آپنی سب کو سلام کرو۔“ میرے پاس کھڑی ہوئی وہ ہاتھ آگے بڑھا کر سلام کرنے لگی۔ میں لگ رہا تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ ملا رہی ہے۔ میں اس کی اس حرکت سے کافی دہشت میں آگئی تھی۔ وہ بچی غصے میں مجھ سے بولی۔
”آپنی! سلام کرو۔“ میری آنکھوں میں خوف دبے بسی سے آنسو آگئے تھے۔ میں ڈر کر بھاگتے ہوئے اسٹور میں بند ہوگئی۔ وہ بچی اسٹور کا دروازہ بڑی طرح پیٹنے جا رہی تھی۔

کھول دروازہ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز تیک کاٹی بھاری ہوئی تھی۔ میں شدت سے دعا کر رہی تھی کہ کوئی آجائے تھوڑی دیر بعد ماما گھر آئیں تو میری جان میں جان آئی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد ہم نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا۔ میرے پاپا کا کسی کام سے آدھر جانا ہوا تو جس گھر میں ہم رہتے تھے اس گھر کے سامنے جو صاحب رہائش پذیر تھے۔ ان کی میرے پاپا سے اچھی بات چیت تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب آپ لوگ اس گھر میں رہائش پذیر تھے۔ میں بھی ٹیرس پر آ جاتا تھا۔ ایک رات بارہ بجے میں اپنے ٹیرس میں کھڑا تھا کہ میری نگاہ آپ کے ٹیرس پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس ٹیرس میں ایک عورت سفید کپڑے پہنی کھڑی ہے۔ اکثر میں بھی رات کو اپنے ٹیرس آتا تو کبھی مجھے لمبے لمبے سائے دکھائی دیتے۔ آپ کے ٹیرس میں، ابھی وہ عورت سفید لباس میں۔ میں نے آپ کو بتانا

نہیں سمجھا کہ کہیں آپ لوگ اور خوف زدہ نہ ہوں اور جو اس پرانے گھر میں نئے لوگ آئے وہ بتاتے ہیں کہ رات ہوتے ہی برتنوں کے گرنے والی آوازیں آتیں اور عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں پوری رات آتیں۔ ہم اس نقش پاک کی بات ان آئینی مخلوقات کے شر سے محفوظ رہے تھے، پر ہم وہ اتار کر لے آئے اور وہ مخلوق جو بندھی ہوئی ظاہر ہو کر اب نئے لوگوں کو پریشان کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

ایک بار میں اپنی نانی کے گھر اپنی کزن کے ساتھ اپنی نانی کے پاس میں اور میری کزن روحیلہ تھی۔ رات تین بجے تک ٹی وی لاؤنج میں ہم دونوں بیٹھی رہیں کر رہی تھیں کہ باتیں کرتے کرتے ہم دونوں وہیں آئیں۔ ابھی ہمیں سوئے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میری کزن روحیلہ سامنے بیڈ روم کے دروازے پر کھڑی مجھے اشارے سے بلارہی ہے۔ میں غنبد سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اشارے سے بلانے پر میں نے دور سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ وہاں کیوں کھڑی ہو۔“

مگر وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ نے اپنی طرف آئے کا کہہ کر اندر بیڈ روم کی جانب چلی گئی۔ نانی ٹی وی لاؤنج میں رکھے تخت پر سو رہی تھیں اور میرے اور روحیلہ کے سوا گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ میں بے اداری سے اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ منہ سے کچھ بول بھی نہیں رہی اور ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ اتنی بہادر کب سے ہوگئی روحیلہ کہ اتنی رات میں سامنے بیڈ روم میں ہے۔ جس کی لائٹ بھی بندھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ روحیلہ پھر بیڈ روم کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ اندر کمرے سے نکل کر اب وہ جلدی جلدی اشارے سے اپنے پاس آنے کا کہنے لگی۔ میں غصے سے کھوٹی ہوئی کھڑی ہوئی کہ اس کا دماغ درست کرتی ہوں ابھی کہ کھڑے ہوتے ہوئے میری نگاہ کچھ فاصلے پر سوئی ہوئی روحیلہ پر پڑی۔ خوف سے میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بیڈ روم کی جانب نگاہ کی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پوری رات میں نے

تکیے میں منہ چھپائے، خوف سے گزاری کہ اگر میں وہاں بیڈ روم تک چلی جاتی تو پتا نہیں پھر میرا کیا حال ہوتا یا وہ آئینی مخلوق میرا کیا شکر کرتی۔

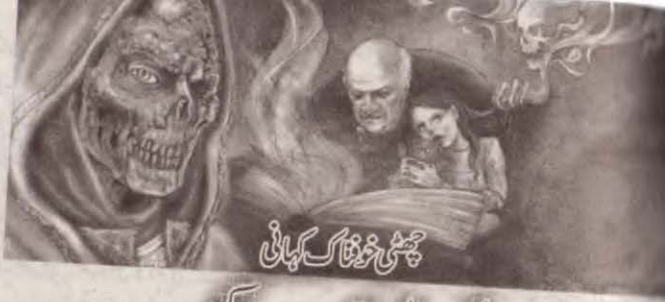
☆☆☆

میری خالہ جن کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ میری نانی کے ہاں اپنی عدت گزار رہی تھیں۔ جس دن خالہ عدت سے نکل کر اپنے گھر گئیں اس رات تین بجے میری نگاہ نانی کے صحن میں گئی تو وہاں میرے مرحوم خالو سفید لباس میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

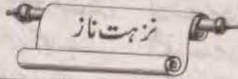
میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہ کافی پرانا اسکول تھا۔ وہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں زبردست آسیب ہے۔ اس اسکول سے میری خالہ نے بھی بڑھا ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہیں کہ ایک بار میں جلدی اسکول پہنچی تھی۔ جس وقت میں اسکول پہنچی اس وقت کم طالب علم تھے۔ جو اسکول میں موجود تھے۔ میں اپنی کلاس میں چلی گئی کلاس خالی تھی۔ میں ڈیک پر بیٹھ کر اپنی کاپی میں کام کر رہی تھی کہ میرے ہاتھ سے بین چھوٹ کر نیچے جا کر۔ میں بین اٹھانے کی غرض سے نیچے جھکی تو خوف کے مارے میری ہچک چلی بندھ گئی۔ جس ڈیک پر میں بیٹھی تھی اس سے آگے والے ڈیک کے نیچے ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ نہایت بھیما کترین چہرہ، لمبے سفید بال، بکھرے ہوئے تھے۔ میری سانس میرے سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ میں گرتی پڑتی کلاس روم سے باہر کی جانب بھاگی تو سامنے سے میری دوست آئی دکھائی دی۔ میں نے روتے ہوئے اسے ساری بات بتائی۔ وہ زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کلاس میں اس ڈیک کی طرف لے کر آئی جہاں میں نے وہ ہولناک منظر دیکھا تھا۔ پر اب وہاں کوئی نہ تھا۔

مجھے چونکہ شروع سے ہی ایسی باتوں میں دلچسپی رہی ہے۔ میں فطرتاً ڈر پوک بہت ہوں پر پھر بھی مجھے ان باتوں کے بارے میں حوصلہ لگانے کا بہت شوق تھا۔ یہ میرا اسکول کا آخری دن تھا کہ میری دوست کہنے لگی۔ ”چلو گراؤنڈ میں چلتے ہیں۔ ہماری دین بھی دیر سے آنا تھی۔“



چشمی خوفناک کہانی

ایک بیل میں سب کچھ



ایک دوشیزہ کے ساتھ پیش آنے والا عجیب قصہ جو یقیناً آپ کی نیند اڑا دے گا

”اللہم کیا سوچ رہی ہو؟“ اقلیدہ نے یک دم
”اب کہاں میں واپس آتے ہوئے بولی۔
”کچھ نہیں بس دادا یاد آ گئے تھے۔“ جب اس نے
”اے اللہ! پکھا تو ڈر گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کے سارے



کیا کہ اُس دن ہم دونوں بڑی مصیبت
ہونے سے بچ گئی تھیں۔

☆☆☆

جس یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں وہاں
پرانے چوکیدار ہیں۔ انھوں نے مجھے
رات کے وقت وہی صبح کا سماں ہوتا ہے جس
لوگ صبح پڑھنے آتے ہو۔ اسی طرح وہاں
بچے شور مچاتے ہیں۔ ویسے ہی تیز تیز قدموں کی آواز
بس کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہوتا پڑ زمین پر ان
لبے سارے دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔
انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں رات دو
دہن چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان باتوں کا
نے اپنی یونیورسٹی فرینڈ سے کیا تو اس نے بتایا۔
ایک رات اس کا کزن اور اس کے دو دوست

دوسرے دن کی کنکشن کی تیاری میں لگے تھے۔
رات کے بارہ بج گئے جب وہ کام سے فارغ ہو کر
بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں۔ سائنس ڈپارٹ کے باہر
لڑکی برگد کے درخت سے ٹیک لگائے کتا میں
بیٹھی تھی۔ میرے کزن کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی تو
کی سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ کیونکہ یہ وہ لڑکی
جس نے کچھ ماہ پہلے خودکشی کر لی تھی۔ وہ سائنس
ڈپارٹ میں پڑھتی تھی اور بہت ہی ذہین لڑکی تھی۔
استاد کی ڈانٹ پر دلبرداشتہ ہو کر اس نے اپنی جان
دے دی تھی اور اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس
لڑکی کو وہاں بیٹھے دیکھا۔

ایک بار مجھے خود اس درخت کے پاس سے نسوانی
تہمت کی آواز سنائی دی۔ پر میں دوبارہ ان معاملات میں
نہیں پڑی اور نہ ہی میں نے بھی دوبارہ ان باتوں کی
کھوج لگائی۔ کیونکہ جس طرح ہم اللہ کی مخلوق ہیں، وہ
بھی اسی طرح اللہ کی مخلوق ہیں اور ہمیں کوئی حق نہیں
یوں مداخلت کرنے کا کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ ہماری
ایک چھوٹی سی حماقت یا حرکت ہمارے لیے خود زندگی
بھر کا روگ بن سکتی ہے۔ میں شکار ادا کرتی ہوں اللہ کا کہ
اس نے مجھے بڑے نقصان سے بچایا۔

☆☆☆

سارا اسکول خالی ہو گیا تھا بس ایک دو آیا اور
دروازے پر چوکیدار تھا۔ دونوں آیا بھی پر پھل کے
آفس کے باہر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ہم دونوں
گراؤنڈ کی جانب چہل قدمی کر رہے تھے۔ گراؤنڈ
اسکول کے کافی کونے میں بنا ہوا تھا۔ ہمارا اسکول بہت
بڑا تھا۔ اس گراؤنڈ میں سب ہی بہت کم جاتے تھے۔
اس گراؤنڈ میں ایک جگہ کونے میں برگد نیم اور پیر کے
درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم دونوں باتیں کرتی ہوئی ان
درختوں کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ میری نگاہ درخت
کے پاس پڑی بڈیوں پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے
خوف محسوس ہوا۔ میری دوست کا پیر کھانے کو دل چاہنے
لگا۔ میں درخت پر چڑھ کر اس کے لیے پیر توڑنے ہی
والی تھی کہ دو ہاتھوں نے زور سے مجھے دھکا دیا۔ میں زور
سے زمین پر آ کر گر گئی۔ زمین پر گرنے سے چوٹ
میرے دونوں ہاتھوں پر لگی تھی، جس سے خون نکلنے لگا
تھا۔ اب اس درخت کے پتے تیز تیز ہلنا شروع ہو گئے۔
میں اور میری دوست بڑی طرح سے ڈر گئی۔ ہم اس
گراؤنڈ سے نکل کر اپنی کلاس میں آ کر گیٹ بند کر کے
بیٹھ گئیں۔ ابھی ہم نے اپنے حواس بحال ہی کیے تھے کہ
کلاس روم کی لائٹیں بند ہونا شروع ہو گئیں۔ ہم دونوں
سہیلیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑی ہوئی تھیں کہ کلاس
روم کے باہر سے بہت سارے اسٹوڈنٹس کے
بھاگتے ہوئے جوتوں کی آوازیں آنے لگی۔ ہم
دونوں نے گھبرا کر گیٹ کھولا تو جوتوں کی تیز آواز
ہمارے قریب آ رہی تھی جب کہ کوئی دکھائی نہیں دے
رہا تھا۔ ہم دونوں دوستوں نے وہاں سے دوڑ لگائی
اور اسکول کا گیٹ کراس کر گئیں، جہاں ہماری وین
والے انکل آ چکے تھے۔

تھوڑے ہی دن بعد ایک خبر ملی کہ اسکول کی ایک
لڑکی واش روم گئی اور جب کافی دیر ہو گئی وہ نہیں آئی تو
سب کو تشویش ہونے لگی۔ جب گیٹ توڑا گیا تو وہاں
وہ لڑکی مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اس کی
آنکھیں خوف سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور چہرہ پورا
سفید ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اس کا خون پیا ہو۔ جب
میں نے اور میری دوست نے یہ خبر سنی تو خدا کا شکر ادا

باتی تھیں۔ آج ناشتے سے فارغ ہو کر شمارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کہانیاں بہت دلچسپ اور سبق آموز تھیں کچھ کچھ ڈرامے بھی لگ رہا تھا۔ امی کی آواز آئی اقلیمہ گیٹ ابھی طرح بند کرلو۔ مجھے کچھ کام ہے، باہر جا رہی ہوں۔“

وہ رسالہ لیے کمرے سے نکلی گیٹ لاک کر کے لاؤنج میں ہی بیٹھ کر شمارہ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ڈور تیل بج اٹھی۔ کھڑی پر نظر ڈالی تو دو پہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ گیٹ پر کئی تو ماسی کی بیٹی کھڑی تھی۔

میں نے پوچھا کہ آج تو تمہارا دن نہیں ہے اور تمہاری امی کہاں ہیں؟“ اس نے جواب کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل کی چھٹی کی تھی اس لیے آج مجھے کام پر بھیجا ہے۔“ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ماسی کی بیٹی مہک ان کے گھر کام کر چکی تھی تو اس نے اس کو اندر بلا لیا۔

عام طور پر اس کی امی یا سی سے کام کرواتی تھیں۔ لیکن اس وقت امی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ اس نے اس سے کہا کہ تم پہلے برتن دھو لو۔“ رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا جانے کیوں۔ وہ بار بار رسالے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے انور کیا اور اس سے دوبارہ کہا کہ تم برتن دھو لو لیکن مہک کا پورا دھیان رسالے کی طرف ہی تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

”یابی کیا میں یہ رسالہ دیکھ سکتی ہوں؟“ وہ کچھ ڈسٹرب لگ رہی تھی۔ اس کو کچھ خاص پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اقلیمہ نے رسالہ اس کو دے دیا۔ وہ کافی دیر تک سرورق دیکھتی رہی پھر ادراقی پلٹ کر اندر کی تصاویر دیکھنے لگی۔ اقلیمہ اٹھ کر واش روم چلی گئی۔ میں جب واپس آئی تو دیکھا کہ کرسی پر ایک کالے رنگ کی بیٹی بیٹھی ہے اور مہک نظر نہیں آ رہی۔ اس نے آواز دی۔ ”مہک تم چن میں ہو؟“ اس نے محسوس کیا کہ بیٹی غیر معمولی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹائی اور سوچنے لگی کہ یہ بیٹی کہاں سے آئی۔ کیونکہ باہر والے دروازے اور کھڑکیوں پر جوالی لگی ہے۔ بیٹی گھر کے اندر نہیں آ سکتی تھی لیکن یہ بیٹی!!

اچانک اسے کچھ خطرہ محسوس ہوا۔ ابھی گھر پر کوئی موجود نہیں ہے۔ اس کی عادت تھی کہ میں جب بھی واش روم جاتی تو دھو کر لیتی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر وضو کا پانی موجود تھا۔ ہاتھ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو جھکا تو چند قطرے بیٹی پر پڑے اور وہ دھوئیں کے مرغولے میں تبدیل ہو گئی۔

”کیا کر رہی ہو؟ اقلیمہ!!“ بھاری سی آواز آئی۔ ”ایسا کچھ نہ کر کہ مجھے اصل روپ میں آنا پڑے۔ تم ڈر جاؤ گی۔ مجھے ولی محمد نے تمہاری حفاظت مامور کیا ہے۔“

”میری حفاظت!!“

”ہاں تمہاری حفاظت! اور یہ اس وقت کی بات تم اس دنیا میں بھی نہیں آتی تھیں۔“ ولی محمد تو میرے والد ہیں۔ ولی محمد!! میرے دادا!! پوری فلم اقلیمہ کے چلنے لگی۔ اس نے اپنے دادا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔

ان سے بہت عقیدت رکھتی تھی۔ آج بھی ان کے نام پر اقلیمہ کے کمرے میں ہوتا تھا۔ ہر سال ان کی برسی منائی جاتی اور ان کے نام پر نذر و نیاز اور غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اقلیمہ کی دادی نے بتایا تھا کہ اس کے دادا، دو بھائی

ولی محمد اور محمد زہیر، دونوں ساتھ رہتے تھے۔ ان کا تعلق اہل حق تھا۔ یہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے بونہار طالب علم تھے۔ انڈین گورنمنٹ کی طرف سے ولی محمد کو اسکالرشپ بھی ملی تھی۔ وہ انگریز بھی گئے۔ محمد زہیر پڑھ لکھ کر بجے اور ولی محمد ایچ ڈی کیا لیکن نہ جانے کیوں ولی محمد دنیا داری سے دور رہ گئے۔ ان کو پڑھ لکھ کر کمانے کی وجہ نہ ہوتی چاہیے تھی۔

جواب اور گھر پر توجہ دینی چاہیے تھی لیکن!! اس کے برعکس وہ عبادات پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ رات رات بھر کی عبادت کئی کئی مہینوں تک گھر سے غائب رہ کر وہ نہ جانے کہاں کہیں جھنگ کر، کیا تلاش کر رہے تھے۔ گھر والے پریشان تھے۔ محمد کو پڑھ لکھ کر اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے والد نے انھوں نے تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی زمینیں اور جائیدادیں

رشتہ داروں میں تقسیم کر دیں اور جنگل جنگل بچھنے لگے۔ ان اندر طلب کا ایک دریا موجزن تھا۔ جنگل میں بھی ان کی کرنا تھا ہر ہونے لگیں۔ ان کی اولاد بھی ایک ہی تھی اور تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جب تک بھی صابر و شاکر تھیں اور اللہ کا شکر ادا کرتیں تھیں کہ بھی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ولی محمد جب بھی گھر آتے اور کوئی بیمار ہوتا تو ان کی دوا سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ ان کے بھائی اکثر ان سے کہتے۔ ”ولی محمد یہ جو تمہاری حرکتیں ہیں ناں تم اگر مر گے جاؤ گے تو ہمیں خبر تک نہیں ہوگی۔“

اس مرتبہ ولی محمد نے بڑے اعتماد سے اپنے بھائی کو مطمئن دلایا کہ زہیر بھائی آپ فکھ نہ کریں۔ آپ

ہاں مجھے گاہیں میرے مرنے کے بعد میرے نام پر زہیر کو روادیا بھیجے گا۔ یہ میرے لیے بھی بہتر ہوگا۔“

ولی محمد ویرکت میں بھی اضافہ کرے گا۔“

تم یہی باتیں کرتے ہو ولی!! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تم سے پہلے جاؤں گا۔“

”وقت ہی بتائے گا کہ کس کا بلاوا پہلے آتا ہے۔“

اس جانے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ بس یہ اعمال درست رکھنی چاہیے۔“

☆ ☆ ☆

نام کا وقت تھا۔ محمد زہیر لاؤنج میں بیٹھے اپنا کیس کھول کر رہے تھے۔ وہ ایک مشہور رنج تھے۔ وہ بڑے کام سے اپنے کام میں مصروف تھے کہ ٹھنڈی ہوا کا ایک

ان کے پاس آیا، ایک بھینسی بھینسی سی خوشبو کے ساتھ!!

انہوں نے نظریں اٹھائیں تو سانسے فرش پر ان کو خون کا قطرہ پڑا۔ وہ قطرے کو دیکھنے لگے تو اس سے آگے کئی قطرے پڑے۔ وہ دیکھنے کے لیے اٹھے کہ یہ قطرے کہاں سے آ رہے ہیں؟ گول گول قطرے لائن سے فرش پر نظر آ رہے تھے۔ وہ قطرے کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر نکل گئے۔ جنگل

انڈیا میں اس وقت آبادی اتنی تھی کہ اس کے گرد گھروں کی گلی ہی جنگل پائے جاتے تھے۔ قطرے کے ساتھ ساتھ پانی پڑے۔ وہ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو بھائی کو لگا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ بھائی کو دیکھا تو

محمد زہیر جو نذر و نیاز اور فاتحہ کو نہیں مانتے تھے۔ ان کو ہمت آگئی تھی کہ میرے نام کی فاتحہ کرنا۔ وہ جس سال اول جاتے تھے تو کمرے میں خون کے قطرے نظر آتے تھے۔ ابھی بچھلے مینے ہی دادا کے نام کا فاتحہ پڑھا تھا۔

”اقلیمہ کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے اپنے حواسوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ایک دیو قامت جن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا اوپر دھڑکھٹ سے بھی اوپر نکلا ہوا تھا اور وہ اس کے منہ سے بھی نکل رہی تھی۔

”بھائی تم نیچے تو آؤ میں تم سے باتیں کیسے کروں؟“

”ہمارا نام کیا ہے؟ تم اس دن کہاں تھے؟ تم کیا کرتے ہو؟“

”ہمارا کیا کر رہے ہو؟“ نہ جانے کہاں سے اقلیمہ کے اندر اتنی

ہمت آگئی تھی کہ اسے بالکل بھی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو بویدیل جن ایک دھوئیں کے مرغولے میں تبدیل ہو گیا اور اسی دھوئیں سامنے ”مٹی پلاٹ“ میں جذب ہو گیا۔ اقلیمہ نے لاؤنج میں جہاں کھڑکی سے روشنی آتی تھی۔ وہاں مٹی پلاٹ کا پودا لگایا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت خوب صورت لگتا تھا اور ایک خوش گوار تاثر ابھرتا تھا۔ چانک پودے میں سے آواز آئی۔

”میرا نام نسیم ہے۔ میرے والد کا انتقال دو سال قبل ہوا ہے۔ مرتے وقت انھوں نے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ انھیں تمہارے دادا نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ قدرت کو تم سے کچھ کام لینا ہے۔“

اقلیمہ نے محسوس کیا کہ واقعی وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہے تو ایک خوشبو کا جھوکا اس کے ساتھ چلتا ہے اور کبھی کبھی اس کی بھینسی بھینسی خوشبو تیز محسوس ہوتی ہے۔ اقلیمہ نے اس خوشبو پر بھی کوئی خاص دھیان نہیں دیا کیونکہ اس سے اس کو کبھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔

بھاری آواز میں نسیم نے بتایا کہ میرے والد نے مجھے ہدایت کی تھی کہ جب تمہاری عمر کے 7 کے تین پچیسے مکمل ہو جائیں تب۔ مجھے ظاہر ہوتا ہے۔“ اور اقلیمہ کو ایک حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ واقعی کل 6 مارچ کو اس کی برتھ ڈے ہے اور وہ 21 سال کی ہو رہی ہے۔ یعنی 7 سال کے 3 پچیسے۔

نسیم نے پھر کہا کہ مجھے محسوس صرف ایک بات کہنی ہے۔ اب میں اگلے پچیسے پر ظاہر ہوں گا۔ ابھی یہ بتانا ہے کہ قرآن پاک کی کسی ایک سورۃ کو پانچا دوست بتالو۔ اس کو پڑھ کر یقین کر لو کہ ہر مشکل آسان ہوگی اور حفاظت رہے گی۔“ اور واقعی اس بات میں جانے کیا راز چھپا تھا کہ اقلیمہ کو اپنے ذہن و دل میں ایک سکون سا اثر محسوس ہوا کہ قرآن کی ایک سورۃ سے دوستی ہی اس کے لیے ایک اچھوتا تصور تھا۔

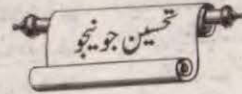
نسیم یہ کہہ کر پھر دھوئیں کا مرغولہ بن کر غائب ہو گیا اور اقلیمہ یہ سوچ رہی تھی کہ..... دادا نے اس کے متعلق کیا جانا؟؟ قدرت کو اس سے کیا کام لینا ہے؟؟ اور قرآن کی ایک سورۃ سے دوستی!! اب تک وہ اس شش و شنبہ میں مبتلا ہے۔ مگر نسیم نے جو کہا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خدا کے کلام میں ہر آفت سے حفاظت کا راز پوشیدہ ہے۔ بس یقین کرنے کی دیر ہے۔

☆ ☆ ☆



ساتویں خوفناک کہانی

مہمانِ ناگ



نہریلی دنیا سے امرت بھری تحریق قدرت کا عجیب رنگ دکھائی ایک کتھا

”اُف کیا مصیبت ہے اماں؟ ہوا کیا اچانک سے جو یوں پتھروں کی بوچھاڑ کر دیتی ہیں۔ کئی دن سے میں دیکھ رہی ہوں۔ بغیر کسی وجہ کے آپ یہ برتاؤ کیوں کر رہی ہیں؟“ زنائے دارچھڑاس کے گال پر پڑا تو وہ تملاکر رہ گئی۔

”نہ تو تیرا باپ آئے روز مجھے پیسے دے کر جائے گا جو میں نئے منگے اور چار پائیاں لیتی پھروں؟“

”ارے اماں کیسے سمجھاؤں، میں بھلا کیوں کراتے ہی منگے اور چار پائیاں توڑوں گی۔ اس کے سوا ہے کیا اپنے گھر میں جو میں ایسی حرکتیں کرنے لگی؟“

”کم بخت ماری تو بتا چھوٹی اور بلال کے علاوہ گھر میں ہے کوئی جو یہ کام کر سکے؟ کنزئی تو پہلے ہی وہ بچی ہے چار پائی کیسے توڑ پائے گی۔ بلال یہ کام کرے گا نہیں، اب کوئی باہر کا بندہ تو آ کر کرنے سے رہا ہے۔“

منسل کسی دن سے نیامت بی بی اور اس کی بہو صفوراں کے بیچ یہ جنگ جاری رہی، نیامت بی بی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ کوئی

”دھڑھو۔ ڈرومت، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ یہ سن کر وہ رک گئی۔

”بات سن میرا تعلق قوم جنات سے ہے۔ کچھ دن پہلے میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ تو تمہارا چھوٹا سا کچا صاف سترامکان آلودگی سے پاک مجھے بہت پسند آیا تو رکنا پڑا۔ سکون، اطمینان تھا اس گھر میں تو مجھے شرارت سوچھی کہ کچھ دن یہاں قیام کروں، تم اور تمہارا گھر بہت پسند آیا، تمہاری بہو بھی بہت اچھی ہے۔ اس کا قصور کوئی نہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب میں گزر رہا تھا۔ مگر اب نہیں کروں گا۔ تم مجھ سے کچھ لمحے بات کیا کرو۔ جتنی بھی دولت چاہیے مل جایا کرے گی۔“

”خدا کے لیے ہم غریب لوگ ہیں، ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ اپنی دنیا میں۔ ہمیں یہاں سکون سے رہنے دو۔“ وہ التجائیں کرنے لگی۔

”دیکھو نیامت بی بی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چلا جاؤں گا، بس کچھ دن تک۔ تمہاری دنیا بھی بہت اچھی ہے مزہ آ رہا ہے مجھے۔ اب کوئی حرکت نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحوں میں غائب ہو گیا تو نیامت بی بی کی جان میں جان آئی۔ چیخ چیخ کر صفوراں کو آواز لگائی۔ فوراً سے صفوراں کمرے

”ارہا، کہ ایک ان پڑھ گوار سے وہ بگاڑ کچھ کر لی مگر دوسری والی کے پاس اللہ کا علم ہے۔ وہ خود بھی پریشان سا رہنے لگا کہ یہ تنگ کر رہی ہو سکتے ہیں۔“

☆☆☆

”نیامت..... نیامت۔“ اچانک سے اپنا نام لے کر نیامت بی بی وہ بوکھلائی گئی۔

”سن اے نیامت۔“ اب کی بار وہ اٹھ کے کھڑکی کے کس نے نام پکارا۔ خالی کمرے میں دوڑانے لگی۔ کسی کا وجود نہ پا کر وہ ڈر ڈر سے کانپنے لگی۔ چار پائی سے اٹھنے میں بھی لاپرواہ رہی۔

”ارے ڈر کیوں رہی ہو نیامت! میں ہوں۔“

”کون ہو تم کہاں سے آئے ہو.....“

”تمہارے سامنے ہی تو ہوں۔ یہ دیکھو ذرا اچھروں دان میں لیکن ڈرنا نہیں۔“

پیسے ہی نیامت نے نظریں دوڑائیں تو نظریں لپٹی گئی۔ بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔ لہا موٹا سیاہ لپٹا ہوا تھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر والے کی طرف لپٹی کہ اس نے پھر روک دیا۔

☆☆☆

دو پہر کا وقت تھا جب نیامت بی بی اپنے کچے جھونپڑے نما یوسیدہ کمرے میں لکڑیوں سے بنی چھت کو گھورتی یہی سوچ رہی تھی کہ ہم غریبوں کے ساتھ کرکون رہا ہے، اگر ماں باپ نے تعلیم سے نوازا ہوتا تو میں اس کی مدد سے جان سکتی تھی کہ یہ پتھر کیا ہے۔

ادھر صفوراں بھی اب پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ نماز اور قرآن پاک پابندی سے پڑھا کرتی تھیں۔ کئی دن سے ساس اور بہو کی لڑائی دیکھ کر وہ



میں پہنچ گئی۔

”بی بی اماں کیا ہوا! طبیعت ٹھیک تو ہوں نا اماں؟“

”ہاں صفوراں وہ سب حرکتیں تم نہیں کر رہی تھیں۔ وہ کر رہا تھا۔“

”وہ؟ وہ کون اماں۔“

”وہ؟ وہ سانپ، سانپ؟“

”کیا کہہ رہی ہو اماں؟“ نیامت بی بی نے روشن دان کی طرف انگلی اٹھائی۔

”وہاں وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے اماں آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔“

”خدمت کر چھوڑ کر کوئی خواب نہیں دیکھا میں نے۔ جاگتی آنکھوں سے سب دیکھا ہے۔ بہت لمبا موٹا سانپ آج دکھائی دیا ہے۔ مجھ سے بات بھی کی ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو اماں! سانپ بھی بھلا بات کرتے ہیں کیا؟“

”ہاں وہ کوئی عام سانپ نہیں جنات سے تعلق ہے اس کا۔“ نیامت بی بی اب اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

”یقین نہیں آ رہا مجھے اماں؟“ ایک بار پھر نیامت بی بی نے اسے دوپٹہ جڑوایا۔

”اری او بے غیرت تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”نہیں اماں..... مگر مگر.....“

”کیا مگر مگر لگا رہی ہے۔ دیکھنا ایک دن تمہیں بھی نظر آ جائے گا پھر مگر مگر کرتی رہنا۔ مگر چلی گئیں۔“

”اتنا کہہ کر نیامت بی بی کمرے سے صفوراں بے چاری بنی جاتی ہوئی اماں کو دیکھ رہی تھی۔“

☆☆☆

ایک دن نیامت بی بی کسی کام کا کہہ کر پڑوس میں صفوراں کو ایک آدھ گھنٹہ تک آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ گھر پر اکیلی صفوراں ہی تھی۔ تو ایک انجانا

آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اجنبی آواز سا کر صفوراں حیرانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی رہی مگر کسی کو ناپا کر سہم گئی۔

”سنو صفوراں میں وہی ہوں جو اس دن نیامت کے پاس آیا تھا۔ آج میں اسے پیر جٹ سائیں کے مزار لے گیا تھا جو یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ وہ وہاں بیٹھی ہے اسے جا کر لے آؤ۔“

”لیکن تم اسے کیسے لے گئے اور کیوں؟“

”میری مرضی میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اگر چاہوں تو ابھی اسے یہاں لے کر آؤں۔ تمہارے سامنے مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ تم لوگ خود جا کر دیکھو تو جان لو کہ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔“

کوئی جواب دیے بغیر صفوراں بھاگتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ تو پتا چلا نیامت بی بی ابھی تو یہاں تھی چند منٹ پہلے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ اب اسے یہاں سے چلی گئی۔ باتیں کرتی کرتی اچانک اجنبی اور بغیر بتائے جانے کہاں چلی گئی۔“

صفوراں گھر آ کر بلال کو سب کچھ بتانے لگی جسے سن کر بلال بھی پریشان سا ہو گیا۔ پھر بلال پیدل ہی پیر جٹ سائیں کے مزار کی طرف چلا گیا۔ (پیر جٹ سائیں کا مزار ہمارے گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے کہ پیدل بھی جا سکتے ہیں)

مزار پر پہنچ کر بلال نے دیکھا کہ اماں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

”ارے اماں آپ یہاں کیسے آئیں؟“

”بس بیٹا میں خود نہیں جانتی کہ کیسے یہاں آئی ہوں۔ میں تو پڑوس میں عورتوں سے باتوں میں مصروف تھی، پھر پتا ہی نہیں چلا کہ کب..... بلال ماں کو لے کر گھر آ گیا۔“

یہ جان کر کہ اماں واقعی پیر جٹ سائیں کے مزار پر تھیں صفوراں بے ہوش ہو گئی۔

بہت مشکل سے جب اسے ہوش آیا تو وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ بلال نے اسے سمجھا کر مطمئن کیا۔

ابھی ایک دن بھی سکون سے نہ گزرا تھا کہ پھر

سانپ کی پھنکارنے بے سکونی پیدا کر دی۔

”اللہ خیر کرے وہ پھر سے آ گیا۔ پتا نہیں اب کیا کرے گا۔“

”نیامت جی کیسی ہیں آپ؟“

”تم پھر آ گئے۔ اپنی دنیا میں تمہیں کوئی چین نہیں یا کوئی ملال نہیں جو یہاں ہمارا جینا حرام کرنے چلے آئے؟“

”پسند تو بہت ہے مجھے ہماری دنیا مگر یہاں مزہ آ رہا ہے۔ بہت تھوڑے ہی دن یہاں ہوں پھر تم سکون سے رہنا۔“

”اچھا مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔“ اب نیامت بی بی کا ذرا کچھ حد تک کم ہو گیا تھا۔

”جنات میں تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کنواری لڑکیوں پر عاشق ہوتے ہیں۔ پھر تمہیں مجھ بڑھیا میں کیا نظر آ گیا۔“

”ہاں تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ بس تمہارے گھر میں بہت سکون تھا۔ ایسا سکون میں نے کبھی اس دنیا میں نہیں دیکھا۔ تو مجھے گمان سا ہونے لگا کہ کہیں یہ ہماری تو ہی دنیا نہیں۔ لیکن یہ صرف گمان ہی رہا۔ اس لیے چند دن کے لیے رکنا پڑا۔“

”اچھا بس دیکھ لیا نا سکون، اب اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ میری چھوٹی بیٹی بھی ہے۔ اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا تو خوف زدہ ہو جائے گی، پھر کیا کروں گی میں۔“ نیامت بی بی نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے میں اس کی موجودگی میں نہیں آؤں گا۔ تم بے فکر رہو، اپنا خیال رکھنا پھر آؤں گا۔“

اتنا کہہ کر وہ لڑکیوں میں غائب ہو گیا۔

یہ اس کا روز کا معمول بن گیا کہ کب کیسے کہاں سے آتا اور چلا جاتا یہ سمجھنے سے دل و دماغ قاصر ہی رہتا۔

☆☆☆

گھر میں روپے پیسے کی بہت تنگی تھی، جس سے وہ سب اکثر پریشان رہتے تھے۔ بلال کھیتی باڑی کرتا، وہاں سے گندم اور چاول آ جاتے۔ ایک

بھینس بھی پال رکھی تھی۔ دودھ خریدنا نہیں پڑتا تھا۔ لسی اور خالص مکھن سے گذر بسر ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کو کوئی شکوہ نہیں ہوتا تھا کہ جہاں پھر کے مکان ہوں وہاں پھر کے دل بھی بن جاتے ہیں۔ اس لیے سب اپنے کچے مکان میں ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ پیسے سے سب کچھ خریدنا جاسکتا ہے مگر سکون نہیں، جس سے وہ مالا مال تھے۔

صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی کنزلی ضد کرنے لگی کہ مجھے بنے کپڑے لینے ہیں۔ اس وقت سوائے چند روپوں کے نعمت بی بی کے پاس کچھ تھا نہیں کہ اسے کپڑے دلوائی۔ بڑے بکس میں رکھے کپڑے نکالنے لگی کہ اسے دو تا کہ اور وہ چپ ہو جائے گی اور راضی بھی۔

جوں ہی نعمت بی بی نے بیٹی کا ڈھکن اوپر اٹھایا۔ آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ ہائے اللہ اتنے سارے روپے..... پوری بیٹی بھری پڑی تھی۔ کہاں سے آئے یہ تو میرے سنبھالنے سے بھی زیادہ ہیں، ایک ڈھیر ہی تو تھا روپوں کا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

”رکھ لو نیامت سارے تمہارے لیے ہیں۔“ وہ پھر سے پہنچ گیا۔

”اچھا تو یہ سب تم نے.....“ اب نیامت خوشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی تھی اور ساتھ ہی روپوں کو بھی۔

”ہاں جی بالکل سب رکھ لو اور عیش کرو زندگی بھر۔“

اب نیامت بی بی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ سانپ غائب ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ اب یہ تو بتانے والی بات نہیں کہ اس واقعے کے بعد سے نیامت بی بی کے دن پھر گئے اور اس سانپ کو خدا نے وسیلہ بنا کر اس گھر میں خوشحالی دے دی تھی۔ سچ کہتے ہیں، خدا کی قدرت کے آگے کوئی پیش۔۔۔ نہیں چلتی وہ جب چاہے، جس کے چاہے دن پھیر دے۔

☆☆☆

سچی کہانیاں

137



آٹھویں خوفناک کہانی

آدم خور



ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے اُس شخص کا قصہ حیرت جو آدم خور بن کر زندہ انسان کھاتا تھا

گر جتنے مگر بادلوں کی آواز نے پوری کر دی تھی۔
بادلوں کی زوردار گرج اور چمکی آسمانی بجلی نے جنگل
کے ماحول کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ یہ ماحول کا
تھا، اس کا دل سینے میں پھڑپھڑانے لگا۔ اسے مزید
آگے چلنا تھا مگر اب تھا کاٹ سے، پاؤں کے زخم کی
وجہ سے مزید چلنا محال تھا۔ وہ مجبوراً بدن کو سہارا دیے
ٹانگوں کو بھٹک بھٹکتے ہوئے ایک درخت کے بڑے
سے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بادلوں کی گرج
اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ بارش ہونے کے قریب تھی اس
کے چہرے پر درد و اذیت کے تاثرات اور آنکھوں
میں آنسو اچانک ہی اُمڈ آئے تھے۔

”نوراں کہاں ہے تو.....؟ کہاں گم ہو گئی
ہے؟“ وہ بے اختیار بول پڑا۔

”دیکھ تیرا بالا تیرے لیے کتنا پریشان ہے۔
اس جنگل میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے، دیکھ
تیرے بالے کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ نوراں گھر
میں بچے تیری راہ تک رہے ہیں۔ ٹو نہ ملی تو تیرے
بغیر جی نہیں پائیں گے۔ اور میں..... بھی.....!!“
اس نے آنکھیں آستین سے صاف کیں۔ اور زور
زور سے نوراں..... نوراں..... پکارنے لگا۔ جنگل

جو ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔ گھر میں پیار کرنے
والی بیوی تھی، دو چھوٹے معصوم بچے تھے۔ گاؤں میں
چند ایکڑ زری زمین تھی۔ جس کو محنت سے کاشت
کر کے ہر موسم میں اچھی فصل لیتا تھا۔ جس سے آمدنی
بھی اچھی آ جاتی اور گھر کے لیے اناج بھی خاصا بن
جاتا۔ زندگی بغیر کسی فکر کے بڑی آرام و سکون سے
گزر رہی تھی، کہ اچانک اس کی ہستی ہستی زندگی میں
ایسا بھونچال آیا کہ اس کے گھر کا سارا امن و سکون
اپنے ساتھ ہی لے اڑا۔

اس کا بڑا لڑکا جو ابھی اسکول جانے کی عمر کا ہی ہوا
تھا۔ اچانک بیمار ہو گیا۔ گاؤں کے حکیم سے اس کو دکھا
کر دو وقت کی دوائی کھلائی۔ بالے اور اس کی بیوی
نوراں کو بچی امید تھی کہ حکیم کی دوائی سے افاقہ
ہو جائے گا۔ پھر حکیم کے کہنے کے مطابق بخار معمولی
تھا۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ دو دن مزید
گزر گئے۔ لیکن مصیبت تھی جو ملنے کا نام نہیں لے رہی
تھی۔ حکیم کی دوائی سے ذرا برابر افاقہ نہ ہوا۔ بخار تھا
جو تیز ہو کر سر پر چڑھ گیا تھا کہ اچھا خاصا بولتا چلا اس
لڑکا کیسے چار پائی ہی پڑی تھی۔ چپ ہی سادھ لی



تھی۔ سوکھ کر کاٹنا سا ہو گیا تھا۔

پریشانی کے عالم میں بالا گاؤں کے حکیم کے پاس پھر بھاگا۔ حکیم کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔ لڑکے کا جسم بخار کی وجہ سے کسی بھی طرح تپ رہا تھا۔

”دیکھ بالے مجھے یہ معمولی بخار نہیں لگتا۔ ورنہ میری دی ہوئی ایک خوراک سے ہی بخار دور بھاگ جاتا ہے، مسئلہ کوئی اور ہی ہے۔ ٹوایا کراس کو شہر کے وڈے ہسپتال لے جا۔“

”وڈے ہسپتال۔“ حکیم کی بات پر بالا اور پریشان ہو گیا تھا۔ نوران بھی کم فکر مند نہ تھی۔

”ہاں وقت ضائع نہ کر۔ تیرے لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بڑا وقت لگتا ہے۔ وڈے ہسپتال میں بھی اس کا اچھا علاج ہو سکتا ہے۔“

حکیم کے کہنے پر بالا اسی روز اُسے نیل گاڑی پر لاد کر اپنے لڑکے کو شہر کے ہسپتال لے گیا۔ جہاں ٹھوڑی بہت تنگ دود کے بعد اسے ہسپتال میں بھی داخل کر دیا گیا۔

چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ لڑکے کو ٹائیفائیڈ بخار ہے۔ جو مزید بڑھ گیا ہے۔ جان جانے تک کا خطرہ ہے۔ لڑکے کو ہسپتال میں داخل کراتے ہی علاج شروع ہو گیا۔ حالانکہ سرکاری ہسپتال تھا۔ مگر پھر بھی ہسپتال میں دن بدن مہنگی دوائیاں و علاج کے خرچے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالے کے پاس جو بچی بھی جمع پونجی تھی وہ بھی علاج کی نذر ہو گئی۔

مجبوراً اس کو گاؤں کے زمیندار کے آگے ہاتھ پھیلائے پڑے۔ اس سے کچھ رقم ادھار لے کر وہ دوبارہ شہر روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ رقم بھی کم تھی۔ جب مزید پیسوں کی ضرورت آن پڑی تو وہ دوبارہ زمیندار کے در پر گیا۔ ٹھوڑی ٹھوڑی رقم ہر بار لے کر وہ پورے ساٹھ ہزار کا مقروض ہو گیا تھا۔ اگرچہ لڑکے کے علاج پر رقم زیادہ لگ گئی تھی۔ مگر اس کو صرف اور صرف اپنے لڑکے کی فکر تھی کہ وہ جلد چنگا بھلا ہو جائے۔ نوران بھی دن رات دعا کیں کرتی۔

یہ ان دونوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ہسپتال میں اچھے علاج کی بدولت چند ہفتوں میں ہی وہ تندرست

دوانا ہو گیا تھا۔ بیماری دور چلی گئی تھی۔ وہ صحت کی طرف دوبارہ لوٹ آیا تھا۔

دونوں میاں بیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ کچھ دن بعد ہی وہ ہسپتال سے اپنے لڑکے کو گھر واپس لے آئے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد زمیندار اپنے پیسوں کا تقاضا کرنے لگا۔ بالے کے پاس تو دینے کے لیے چھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ بالے نے خاصی منت سماجت کی کہ اب کی فصل تک ایک ایک پائی اس کو لوٹا دے گا۔ مگر زمیندار بعد ہر ہاکہ زیادہ نہیں تو صرف ایک ہفتے کے اندر اس کی رقم لوٹا دے۔ ورنہ وہ زبردستی اس کی زمین اور اس کی فصل پر قبضہ کر لے گا۔ زمیندار کی دھمکی سے بالے کی راتوں کی نیند تک اڑ گئی۔

آخر کافی سمجھ بوجھ کے بعد اپنی بیوی نوران کے کہنے پر بیلوں کی جوڑی کو سستے داموں ہی بیچ کر اس نے زمیندار کے سارے پیسے چکا دیے۔ مگر زندگی میں آزمائش کی گھڑی ابھی چلی نہیں تھی۔ بلکہ اگلی مصیبت تیار کھڑی تھی۔ پریشانی نے اس کے گھر کا راستہ ہی پکڑ لیا تھا۔

گھر میں اناج پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ پھر بیلوں کی جوڑی بیچنے کے بعد زمین پر کاشت کرنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ پھر فصل کاشت کرنے کے لئے ٹھوڑے بہت پیسوں کی ضرورت تو تھی ہی۔ وہ تو بالکل ہی لنگال ہو چکا تھا۔ دن گزرنے لگے اور گندم کی بحالی کا وقت جاتا رہا۔ خالی بڑی زمین اس کا منہ چرانے لگی۔ دودھ و وقت کی روٹی بھی مشکل ہو گئی تھی۔

اس دن وہ دن چڑھے اٹھا۔ تو گھر میں نوران کو تا پایا۔ شاید پڑوس میں گئی ہو۔۔۔۔۔ اس نے خیال ظاہر کیا۔

ٹنگے پر منہ ہاتھ دھو کر اس نے ایسے ہی اپنے بڑے لڑکے سے پوچھ لیا۔

”طیقے تیری ماں نظر نہیں آ رہی۔

کہاں گئی ہے؟“

”ابا ماں تو خالہ کو ملنے دوسرے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ صبح ہوتے ہی نکل گئی تھی، کبھی تیری خالہ سے

کہہ بیٹے لینے ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ جنگل کے راستے سے جانے کا بول گئی ہے۔ ابا اور راستہ تو خراب ہے ناں۔“

”دوسرے گاؤں۔۔۔۔۔“ بالا ایک دم پریشان سا ہو کر چار پائی پر جا بیٹھا۔ بات ہی پریشانی کی تھی۔

وہ جنگل آسپ زدہ تھا۔ یہ بھی گاؤں کے اراد جانتے تھے۔ کوئی بندہ اس جنگل میں جاتا تو شاؤد ناوری واپس آتا۔ یہ سلسلہ کئی سالوں سے چل رہا تھا۔ کسی کو بھی کم شدہ افراد کے بارے میں کوئی خبر اب تک نہ تھی کہ بندے آخر کار اچانک غائب کہاں ہو جاتے ہیں۔ پولیس بھی اس سلسلہ میں نری طرح ناکام رہی تھی۔

گاؤں کے بوڑھوں کے مطابق جنگل میں آسپ پریت ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ مگر بد قسمتی کہ دوسرے گاؤں میں جانے کا شارٹ کٹ راستہ جنگل میں سے ہو کر گزرتا تھا۔

اور دوسرا راستہ جنگل کے باہر سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ بہت لمبا راستہ تھا جو بنا کسی سواری کے عبور کرنا ناممکن نہ تھا۔ پھر اس راستے میں نہر بھی آتی تھی۔ پے در پے انسانوں کے غائب ہونے پر گاؤں کے لوگوں نے اس راستے کو اپنا لیا تھا۔ مگر نہر میں پاڑ آنے کی وجہ سے یہ راستہ دو ہفتوں سے بند تھا۔

نوران کے جنگل جانے کا سن کر ہی بالا حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وہ نوران کے صبح سلامت آنے کی دعا میں مانگتا دوپہر تک اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر نوران واپس نہ آئی۔ بالے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بچوں کو اس نے رات کی بچی بھی روٹی کھلائی۔ گھر میں آٹا نہیں تھا۔ خود اس نے کچھ نہیں کھایا۔ بچوں کو پاس پڑوس میں چھوڑ کر خود نوران کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر دوپہر سے شام اور اب رات ہو چکی تھی۔ جنگل میں نوران کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پہلے ہی پتا کر والیا تھا۔ نوران دوسرے گاؤں پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔

بارش نے اچانک ہی زور پکڑ لیا تھا۔ گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہونے کے باوجود بھی اس

کا بدن پھینکنے لگا تھا۔ اسے لگا کہ وہ مزید یہاں کھڑا رہا تو اس سردی میں اس طرح بارش میں بھیگ کر لازماً بیمار ہو جائے گا۔ اس نے ہر طرف ہی نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف ہی اندھیرا پھیلا جس میں کچھ ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ آسمان سے پانی گرنے کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ جس نے سردی میں مزید اضافہ کر دیا تھا کہ اچانک گرجتے بادلوں کے ساتھ آسانی بجلی اتنی زور سے چمکی کہ جنگل میں ہر طرف روشنی سی بکھیر گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب بالے نے مشرق کی سمت درختوں کے گھنے جھنڈ کے پار کچھ مسافت پر پرانی سا قلعہ نما عمارت دیکھی۔ جس کو دیکھ کر بالے کو راحت کا احساس ہوا۔

اس طوفان سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کسی طرح اس کھنڈر نما عمارت تک جا پہنچے۔ وہ بنا کوئی وقت ضائع کیے گھنے درختوں سے ہوتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ وہ بہت پرانی خستہ سی بجلی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت تھی۔ جس کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا دیکھ زدہ دروازہ جس میں لکڑی نے جگہ جگہ جالے سے بن رکھے تھے۔ بالے نے اندھیرے میں دروازے کو ٹھٹھا۔ وہ بند تھا۔ اگرچہ وہیں کھڑے ہوئے بھی وہ کافی حد تک بارش سے بچا ہوا تھا۔ مگر سردی بھی جو مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اس نے جسم پر کچھ سی طاری ہو گئی تھی۔ یہاں باہر یونہی سردی میں کھڑے رہنا کسی بے وقوفی سے کم نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ لکڑی کا دروازہ آخر کس طرح کھولے۔ دفعتاً اس پرانے قلعے کے اندر آگ کا آلاؤ سا روشن ہوا۔ جس کی روشنی اس لکڑی کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر آنے لگی۔

اس سنسان جنگل میں جہاں کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ پھر یہ اندرا جا تک چلی آگ۔۔۔۔۔ بالے کی روح تک لرز گئی تھی۔ زبان تالو سے جا لگی۔ سردی ہونے کے باوجود بھی اس کا سارا جسم پیسے سے تر ہو گیا۔ اسے گاؤں والوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

جنگل میں بھوت پریت، آسیب کی موجودگی جو جنگل میں داخل ہوئے کسی بھی انسان کو مار ڈالتے تھے کہ انسانوں کی ہڈیاں تک نہیں ملتے تھیں۔ بالے کو لگا آج وہ نہیں بچے گا۔ اچانک اس کو اندر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ کسی انسان کے قدموں کی آہٹ اور چلتی آگ کے ساتھ ہی کسی کے کھانسنے کی آواز آنے لگی یہ بھی یاد کر دیا کہ اندر عمارت میں کوئی نہ کوئی ہے۔ آسیب بھوت پریت نہیں۔ بلکہ کوئی انسان۔ جو بُری طرح کھانسنے رہا تھا۔ لیکن کون؟؟

گئے۔ آگ کی دھبی دھبی روشنی عمارت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ بھی نظر آنا مشکل تھا۔ بالے نے غور کیا۔ تو وہیں کھڑے ہوئے اس کے قدم جمے گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ اس انسان کے ہاتھ میں کھوپڑی تھی۔ انسانی کھوپڑی۔

اس کے وجود سے بدبو کے بجائے اُٹھ رہے
گوشت اور خون کی ملی جلی بو..... جس سے
اے کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ بالے نے جلدی سے
ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

خود بخود چلنے لگی۔

رکت کرنے پر میرے باپ نے مجھے بہت مارا تھا
میرا دوستوں سے کھیلنا بند کر دیا۔

براقب ہوا جب وہ عورت میرے باپ کو لیے

تو بس ابا سے بات کر کے مجھے اس جہنم سے نکال

میں بھاگتا چلا گیا نجانے کتنی دور..... کہ گاؤں

سچی کہانیاں 145

چھوٹ گیا۔ شام سے رات ہو گئی۔ مگر میں بھانگتا ہی رہا کہ بھاگتے بھاگتے کسی شے سے اتنی زور سے ٹکرا کر اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ سر پر چوٹ لگی اور میں ہوش کی وادی سے دور چلا گیا۔ سورج کی تیز جلا دینے والی پیش سے میری آنکھ سہلی۔ میں نے ارد گرد دیکھا کہ میں ہوں کہاں؟ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی جنگل میں ہوں۔ بہت بڑے گھٹے سنسان جنگل میں جہاں میرے علاوہ دوسرے کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ میں ایسی ہی جنگل میں گھومتا رہا۔ مگر کھانے کو کوئی شے بھی نہ ملی۔ ایک دن ایسے ہی مزید گزرا گیا۔ پر میں جنگل میں ہی ڈیرا ڈال کر بیٹھ گیا۔ جاتا تو آخر کہاں جاتا۔ اپنے گاؤں کیا بھی کسی گاؤں میں جانے سے پہلے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی میرے باپ کو میری اطلاع نہ دے ڈالے۔

☆☆☆

اس شام میں نے جنگل کی ایک کچی سڑک جو جنگل سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس پر تین عورتوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ چھوٹا سا لڑکا بھی تھا۔ عورتیں چلتی ہوئی آپس میں باتوں میں مگن تھیں۔ وہ لڑکا سڑک پر ادھر ادھر بھاگ رہا تھا کہ بے دھیانی میں اس کچی سڑک کے پاس بڑے سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں جا گرا۔ باتوں میں مشغول عورتوں کو کافی دور جا کر احساس ہوا کہ ان کے ساتھ لڑکا نہیں ہیں۔ وہ واپس لڑکے کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑیں کہ ان میں ایک کی نگاہ گڑھے پر جا پڑی۔ لیکن کافی دیر ہو چکی تھی۔ لڑکا گندے پانی میں ڈوب کر جان دے چکا تھا۔ وہ عورتیں روتی جیتی واپس مڑ گئیں۔ لاش کو دیکھ ہی مجھے بھوک کا احساس مزید ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے اور بڑی مشکل سے گڑھے میں سے اس لڑکے کی لاش نکالی۔ مجھے ڈرتا تھا کہ وہ عورتیں اور بندوں کو لے کر یہاں دوبارہ نہ پہنچ جائیں۔ لڑکے کی لاش اٹھائے تیزی سے بھاگتا ہوا گھٹے جنگل کی طرف آ گیا۔ میری شلوار میں تیز دھار چاقو پہلے ہی اڑسا ہوا تھا۔ اس چاقو کی تیز دھار سے

میں نے اس کی گردن کاٹ ڈالی۔ گردن سے خون جاری ہوا تو میں غناٹ خون پینے لگا۔ چاقو سے اس کا سینہ چاک کر ڈالا۔ دل، انتریاں سب باہر نکالیں۔ چاقو سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پاس ہی خشک پتے اکٹھے کیے اور دو پتروں کی مدد سے آگ جلا کر ان ٹکڑوں کو بھون کر کھایا۔ ساری بھوک پل بھر میں فنا ہو گئی تھی۔ احتیاط سے کام لیتے ہوئے باقی ماندہ لاش کو میں نے دیر سا گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ رہنے کا مسئلہ ہنوز تھا۔ جنگل میں گھومتے پھرتے ہوئے یہ قلعہ نما عمارت نظر آئی۔ تو رہنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد ہی پھر میری بھوک جاگ اٹھی۔ سہ پہر کو میں اس کھنڈر سے باہر نکلا تو جنگل میں گھومتے ہوئے شوشی قسمت اسی کچی سڑک پر ایک بوڑھے آدمی اور ایک جوان لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے وہیں کھڑے ہوئے اندازہ لگا لیا کہ یہ جنگل میں کچی سڑک ایک راستہ ہے جو کافی گاؤں کو یہاں سے ملاتا ہے۔ شکار لازماً یہاں سے گزرتا تھا۔ بس مجھے گھات لگانے کا موقع کا انتظار کرنا تھا۔ شکار رات تو خود چل کر میرے پاس آ رہا تھا۔ میں درخت کی اوٹ لے کر چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ بوڑھا آدمی اور وہ لڑکی میرے پاس سے گزرے تو میں اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ میری گندی حالت اور میرے کپڑوں پر خون کو دیکھ کر وہ دونوں شدید ڈر گئے۔ پہلے پہل تو وہ کچھ نہ سمجھے۔ میں ان کو ڈرانے کے لئے زور زور سے چلانے لگا تو وہ حواس باختہ ہو کر واپس پیچھے کی طرف بھاگے۔ وہ بوڑھا کہاں بھاگ سکتا تھا۔ تھوڑی دور بھاگ کر بری طرح سے ہانپنے لگا اور زمین پر جا گرا۔ لڑکی کو میں نے چالیا۔ وہ شدید گھبرائی ہوئی تھی۔ اور زور زور سے چلانے لگی تھی۔ میں نے زوردار پھپھر اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ زمین پر جا پڑی۔ وہ برابر چیخ رہی تھی۔ میں نے زمین پر بڑا ایک وزنی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس لڑکی کے منہ سے ہولناک چیخ نکلی اور تڑپ کر سارکت

وئی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ گھٹے پتا چل گیا تھا کہ یہ کچی سڑک آنے جانے کا راستہ ہے۔ کوئی بندہ بھی عین موقع پر یہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے بنا کوئی دیر کیے لڑکی کو بالوں سے ٹھپتے ہوئے اس بوڑھے کے پاس آیا۔ دیکھا تو بوڑھا بھی دم توڑ چکا تھا۔ شاید وہ لڑکی کی عبرت ناک موت برداشت نہیں کر پایا تھا۔ بوڑھے کو بھی ساتھ کھینچتے ہوئے اس کھنڈر تک لے آیا۔

بوڑھے کو پرانی رسی سے باندھ کر اس برگدی مضبوط شاخ پر لٹا لٹکا دیا۔ بوڑھے کی گردن چاقو کے ایک وار سے کاٹ ڈالی۔ شہ رگ کاٹنے ہی خون بہنے لگا۔ تو وہاں پڑے ہوئے ایک مٹی کے گھڑے کو نیچے رکھ دیا۔ خون اس میں جمع ہونے لگا۔ لڑکی کی بھی گردن کاٹ کر علیحدہ کی۔ پتے خون کو جی بھر کر پی کر اس کے جسم کی کھال اتارنے لگ گیا۔ جسم کے تمام حصوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔

اس طرح مجھے جنگل میں آئے کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے۔ ہر پانچویں ساتویں دن اس طرح شکار کرتا اور اس طرح اذیت سے مار کر اس کے خون اور گوشت سے لطف اندوز ہوتا۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے شکار ملنا بند ہو گیا۔ لوگ جیسے تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ کبھی گاؤں والوں کو اس بات کا اندازہ تو ہونے ہی لگا تھا کہ جنگل میں ضرور کوئی مسئلہ ہے۔ پھر گاؤں کے لوگ قدرے دہمی بھی تھے۔ مجھے بھی کسی سے اڑتی خبر ملی جو میں نے ایک دفعہ ایک عورت کو مارتے ہوئے اس کے منہ سے سنی تھی کہ گاؤں والے جنگل میں بھوت آ سب کسی بدروح کی موجودگی بتا رہے ہیں۔ اور اس وجہ سے گاؤں کے کبھی لوگوں نے آہستہ آہستہ کر کے اس جنگل کے راستے سے گزرتا ہند ہی کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے جنگل کے پار والا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ جہاں سے نہر جاتی ہے۔ یہ میرے لیے مسئلہ تھا۔ مجھے ایک ایک ماہ شکار نہ ملا۔ سوچے سوچے گوشت اور خون پر گزارا کرنے لگا۔ پھر میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔ کئی راتوں کی محنت کے بعد میں نے نہر کے کچے کنارے میں بڑا سا شگاف ڈال

دیا۔ نہر سے باڑ کی وجہ سے وہ تمام راستہ پانی سے لہا لہ گیا۔ میری یہ کوشش کافی حد تک کامیاب ہوئی تھی۔ مگر تم نجانے کہاں سے یہاں ٹپک گئے۔ یہ سب سن کر بالے کا منہ دیکھنے کے لائق تھا۔ اس کو اب اندازہ ہوا تھا کہ نزدیک دور سب گاؤں کے افراد اس درندے کے ہاتھوں قہر اجل بن چکے ہیں۔ بالے کے انگ انگ میں غصے انتقام کی آگ جلنے لگی۔

وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے سے اس درندہ نما انسان کے جسم پر زور زور سے وار کرنے لگا۔ اس وحشی کی خوفناک دل ہلا دینے والی چیخیں اس کھنڈر میں گھونجنے لگیں گی۔

”بدبخت جانور تو نجانے کتنے معصوم بے قصور لوگوں کو اذیت سے مار کر ان کو اپنی خوراک بناتا رہا ہے۔ تجھے ایک لمحہ بھی کسی پر ترس نہ آیا۔ معصوم بچوں اور عورتوں کو بھی ٹوٹے نہیں چھوڑا۔“

وہ بولتے مسلسل اس کے گندے وجود پر ڈنڈے سے وار کرنے لگا۔ کہ ایک دم نورائیں کا خیال آتے ہی اس کا ہاتھ رک گیا۔

”میری نورائیں..... وہ بھی جنگل میں آئی تھی! کہیں اس درندے کی درندگی کا شکار.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”نورائیں..... میری نورائیں کہاں ہے۔ تو نے اسے بھی کیا..... میری نورائیں کہاں ہے؟“ بالا اس کو ٹھوکر مارتے ہوئے غصے سے چیخ کر بولا۔

”نورائیں..... کون نورائیں؟“ وہ وحشی پوچھنے لگا۔ ”میری بیوی نورائیں! کہنے ڈیل جانور! وہ صبح اس جنگل میں آئی تھی۔ اسی کچی سڑک سے دوسرے گاؤں اسے جانا تھا۔“

”اچھا وہ عورت۔“ وہ وحشی اپنے جسم سہلاتا ہوا بولا۔

”وہ مجھے صبح جنگل میں ملی۔ میں اس کو اٹھا کر لے آیا اور.....“

”اور کیا؟“ ٹوٹے اسے مار دیا۔ بالا بے ہوش ہونے کی کیفیت میں تھا۔

”نہیں! وہ زندہ ہے۔ اسے باندھ کر رکھا ہے۔“
 ”کہاں؟..... کہاں ہے وہ؟“ بالے کے بدن
 میں خوشی سکون کی لہر دوڑ گئی۔ مگر نوران کو دیکھنے، اس
 سے ملنے کی بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔
 ”وہ..... اس سامنے والے کمرے کے نیچے تہہ
 خانے میں۔“

بالا بنا کوئی اور بات کیے بھاگتا ہوئے کمرے کی
 طرف گیا۔ کمرے کے اندر سائیڈ میں سیڑھیاں بنی
 ہوئی تھیں۔ جو نیچے تہہ خانے تک جاتی تھیں۔ وہ دو دو
 سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نیچے جا پہنچا۔
 نیچے فرش پر بھی بڑا ہولناک منظر تھا۔ کئی انسانی پتھر
 انسانی کھوپڑیاں ہڈیاں جس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اندر
 بکھرے ہوئے تھے۔ خون اور گوشت کی سخت بد بو میں
 میں سانس لینا تک محال تھا۔ بالے کو ایک سائیڈ پر اس
 کی نوران نظر آئی۔ جس کے ہاتھ اور منہ کو پکڑے سے
 باندھا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ وہ نوران کو
 جاگئے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

نیم مردہ سی نوران نے بشکل اپنی آنکھیں
 کھولیں۔ اپنے سامنے بالے کو دیکھ کر وہ غیر یقینی سی
 حالت میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بالے..... تو آ گیا..... مجھے یہاں سے لے جا
 بالے۔ وہ درندہ، وہ جانور مجھے مار دے گا۔ بالے وہ
 بڑا ظالم ہے۔ اس نے ہمارے گاؤں کے کئی بندوں کو
 مار دیا۔ بالے وہ آدم خور ہے۔“ وہ رورو کر ہلکان
 ہو رہی تھی۔

”تو..... تو فکر نہ کرو نوران! میں آ گیا ہوں۔ اب
 تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تو فکر نہ کر تو بس چل۔“ بالے نے
 سہارا دے کر اس کو اوپر اٹھایا اور ہاتھ آہستہ آگے
 بڑھانے لگا۔

نوران کی نظر بالے پر پڑی اور پھر بالے کے
 پیچھے..... ایک دم ہی نوران کے منہ سے چیخ نکل گئی۔
 وہ درندہ ان کے پیچھے کھڑا تھا۔
 ”بالے..... وہ درندہ۔“

بالے نے مڑ کے پیچھے دیکھنا چاہا مگر اس درندہ
 انسان نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا اس کے سر پر دے

مارا۔ چوٹ کافی شدید تھی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس
 کی آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا۔ جلدی وہ
 ایک طرف گر کر کر رہا تھا۔ نوران کے لیے بھی یہ
 سب ناقابل برداشت تھا۔ اپنے شوہر کی حالت کو دیکھ
 کر اس کی اپنی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ درندہ
 وحشی ہنسنے لگا تھا۔

”چلا تو جتنا چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے اذیت
 سے تڑپا تڑپا کے ماروں گا۔ پھر تیرے اس شوہر کو، جس
 نے میرے کام میں ناگاہک اڑانے کی کوشش کی ہے۔“
 وہ اس کی طرف بڑھا۔ خوف سے نوران دیوار
 سے جا لگی۔

یہ چاقو دیکھ رہی ہے۔ اس چاقو سے تیری گردن
 کاٹوں گا۔ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کروں گا۔ مجھ
 سے پہلے غلطی ہوئی جو تجھے پکڑتے ہی فوراً مار دیتا تو
 میرا کام آسان ہو جاتا۔ چلو دیر سے ہی سہی مگر اب
 اپنی موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ ہتھ مارے ہوئے
 چاقو لہراتے ہوئے نوران کی طرف بڑھا۔ نوران کو لگا
 اس کی موت قریب ہے۔ بالا خود زخمی ہو کر زمین پر
 اونچے منہ پڑا تھا۔ وہ اس کو کیسے بچا سکتا تھا۔ مگر پھر
 بھی وہ بالے کو آوازیں دینے لگی۔

”بالے..... بچا لے مجھے..... یہ درندہ مجھے زندہ
 نہیں چھوڑے گا۔“ وہ اس کو ہوش میں لانے کے لیے
 مسلسل چیختی رہی۔ یہ شاید اس کی آوازیں کا ہی اثر تھا
 کہ نیم بے ہوش پڑے بالے نے زور زور سے تین
 چار مرتبہ سانس لی۔ نوران کی چھین مسلسل اس کے
 سونے ہوئے دماغ پر ہتھوڑے برسا کر اس کو ہوش
 میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پر سر پرگی چوٹ
 آنکھوں کے گرد آتا اندھیرا اس کو ایسے کرنے سے
 روک رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ زمین سے اٹھ نہیں
 پائے گا۔ اس نے ایک دو بار دوبارہ کوشش کی مگر
 بے سود..... ادھر کھلی آنکھوں سے اپنے سامنے کا
 منظر۔ وہ وحشی درندہ نوران تک پہنچ چکا تھا۔ غم
 اذیت غصے، انتقام چاروں احساسات کی ملی جلی
 کیفیت۔ اپنے سارے وجود کی ہمت اور جان کو بچا

کر کے اس نے زور دار آواز سے نعرہ تکبیر بلند
 کیا پھر بعد میں خود کو اس کو پتا نہیں چلا کہ وہ خود کیسے
 اٹھا۔ کیسے بھاگتا ہوا اس وحشی کو چالیا۔ وہ وحشی اس
 ساری صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہاں
 تک کہ وہ سنبھل پاتا۔ بالے نے ایک زوردار گھونسا
 اس کے جڑوں پر دے مارا۔ وہ بوکھلا کر دیوار سے
 جا لگا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔
 بالے نے پھر اس کو اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ اپنے
 پاؤں کی ٹھوکروں سے اس کی کریہہ گندی شکل کا
 مزید نقشہ بگاڑ دیا۔ خون اس کے منہ سے بھل بھل
 بہنے لگا۔ اس کے سارے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ وہ
 کسی ذبح کیے ہوئے بھینسے کی طرح ڈکارنے لگا۔
 مگر بالے کو اس پر ذرا برابر ترس نہ آیا۔ وہ درندہ
 تکلیف۔ درد سے ہلچل مچ رہا تھا۔

”بالے مارا سے..... اور مارا سے یہ کسی کتے کی
 طرح بھونک بھونک کر مر جائے۔“ نوران نے اس
 وحشی کے منہ پر تھونک دیا۔

”بڑی تکلیف بڑا درد ہو رہا ہے ناں..... آدم
 خور جانور۔ ان معصوم لوگوں کو یاد کر جن کو تو نے بڑی
 اذیت سے مار دیا تھا۔ جانوروں کی طرح ذبح کرتا
 تھا۔ ان کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔“ بالے نے
 اسے مار مار کر ادھر مارا کر دیا۔

”تیرے لیے تو موت کی سزا بھی کم ہے۔ اس
 سے بھی بڑی کوئی سزا ہے وہ تجھے ملنی چاہیے۔“
 بالے نے پاس پڑی رسی سے اسے اچھی طرح
 جکڑ کر باندھ دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے،
 وہاں سے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر بالے کی گرفت
 خاصی مضبوط تھی۔ بالا اور نوران اس کو زبردستی گھسیٹتے
 ہوئے اس کھنڈر سے باہر لے آئے۔

باہر طوفان کب کا ختم چکا تھا۔ رات بھی ڈھل
 چکی تھی۔ صبح کا سورج اپنی آنکھیں کھولنے کو تیار
 تھا۔ جنگل سے ہوتے ہوئے جب وہ اپنے گاؤں
 پہنچے۔ تو دن کی سپیدی ہر سو پھیل چکی تھی۔ گاؤں
 والوں کے لیے ان دونوں کی یہ زخمی حالت اور
 ساتھ ایک کریہہ انسان کا ہونا حیرت کا باعث

تھا۔ پر جب بالے نے اپنے ساتھ ہونے والی
 تمام روداد ان کے گوش گزار کی تو گاؤں کے کبھی
 لوگ ششدر ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے پیاروں
 کے ساتھ ایسے اندوہناک حشر کا سن کر زار و قطار
 رونے لگے تھے۔ کئی بندوں سے ضبط نہ ہو سکا تو
 اس درندے نما انسان کو مارنے کے لیے بھاگے
 مگر بالے نے روک دیا۔

”اس کو جان سے مار کر ہم اپنے ہاتھ اس کے
 ناپاک غلیظ خون سے کیوں رنگیں۔ ہم کو اسے پولیس
 کے حوالے کرنا ہوگا۔ وہ ہی اس کو عبرت ناک سزا
 دے گی۔“

دو تین بندے پولیس کو خبر دینے بھاگے۔ جلدی
 وہاں پولیس آن پہنچی۔ ساری صورت حال پتا چل
 جانے کے بعد پولیس انسپکٹر نے بالے کو گلے لگا لیا۔
 پولیس کے لیے بھی یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

”شاباش بالے..... تو نے وہ کر دکھایا جو کسی
 بہادر مرد کو زیب دیتا ہے۔ تو نے اس کو اپنی عقل اور
 بہادری سے پکڑ کر اپنے ساتھ کئی معصوم جانوں کو
 اذیت ناک موت سے بچالیا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ
 تیرے اس کارنامے پر بہت خوش ہوئی ہے۔ یہاں
 آنے سے پہلے میری پولیس ہیڈ آفس میں بات ہوئی
 ہے۔ اعلیٰ افسران بالا تجھے انعام و اکرام سے بھی
 نوازیں گے۔ ساتھ تجھے دو لاکھ کی خطیر رقم دینے کا
 ابھی اعلان کیا ہے۔“

”دولاکھ۔“ بالے کے ساتھ نوران کی خوشی
 دیدنی تھی۔

ان پیسوں سے ان کی کتنی مشکلیں حل ہو جانی
 تھیں۔ بالا تو خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس رقم سے
 گھر میں اثاب آجاتا۔ بیلوں کی جوڑی خرید کر وہ
 دوبارہ اپنی زمین کو کاشت پھر سے خوشحال آسودہ
 زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ پولیس اس
 درندے کو لے کر چلی گئی۔

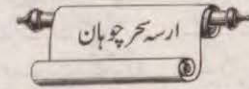
اگلے دن اس درندے کو اسی گاؤں میں سرعام
 پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

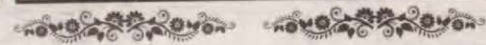


نویں خوشنک کہانی

کیسا یہ راز ہے؟



اُس ہندو آرٹ کی کتھا جسے اس کے خوابوں نے بام عروج عطا کر دیا



آج پھر ہر چودھویں چاند رت کی طرح وہ خوب صورت لڑکی سفید لباس میں ملبوس ایک پیڑ کے نیچے ایک لوہری میں سفید پھول اکٹھے کر رہی تھی کہ اچانک شکر کو دیکھ کر خوش ہو کر مسکرائی اور درد بھری آواز میں بولی۔
”تم آگئے نیل! میں جانتی تھی کہ نیل تم ضرور آگے۔ میرا انتظار ختم ہوا۔“

ساری کائنات کو سناتے ہوئے وہ زور سے بولی۔
”میرا نیل آگیا دیکھو۔“ پھر وہی سفید پھول وہ خوشی سے اپنے اوپر اُڑاتی ہوئی، برساتی ہوئی کسی مورتی کی طرح رقص کرنے لگی۔ چاندنی رات میں دُور تنہا کسی باغ میں رقص کرتے ہوئے وہ دو شیزہ کتنی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اچانک وہ تاپتے تانتے رک گئی اور شکر کے پاس آنے لگی۔ شکر خوف گئے مارے بھاگ نکلا۔ وہ تقریباً 30 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اچانک شکر سانس بحال کرنے کی نیت سے رُکا اور جھک کر گھٹنوں کے بل لمبے لمبے سانس لینے لگا، یہ سوچ کر کہ اب وہ اس لڑکی سے بہت دور نکل آیا ہے جیسے ہی اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا وہ

دوبارہ اس باغ کے سامنے تھا۔ تو کیا میں پھر سے واپس وہیں آ پہنچا ہوں، جہاں سے میں بھاگ گیا تھا۔
یہ بجا رادیکھ کر شکر کی اوسان خطا ہو گئے، فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ جیسے ملبوس دُور سے بھاگ کر آیا ہو۔

رات کے 3 بجے تھے۔ آج پھر وہی سنا، وہ لڑکی کون ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ شکر کو یہ سنا پچھلے ہی سالوں سے ہر یوم کی رات کو نظر آتا تھا۔
شکر ایک آرٹ تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھوں میں کمال قدرت دے رکھی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا اس دنیا میں۔ اس کی بنائی تصویریں ہاتھوں ہاتھ پک جاتی تھیں۔ لوگ دام نہیں بلکہ شکر کا کام، محنت اور تصویروں کی حقیقی تخیلاتی دنیا میں کھو کر جاتے، اس لحاظ سے شکر کا شمار بڑے اور مشہور آرٹسٹ میں ہوتا تھا۔ گو یالوگ شکر کے نام سے پیچھے بھاگتے تصویروں کو بعد میں دیکھتے پہلے ان کا دام ادا کرتے۔ وہ بھروسہ کرتے تھے کہ شکر کی بنائی تصویر ہے، کچھ خاص ضرور ہوگا۔

☆☆☆

”راہول یا راپنی قسمت سے بڑا بے زار ہوں۔
رات پھر وہی سنا۔ وہی لڑکی۔“ شکر نے اپنے دوست راہول کو سب کچھ پہلے سے بتا کر کہا۔ راہول ایک تقدیر شناس انسان تھا۔
”آؤ شکر تمہاری قسمت کا فیصلہ ان تاش کے پتوں سے کرتے ہیں۔“
یہ کہہ کر راہول نے شکر کے سامنے تاش کے پتے اُلٹے ترتیب میں پھیلا دیے اور شکر کو ان میں سے ایک پتا اٹھانے کا کہا۔ شکر نے اُٹھا کر راہول کو دیا۔

لیکن ٹھیک تیسرے دن شکر کو اس کے سینئر آرٹسٹ جن کے پاس وہ کام کرتا تھا کی طرف سے پیغام موصول ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ اگلے مہینے کی 18 تاریخ کو بہت بڑی نمائش ہونے جا رہی ہے جس کا نام ہے ”شاہکاروں کی تخلیق ہے“
نومبر کے اوائل دن تھے۔ سردیاں بھی تھوڑی بہت شروع تھیں۔ شکر کو نہ صرف اس نمائش میں شرکت کرنے کا حکم ملا تھا بلکہ کوئی شاہ کار دنیا کے سامنے لانے کے احکامات بھی صادر کر دیے گئے



انھوں نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ راہول نے کہا۔
”یا راپنی تیاری کر لے تیری قسمت تجھے نئی جگہ بھیج رہی ہے، جہاں تجھے شاید تیرے سارے سوالوں کے جواب ملیں گے۔“ شکر نے ہنس کر کہا۔
”مجھے ایسی وقیانوی باتوں پر بالکل وثوق نہیں۔
فی الحال قریب قریب ایسا کوئی بھی موقع نہیں کہ میں کسی نئی جگہ جا سکوں۔“ یہ کہہ کر بات آتی ٹٹی ہوئی۔
تھے۔ شکر کو دہلی جانے کا حکم بھی ملا۔ گو یا تقدیر اپنا کھیل کھیل چکی تھی۔
نمائش میں صرف سترہ دن باقی تھی۔ ان سترہ دنوں میں شکر کو دہلی جانا، پھر اپنے لیے ٹھکانہ تلاش کرنا اور پھر اچھا شاہکار لوگوں کی نظروں کے سامنے لانا تھا۔ دن بہت کم تھے۔ کیونکہ اس تقریبی نمائش میں بڑے بڑے فنکاروں اور لوگوں نے دنیا بھر سے شرکت کرنی تھی اور

خصوصاً وہ لوگ جو ماورائی، تخیلاتی اور پند اسرار دنیا کے دلدادہ تھے۔ شرکت کرنے والے تھے۔

اس نمائش میں کیلٹر نامی ایک آرٹسٹ ایک مورنی پیش کرنے والا تھا۔ وہ مورنی کسی لڑکی کی جی جیسے زمانہ قدیم میں کسی انتہائی قابل قدر ترقی مجسمہ ساز نے بنایا تھا، اور جس مورنی کو اس زمانے میں بہت حد تک سراہا گیا تھا۔ وہ مورنی زمانہ قدیم کے کسی نیل نامی مورنی سازی کی تخلیق تھی۔ جس میں 23 سالہ لڑکی ہاتھوں میں سفید پھول لیے اپنے لب سے ٹکرا کر مورتی کی نظروں سے آسمان کی لامحدود وسعتوں میں گھٹی ہوئی تھی۔ تاہم مورنی کا مرکزی خیال ہی لوگوں کی جان نکال کر لے گیا تھا۔ لوگوں نے اس زمانے میں مورنی کو بہت نذرانے پیش کیے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز اس مورنی کو اٹھا کر اپنے عجائب گھر کی زینت بنانے کی غرض سے لے گئے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ مورنی بنانے والے نے سب کچھ کر دیا گویا جان ہی نہ ڈال سکا۔ لوگوں کو مورنی اس حد تک مکمل لگی تھی۔ انگریزوں نے اس مورنی کو سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ کیا ہوا تھا۔

وہ مورنی اسی زمانے کی ایک گورہ نامی لڑکی کی تھی جسے سفید پھول بہت پسند تھے۔ اب اسی مورنی کے چرچے ہو رہے تھے جو کہ اس ہونے والی تقریبی نمائش میں جس کی جانی تھی۔ تو اب شکر نے سوچا کہ کچھ خاص ہی بنانا چاہیے۔ نمائش میں پیش کرنے کے لیے شکر نے بھی ابھی تک وہ مورنی نہیں دیکھی تھی۔ جس مورنی کے درشن کے لیے لوگ بڑے بے تاب تھے۔ لوگوں کی بے تابی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس مورنی کو خاصی پذیرائی ملنے والی ہے۔ شکر نے خود سے سوچا۔

قدیم زمانے کی یہ مدرتی صرف پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ ایسا کیا تھا اس مورنی میں؟

☆☆☆

اگلی صبح شکر دہلی پہنچ گیا۔ شکر کے پاس صرف دو دن تھے۔ تیسرے دن صبح 9 بجے نمائش تھی۔ سب سے پہلے شکر نے اپنا ٹھکانہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ بالآخر ایک رات ہول میں ٹھہرا۔ اگلی صبح شکر پھر اپنے لیے مکان ڈھونڈنے لگا۔ چلتے چلتے وہ ایک ویرانے میں پہنچ

گیا۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں واقع تھی۔ جس پر کچھ جنگل کا ٹکمان ہوتا تھا۔ یہاں پر تین چار ہزار موجود تھے۔ شکر ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہلکی سی چرچاہٹ سے کھل گیا۔ شکر اندر داخل ہوا۔ گھر بڑا پر اسرار معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی موجود نہ تھا۔ کار ایک ساٹھ سالہ بوڑھا سامنے آ گیا۔ شکر نے دیکھتے ہی غصے سے کہا اور بتایا کہ میرا نام شکر ہے۔ میں دن کے لیے کرائے پر مکان لینا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟

”تم مشہور آرٹسٹ شکر ہونا۔“ بوڑھے نے پوچھا۔ ”جی میں وہی شکر ہوں۔“

بوڑھے آدمی نے اسے مہمان خانے میں انعام کرنے کو کہا اور خود جا کر اپنے مالک کو بتانے چلا گیا۔ شکر کو انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ شکر نے ارد گرد کا طائرانہ جائزہ لیا تو اسے ایک پرانی ڈائری نظر آئی۔ شکر نے وقت گزارنے کے لیے ڈائری اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ پہلے دو تین ورق کورے تھے چوتھے پر کچھ لکھا تھا جو کچھ یوں تھا۔

”اتیس دسمبر 1876“

آج وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اور کہنے لگی۔

”آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ہم کبھی مل نہیں پائیں گے۔ وہ بغیر کچھ سے بہت کچھ بول گئی تھی۔ اور مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور پھر کہا۔

”میری زندگی مسلسل بدلنے جا رہی ہے، میں بھی تمہاری طرح مجبور ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ روٹی ہوئی بنا کچھ سنے بھاگ گئی۔ میرے ہاتھوں میں جو گلابی پھول تھے وہ سڑک پر ہی ہاتھوں سے چھوٹ گئے جو میں اُسے دینے کے ارادے سے لے گیا تھا۔ مگر ان گلابی پھولوں کا نصیب کسی حسینہ کے ہاتھوں کا لمس پانے کے بجائے سڑک کی زینت بنے۔“

شکر نے کمرے کی ارد گرد کی چیزوں سے اندازہ لگایا کہ مالک مکان کوئی باذوق آدمی لگتا ہے۔ کیونکہ اس کمرے میں شکر نے پیانو، رنگ برنگی روشنیاں، خوبصورت آئینہ اور قدیلیں اور دلکش پردوں کے

اور اور بھی بہت کچھ دیکھا تھا۔ اور سب سے حیرت انگیز بات کہ وہ شخص تنہا ویرانے میں رہتا تھا۔ تاکہ کوئی شکر یا اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہ کرے۔

شکر کو بھی اپنے شاہ کار کو تخلیق کرنے کے لیے ایسی ہی انسان جگہ کی تلاش تھی۔ عموماً شاعرانہ ذوق والے لوگ ہالی پسند اور کم نمٹا رہا ہوا کرتے ہیں۔ شکر نے ڈائری کا پتہ پلایا ہی تھا کہ اچانک مالک مکان آ گیا۔ شکر نے غصے سے کہتے ہوئے معذرت کرتے ہوئے ڈائری رکھی اور مالک مکان نے مسکراتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بنایا ہانے کہ اس کی ذاتی زندگی کے راز شکر پر آشکار ہو چکے تھے۔ وہ ایک عجیبہ انسان تھا۔

”میں اس شہر میں نیا ہوں، بالکل اجنبی ہوں۔ محبت چاہتا ہوں سر چھپانے کے لیے۔“

مالک مکان رضامند ہو گیا اور اپنے ساتھ والا گھر شکر کو کرائے پر دے کر رخصت کر دیا۔ یہ مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا، برسوں سے بند پڑا تھا۔ دھول مٹی سے اُٹا ہوا تھا، سوائے ایک پرانی الماری کے کچھ بھی نہ تھا۔ آدھا دن لگا کر شکر نے مکان کو صاف ستھرا کیا۔ الماری کے دراز کو شکر نے جیسے ہی کھولا اس میں سے دو تصویریں، آدھ جلی سگریٹ اور سرخ ٹوٹی چوڑیاں پڑی تھیں۔ تصویریں ایک مرد کی اور ایک عورت کی۔ مرد 36 سالہ اور عورت 26 سالہ لگ رہی تھی۔ اور ایک خط بھی پڑا تھا شکر نے خط کھولا، اس میں لکھا تھا۔

”ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔ نفرتوں اور غلط فہمیوں کی چنگاریوں نے ہمارے دماغوں اور ہماری زندگیوں کو جلا کر خاکستر بنا ڈالا ہے ہمیں مزید اپنی نفرتوں کو ہوائیں دینی۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی ہے۔“

☆☆☆

یہ خط 1872ء کا تھا۔ نفس مضمون سے اندازہ نہ ہو سکا کہ مرد کی طرف سے عورت کو لکھا گیا ہے یا عورت کی طرف سے مرد کو شکر نے خط کو واپس رکھتے ہوئے اپنا فونو فریم لگا کر نمائش میں پیش کرنے کے لیے کچھ خاکے کھینچے لگا۔ کیونکہ شکر کے پاس صرف ایک دن بچا تھا۔ پھر یہ سوچ کر سونے چلا گیا کہ کل مکمل کرتے گا۔ کچھ دیر بعد جب نیند نہ آئی تو سوچا

تصویر بھی مکمل کر لوں مگر غنودگی جھانے لگی اس کے بعد جو ہوا اس کا شکر کو کچھ علم نہ تھا۔ کوئی انتہائی طاقت شکر کے ہاتھوں سے خود بخود کام کر رہی تھی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ تصویر مکمل ہو گئی۔ شکر نیند میں تھا اور تصویر کا اُسے ہوش تک نہ تھا۔

صبح شکر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ دیکھ کر کہ تصویر ایک لڑکی کی تھی جو ہاتھ میں سفید پھول لیے اپنے لب سے ٹکرائے آسمانی وسعتوں کو مسکراتے ہوئے تک رہی تھی۔

”اوہ یہ تو وہی لڑکی جو جو میرے سنے میں آتی ہے اور مجھے نیل کہہ کر پکارتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے چند لکیریں ہی کھینچی تھیں، پھر یہ تصویر کب کیسے اور کس طرح مکمل ہوئی؟“ شکر نے بے ساختہ کہا۔ اس کا دماغ سمجھنے والا تھا۔

یہ دن حیرت میں اپنی گزرا تو شکر نے سوچا کہ نمائش میں یہ ہی تصویر پیش کر دوں۔ کچھ نہ پیش کرنے سے تو بہتر ہی ہوگا۔

☆☆☆

اگلی صبح عجائب گھر میں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ لوگ جی کھول کر اس مورنی کو داد دے رہے تھے مگر جب شکر نے اپنے فن کی نمائش کی تو حاضرین دنگ رہ گئے کہ جو مورنی میں لڑکی جو مو جی وہ شکر کی تصویر کا بھی تھا۔ ایک ہی انداز تھا دونوں کا۔ لوگوں نے جی بھر کر شکر کو اور مورنی کو داد دی اور انعام و کرام سے نوازا۔ شکر اب عالمی معیار کے ٹاپ کا آرٹسٹ میں شمار ہو چکا تھا۔ شکر کے لیے یہ بات نا سمجھ میں آنے والی تھی کہ مورنی والی شکر کی تصویر والی لڑکی اور شکر کے سنے میں آنے والی لڑکی ایک ہی تھی۔ یہ ایک ایسا حیران کن راز تھا جس کے بارے میں شکر پھر بھی نہ جان پایا۔ ہر نوٹم کی رات کو اُسے یہی سنا آتا ہے۔ لیکن اب نوعیت مختلف ہے۔ وہ لڑکی اب اُس سے بہت خوش ہو کر ملتی ہے۔ مگر کیوں۔ یہ کیوں اُس کی زندگی کے ساتھ لگا وہ راز ہے، جو شاید اس نے جنم میں اُس کے ساتھ ہی جائے گی۔ اور یہ Mystry وہ بھی سمجھ نہ سکیا پائے گا۔

☆☆☆



دوسری خوفناک کہانی

ہماری اُدھوری کہانی!



کشف اقبال

اُس ریڈیو آرجے کی جگہ جتنی جس کا ملن اس جہاں میں اُدھورارہ گیا تھا

وہ یکم فروری 2003ء کی خنک رات تھی۔ کارساز روڈ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ یوں جیسے کہ کوئی راز وہاں صدیوں کا دفن ہو۔ شاہراہ فیصل کا وہ علاقہ میری ٹائم میوزیم، ارینا کلب، نامور پرائیویٹ یونیورسٹی نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) اور پاکستان نیوی انجینئرنگ کونسل (PNEC) کی وجہ سے جس قدر پیش بہا سمجھا جاتا تھا۔ مجھے وہ اتنا ہی خوفناک اور نہاں رازوں سے بھرا علاقہ لگتا تھا۔ جیسے وہاں کے چنے چنے پر کوئی نہ کوئی راز صدیوں کا دفن ہو۔ ایک خوف تھا مجھے اس علاقے خاص طور پر اس بلڈ سے جسے کارساز برج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر یہ میری مجبوری ہی تھی کہ مجھے ہفتے کے تین دن اسی راستے پر گزرنا پڑتا تھا۔

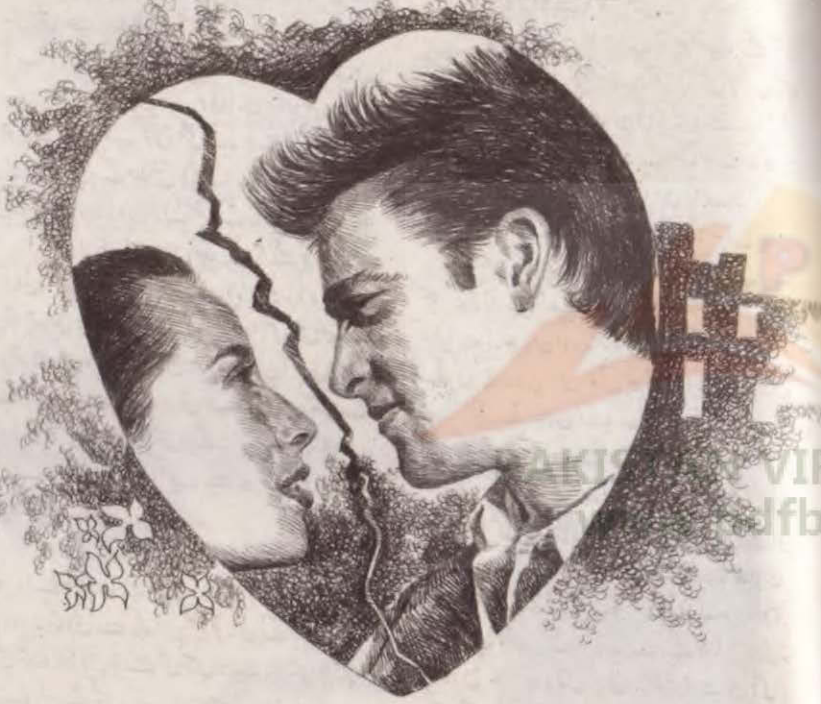
میں، آرجے نسیم سلیم ہوں۔ جو فروری کی 14 تاریخ کو اپنا سر تسلیم تبدیل کرنے والی تھی۔ آج یکم فروری کی رات تھی۔ میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڈ نائٹ ریڈیو شو ملن کا سفر کے لیے میں منٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ ایک تو بڈ نائٹ ریڈیو شو، اوپر سے کارساز کا ٹریفک۔ میں یہ جاب ہرگز نہ کرتی اگر مجھے آرجے بننے کا شوق نہ ہوتا۔ ورنہ کارساز پر آنے کے بعد تو میری حالت

”اچھا اب نہیں کروں گا انتظار، 14 تاریخ تو ابھی کافی قریب ہے۔ کیوں؟“ وہ میرے کانوں میں آ کر بولے۔ ان کی آواز میں اپنائیت تھی، اسے لیے عزت تھی اور بہت ساری محبت۔ مجھے ان کی آواز سے محبت تھی، اور اُن سے عشق۔

”کتنا مزہ آئے گا جب یہ سر براؤن نیوز ہم اپنے کانوں کو سنائیں گے کہ ہم 14 تاریخ کو شادی کرنے جا رہے ہیں۔ جلدی سے اسٹوڈیو چلیں ویسے بھی کافی

میں نے آج کے لیے۔ ویسے ایک بات تو طے ہے، ہمارے فیئر کو ملن کا سفر سے محبت ہو نہ ہو، اس کے دو فرضی کردار عدیان اور عائرہ سے تو عشق سا ہو گیا ہے جیسے۔ کیوں؟ سچ کہا ناں!“ ہم اسٹوڈیو پر دستک دے چکے تھے۔

”ہوں..... ان فیکٹ ان کے عشق کا بخار تو اس قدر بڑھ گیا ہے۔ کہ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ وہ دونوں کردار فرضی ہیں، وہ ان کی کہانی کو اسلئے



لیٹ ہو گئے ہیں۔ آج کی تھیم تیار کر کے لائے ہیں ناں آپ؟“

اسٹوڈیو کی جانب برق رفتاری سے قدم بڑھاتے اپنے دونوں ہاتھوں کو سردی کے باعث ملتے ہوئے میں نے اُن سے دریافت کیا۔

”ہاں! تھیم بڑی زبردست تھیم کی تیار کی ہے۔

لگے ہیں۔“ منیر میرے لیے کرسی سیٹ کرنے کے بعد مائیک کی چیکنگ کرنے لگے۔

”سچ کہہ رہی ہوں، پر آج تو سب اور بھی زیادہ یقین کرنے لگیں گے۔ عدیان اور عائرہ کی سرگزشت پر، یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ہم دونوں بہت جلد ایک نئے رشتے میں گرہ لگانے جا رہے ہیں، کیوں!“

”میں کا سفر آن ایئر ہو چکا تھا، اس لیے میں ان کی بات کا جواب نہ دے پائی۔
منیر نے رومانی گیت لائن آپ کر دیا اور اب ہم دونوں اپنی باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔
منیر نے اسٹوڈیو کے انجینئر صاحب سے کہہ کر دو کپ کیپوچینو (Cappuccino) منگوائی اور ہم دونوں نے اپنے کانوں سے ہیڈ فونز اتار کر سامنے رکھ دیے۔

”منیر مجھے کارساز والے راستے اور خاص طور پر اس بلے سے بہت خوف آتا ہے۔ ایسا کیا ہے وہاں؟ آپ بھی میری یہ بات سن کر پریشان ہو گئے ہوں گے۔ پر میں کیا کروں وہاں کوئی ایسی پراسراریت ہے جو مجھے اپنی جانب پھینکتی بھی ہے اور خوف بھی دلاتی ہے۔ معمول کے مطابق ایک بار پھر میں نے اپنے اندر چھپا کارساز والا خوف منیر کے سامنے ظاہر کیا۔
”خجیوں ڈرتی ہوں اس جگہ سے؟ مجھے تو وہ خاص رومانی اور پرسکون جگہ لگتی ہے۔ وہاں کیسا ڈر بھلا اور یہ تو اچھا ہی ہونا! تم ایک بار پھر وہاں میرے ساتھ چلو گی، ویسے بھی آج ہماری یہاں آخری رات ہے، اس کے بعد 14 فروری تک ہم مل نہیں سکیں گے اور نہ ہی ملن کا سفر کر سکیں گے۔“ منیر میری نگاہوں پر گرتے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے میرے کانوں کے پیچھے اڑنے لگے۔

”ہوں!! ویسے بڑے دل والے ہیں ہمارے گھر والے جنھوں نے ہمیں آج کا آخری شو کرنے دیا، ورنہ شادی سے کچھ دن قبل تو کسی کے گھر والے منٹنی شدہ جوڑوں کو ملنے بھی نہیں دیتے۔“ میں باتیں کرتے کرتے فیس بک پر موصول ہونے والے کوئینٹس پڑھنے لگی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو، ہمارے گھر والوں کو ہم پر پورا اعتماد ہے ناں بھی تو ہم آج یہاں ہیں۔ ویسے تم نے ایک بات نوٹ کی تھی؟“ منیر اپنے جملوں کے آخر میں میرے لیے ایک سوال چھوڑ گئے۔

”کون سی بات؟“ کوئی کے دو کپ جس پر سے غائب ہوتا ہوا دھواں اٹھ رہا تھا، ہمیں پیش کیے

جا چکے تھے۔

”یہی کہ تم نے مجھے کبھی آنی لویو (Love) یا نہیں کہا۔ جب بھی کہا صرف یہی کہا کہ مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں پر کبھی سیدھے منہ اظہار محبت نہیں کیا۔“
”اُف! منیر نے مجھ سے کتنا کھن سوال کر لیا تھا، مجھ سے آج تک ہمت اکٹھا نہ ہو سکی منہ دہنہ آنی لویو کہنے کی۔ میں اک پل کے لیے ہونٹ سی ہو گئی پھر کہنے لگی۔“
”ہیڈ فونز لگا لیجئے کانوں میں۔“

”پر میری بات کا جواب تو دو تھیہ، مجھے آج تمہارے منہ سے آنی لویو سننا ہے بس!“ میں کانوں میں ہیڈ فونز لگا چکی تھی اس لیے ان کی باتیں سننے سے قاصر رہی۔ ”اور اس خوبصورت گیت کے اختتام کے ساتھ ہم لیے چلتے ہیں آپ کو پھر سے پروگرام کی جانب۔“

اور پروگرام کے اختتام پر منیر نے بولنا شروع کیا۔
”فیس بک پر آپ کو کوئینٹس دیکھ کر، آپ کے میسجز کے ذریعے آپ کا پیج جس دیکھ کر ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ عدیان اور عائرہ کی اس گفتگو کے بعد ہم ڈنکے کی چوٹ پر اس خوش خبری کا اعلان کر دیں گے۔“ منیر نے اعلان کر دیا کہ ہم اس خوش خبری کا اعلان کچھ ہی بل میں کرنے والے ہیں۔

وہی بیک گراؤنڈ میوزک، بارش کے قطرہوں کی رچم اور وائسن کی موسیقی ایک بار پھر چلا دی گئی۔

”آپ تو بڑے بانورے ثابت ہوئے عدیان صاحب! محبت کرنے والوں کا بھلا کوئی ایک دن ہوتا ہے؟ یہ اپنے اظہار کے ہونے کے لیے 14 فروری جیسی تاریخ کا انتظار نہیں کرتی، اظہار محبت کسی بھی دن، کسی بھی لمحے کر دیتی ہے، پھر یہ وہ دن اظہار محبت کا، دو محبت کرنے والوں کے لیے 14 فروری کا دن بن جاتا ہے۔“ سمجھے آپ!“ منیر سے منہ سے نکلے جملے اب مسکراہٹ کے لکھے جملے نہ تھے، منیر بھی یہ جملے سن کر ہکا بکا رہ گئے، اب کیا کہیں گے وہ، اب مزہ آئے گا ان کو تنگ کرنے میں، بہت تنگ کر لیا انھوں نے مجھے، پر اب میری باری تھی۔

”اس کا منشا یہ ہوا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھے

لفظ تمہارا انتظار کرنا پڑے گا؟ یہ انتظار صدیوں جیسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے اللہ!“ تو یہ جملے اُن کے تھے، نہ کہ اسکرپٹ کے، پر دیکھا جائے تو اسکرپٹ انھوں نے ہی لکھی تھی۔ تو کیا جواب تک انھوں نے کہا وہ ان کے دل کی زبان تھی؟

”کیونکہ یہ انتظار ہوتا ہے! اور انتظار تو کرنا پڑتا ہے، ہم انتظار کرنا کبھی ترک نہیں کر سکتے، خاص طور پر کسی کے اظہار محبت کا! اب میری نظریں صرف ان پر تھیں اور ان کی مجھ پر، دوبارہ ہماری کیپوچینو، جس پر سے کچھ دیر قبل دھواں اٹھ رہا تھا، اب بالکل سرد پڑ چکی تھی، پر اس کا ایک گھونٹ بھی اب تک ہم دونوں کے گلے میں نہیں اترتا تھا۔ اس قدر محو تھے ہم۔ ملن کا سفر میں پھر ایک دوسرے میں۔

”اگر میں نے انتظار محبت کرنا چھوڑ دیا ناں، اور اس دنیا سے تمہارا اظہار نے بغیر چلا گیا، تو بہت روؤ گی تم! سمجھیں!“ ان کی آواز میں محبت تھی اور الفاظ میں دھمکی، میں رنہ رنہ پائی اور کہہ بیٹھی۔

”میں بہت محبت کرتی ہوں آپ سے منیر، آئی ریلی لویو! پلیز ایسا مت کہیں۔“

تمام تر الفاظ آن ایئر جا چکے تھے۔ تمام سننے والوں نے ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ اظہار محبت ڈنکے کی چوٹ پر کیا جا چکا تھا۔ میں بالکل ساکت ہو گئی، یہ سوچنے کے بعد کہ میرے کہے تمام الفاظ آن ایئر جا چکے ہیں۔ میں دم سادھے اپنی کرسی پر ڈھسے گئی۔

منیر نے سامعین کے لیے ایک گیت چلا دیا، پھر اپنے ہیڈ فونز رکھ کر کرسی پر اپنے دونوں بازوؤں کو سر کے پیچھے لے جا کر ٹیک لگائے مجھے مسکرا کر دیکھنے لگے، جیسے ان کا کوئی اولین مقصد پورا ہو چکا ہو۔

”آئی لویو تو تھیہ!“ مجھے پتا نہیں چلا کہ انھوں نے میرے کانوں پر سے کب ہیڈ فونز ہٹائے اور میرے کانوں کے بالکل نزدیک آ کر جوابی اظہار پیش کرنے لگے۔

”آپ بہت وہ ہیں منیر، مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے، بھلا اس طرح کروا تا ہے کوئی کسی سے محبت کا اظہار؟ بات مت کریں آپ مجھ سے۔“ میں ہیڈ فونز اُن کے کرکے بیٹھ گئی۔

”تھیہ! جہاں محبت ہوتی ہے وہاں اظہار بھی ہوتا ہے اور جہاں اظہار نہ ہو، وہ محبت ادھوری رہتی

کچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول ’ناشور‘ کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تحریات اور اصل حقائق و اثرات
سعادت و محنت کا حساب، حیرت و تجسس پرتی ناول

ناشور
تحریر: شازی سعید مغفل

۳۵۰ صفحات

Postage
Rs: 50

برصغیر میں علمِ تخییر کے بانی حضرت کاش البرہی کی
عالمیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا
کے تحریات و شہادت پر اسراریت کے نت نئے راز کھولنا ایک
عمر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرہی کی ”بنام“

”ناشور“ ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کروئیں یا اپنے قریبی بکسٹال پہ اپنا آرڈر بک کروائیں۔

Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800



قیمت: ۵۰۰ روپے

سائیس مجھ سے چھین لی گئی تھیں، کچھ نہیں بچا تھا میرے پاس۔ شادی کے بعد کے خواب جو ہم نے ساتھ دیکھے تھے، ہمارا بانی مون، ہمارے بچے، سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا بس زمین چھٹنے کی دیر جی جس میں مجھے ذن ہو جانا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز لوگ مجھے دلا سے دے کر جانے لگے، جبکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ ان کے دلا سے میرے لیے کچھ نہ کر پائیں گے۔ میری عدت کے دن شروع ہو گئے تھے جو بحر کے دنوں سے کہیں زیادہ دردناک اور جان لیوا تھے۔ مجھے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی۔ میں آج بھی اپنے سرال میں موجود ہوں۔ رات کے ایک بجے جب سب سو گئے تھے، تب میری نند نے میرے کنبے پر میری مدد کی اور چوری چھپے اپنے ڈرائیور کے ساتھ مجھے وہاں بھیج دیا جہاں میں نے اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت لمحات گزارے تھے۔

”ملن کا سفر“ اسٹوڈیو، مائیک، ہیڈ فونز، منیر کی کرسی۔ بقول فیجر صاحب ہمارے جانے کے بعد کوئی بھی ”ملن کا سفر“ اور اس اسٹوڈیو میں جگہ نہ لے سکے گا۔ مجھے اب بھی اس اسٹوڈیو کے چپے چپے سے منیر کی خوشبو آ رہی تھی۔ ان کا میری جانب دیکھنا، مجھے اپنی حفاظت میں رکھنا اور..... مجھے اپنے گلے سے لگانا۔

شاہد اللہ جانتا تھا کہ منیر مجھ سے ملن سے پہلے ہی جدا ہو جائیں گے اس لیے شادی سے پہلے مجھے ان کو محسوس کروادیا۔ میں بہت بڑی طرح رو دیتی اگر تھوڑی دیر اور بھی اس اسٹوڈیو میں رہتی۔ اس لیے میں وہاں سے باہر آ گئی۔ میں نے فیجر صاحب اور بقیا تمام لوگوں سے پردہ کیا ہوا تھا۔

ایک بار پھر زندگی مجھے اس راستے پر لے چلی جہاں سے مجھے خوف آتا تھا اور بچا آتا تھا۔ اس راستے نے مجھے میرے منیر سے جدا کیا۔ ہمارے ملن کے سفر میں رکاوٹ بنا، اس راستے کے لیے میں جتنی بدعاؤں کروں، کم ہیں۔

اب میں پل کی اس جگہ آ گئی تھی جہاں سے

رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ میرا ہاتھ لے بیٹھے تھے۔ جبکہ میرے منہ پر پوری طرح کھٹکتا تھا۔ اتنے میں سامنے سے ایک ٹرک آیا، جو ایک دے پر چلا آ رہا تھا اور ہماری پھولوں سے بھئی گاڑی اس سے جا بکرائی۔ گاڑی ٹرک سے ٹکرانے کے بعد کارساز کے پل سے نیچے جا گری جہاں صرف ریل کی پری تھی اور بجلی آبادی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میرے آس پاس عجیب و غریب قسم کی چیزیں تھیں، دوائیوں کی بدبو، ECG مشین اور میرے ہاتھوں میں لگی ڈرپ۔ میں اسپتال میں پائی تھی۔ آنکھ کھولتے ہی میرے دماغ میں کارساز روڈ کی دھندلی سے تصویر ابھر آئی، ہماری شادی کی رات تھی، میں گاڑی میں بیٹھی تھی اور انھوں نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ منیر!

میں نے اپنے ہاتھوں میں لگی ڈرپ نکال پھینکی اور پورے اسپتال میں منیر منیر چلانے لگی۔ نہیں مجھے پکڑنے لگیں پر میں حواس باختہ ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے سے کچھ فاصلے پر اپنے اور منیر کے گھر والوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو دوڑ کر ان کے پاس چلی گئی۔

میری جان! میری تسمیہ تم ٹھیک تو ہونا؟ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میری بچی کو بچالیا۔“ مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہاں موجود لوگوں میں سے کون میرے ابو تھے اور کون میرے سرسمرگروہ آواز میری امی کی لگ رہی تھی۔

”منیر کہاں ہیں؟ کہاں ہیں میرے منیر؟ کوئی کچھ بولتا کیوں نہیں۔ میرے منیر کہاں ہیں۔“ میں نے بہت بڑی طرح چلانا شروع کر دیا۔ پر کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ اتنے میں میرے سامنے سے ایک مردے کو لے جایا جا رہا تھا جس کے منہ کے اوپر چادر تھی۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اس چادر کو ہٹا دیا تو دیکھا کہ وہ مسکراتا ہو چہرہ میرے منیر کا تھا۔ مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں بیوہ ہوئی تھی، شادی کی پہلی رات کو ہی میرا گھر اجڑ گیا تھا، میری

کردار ادا کیا، خاص طور پر اس میں جنم لیا۔ دو اہم کردار عدیان اور عازہ نے جو ہمارے دونوں تھے۔ یہ ہمارا بچلے آخری شو ہے مگر نہیں تو ہمارے بعد کوئی اور اس سفر کو جاری رکھے۔ آپ کو ہمارے بعد کوئی اور عدیان اور عدیان مل جائیں گے جو کل کو ”ملن کا سفر“ کا یہ سفر جاری رکھیں گے۔ پر یہ سفر بھی ختم ہونے نہ پائے گا۔ منیر نے مسکراتے ہوئے مجھے بولنے کا موقع دیا۔

”دلوں کی سر زمین کو تو ہونے کے لیے۔ کسی دم بھگم کی ضرورت کہاں ہوتی ہے عشق جب دونوں سمت عروج پر ہو تو یہ آگ کا دریا بھی محبت کی برسات بن کر برسے لگتا ہے۔“

”تھی ”ملن کا سفر“ کی ٹیگ لائن جو کبھی تبدیل نہ کی جا سکی کیونکہ ہمیں یہ لازماً دہرانے کی عادت تھی ہو گئی تھی۔ ان چند سطروں سے ہمیں محبت سی ہو گئی تھی۔ ان سطور کی ایک ایک سطر پر ہمیں یقین ہو گیا تھا۔

جائے انجانے میں اتنا کہوں گی کہ ہماری ازدواجی زندگی کے لیے آپ سب کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔“ اور پھر ہم نے ”ملن کا سفر“ اور عدیان اور عازہ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

☆☆☆

آج 14 فروری کی رات تھی۔ ہماری شادی کی رات۔ میرے ہاتھوں پر ان کے نام کی مہندی رچی تھی اور میری دھڑکنوں پر ان کے نام کی سائیس دم لے رہی تھیں۔ وہ آج بانی دونوں سے کہیں زیادہ فریش اور حسین لگ رہے تھے۔ نکاح کے دو بولوں کے بعد میں آفیشلی تسمیہ منیر بن گئی تھی۔ منیر! رخصتی ہو چکی تھی اور اب ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ مگر آج، ایک بار پھر مجھے اس خوفناک پل پر سفر کرنا پڑا، اپنی شادی والی رات کو بھی۔ پتا نہیں یہ راستہ میری زندگی کا حصہ اب تک کیوں بنارہا۔

ہم کارساز برج پر پہنچ چکے تھے۔ ٹریفک ذرا بھی جام نہیں تھا ان دنوں شادیاں رات دیر تک ہوا کرتی

ہے۔ کچھ تنگی سی رہ جاتی ہے اس میں۔ میں تمہارے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں میری ہونے والی مسز منیر! مجھے پتا تھا تم کبھی اظہار کرنے والی نہیں ہو، اسی لیے مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے آج تم نے میرے یقین کو اور پختہ کر دیا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو! وہ میرے پیچھے کھڑے تھے اور میرے کانوں کے قریب سر جھکا کر محبت کی زبان بول رہے تھے۔

میں اپنی کرسی پر سے فوراً اٹھ گئی اور ان کے گلے لگ گئی۔ مجھے نہیں پتا کہ اس وقت مجھے کیا ہوا تھا۔ بس اُن کے کھونے کا ڈر بھی مجھے قریب اتار دیتا تھا۔

”منیر مجھے کبھی چھوڑ کر مت جائے گا آپ کو قسم ہے میری!“ میں ان کے گلے پہنی بارگاہی تھی اور جب انھوں نے مجھے خود سے لگایا تو میں نے خود کو بہت محفوظ پایا تھا۔

”تمہاری قسم! تمہیں کبھی تمہارے نہیں جاؤں گا۔“ وہ مجھے اسٹوڈیو میں گلے لگا کر اپنی محبت کا یقین دلانے لگے۔ وہ اسٹوڈیو، جو ہمارے لیے اب ایک یادگار بن کر رہنے والا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

”وہ..... وہ..... گیت ختم ہونے والا ہے، ہمیں ”ملن کا سفر“ کا اختتام بھی کرنا ہے۔“ میں نے خود کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے دور کیا اور اپنی کرسی پر براہمن ہو گئی۔

”لیکن ایک بار پھر ہم آپ کے سامنے حاضر ہیں ”ملن کا سفر“ میں آپ کو انتظار کروائے بغیر ہم آپ کو یہ خوش خبری سنانا چاہتے ہیں کہ..... کہ میں اور تسمیہ اس ماہ کی 14 تاریخ کو شادی کے بندھن میں بندھنے جا رہے ہیں۔ ہم شادی کر رہے ہیں۔“ منیر نے ہماری شادی کا اعلان بالآخر کر ڈالا۔

”جی ہاں! اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلیں کہ آج کا شو ہمارا آخری شو ہے، ”ملن کا سفر“ ہمارے لیے بہت بہت زیادہ خوب صورت ایکسپریس تھا۔ منیر کی باتوں کو میں نے آگے بڑھایا۔

”اور ہاں! یہ بات کہنا بجا ہوگا کہ ”ملن کا سفر“ نے منیر اور تسمیہ کو ایک کرنے میں بہت زیادہ اہم



Poora Pakistan Raha Hai Bol Hashmi Ispaghool

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Hashmi Ispaghool
DAILY LA FIT RAHA

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1794

”میں اب روح بن گیا ہوں تسبیہ، جو آج تمہیں دلاسا دینے یہاں آیا ہوں۔ تم بس میری باتوں کا جواب دو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میری جان!“ ان کی آنکھوں میں میرے لیے پریشانی تھی۔

”ہاں! ہاں! تسبیہ بہت محبت کرتی ہوں آپ سے، ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی ہوں آپ کے۔“ میں نے روتے روتے ان سے کہا۔

”تو بس میرے لیے دو کام کرنا! اگر مجھے حاصل کرنا ہے تو میرے لیے دو قربانیاں دینا پڑیں گی۔“ انھوں نے میرے مہندی والے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”صرف دو قربانیاں؟ میں خود کو آپ کے لیے قربان کر دوں اور آپ صرف دو کی بات کرتے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

”یہی کام تو تمہیں نہیں کرنا۔“ وہ بولے۔

”تو پھر؟“ میں نے تجسس ظاہر کیا۔

”سہلا کام یہ کہ تم بھی خودکشی کرنے کی کوشش نہیں کرو گی، نا ہی بھی مرنے کی بددعا کرو گی اور دوسرا کام تو تم ویسے بھی نہیں کر دو گی۔ پر میں تمہارے معاملے میں پوزیٹو ہوں اس لیے کہہ رہا ہوں، چاہے پوری کائنات تمہاری دوسری شادی کروانا چاہے تم ہرگز نہ کرنا، تم صرف میری تسبیہ ہو، میری روح کی طرح ہوا میں تمہارا انتظار کروں گا اُس دنیا میں!“

وہ اپنے آخری کلمات دہراتے ہوئے غائب ہو گئے۔ پر اُن کی وہ ایک ملاقات ملن کی امید دے گئی، جیسے کا سہارا دے گئی۔

☆☆☆

آج میں اڑتیس سالہ تسبیہ ہوں جس کی دنیا بھر نے شادی کروانا چاہی پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اگر میں ہوں تو صرف تسبیہ کی۔ اب مجھے صرف اپنی موت کا انتظار ہے۔ جو اللہ کی مرضی ہے، جب چاہے دے، تب ہمارا یہ ملن کا سفر کامل ہو جائے گا اور ہماری ادھوری کہانی مکمل ہو جائے گی ہم ایک ہو جائیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

ہماری گاڑی نیچے گری تھی۔ پہلے تو میں پل کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھنے لگی، پھر کچھ دیر بعد پل کے نیچے اتر کر اس جگہ چل پڑی جہاں ہماری گاڑی گری تھی۔ جس جگہ سے مجھے اپنی نفرت بھی آج میں اس جگہ کے دل میں کھڑی تھی۔ منحوس جگہ! اس حادثے کو صرف ایک ہی دن گزرا تھا اس لیے ہماری گاڑی وہاں سے اب تک اٹھائی نہ گئی۔

میں نے اظہار محبت کر تو دیا تھا تسبیہ پھر آپ کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر؟ جھوٹے ہیں آپ، دھوکے باز ہیں، میرے نام کی جھوٹی قسم کھائی آپ نے۔ میں آپ کو بھی معاف نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ پر! ایسا تو تب ہو گا ناں جب میں زندہ رہوں گی۔ میں بھی خود کو مار دوں گی۔ نہیں رہنا مجھے آپ کے بغیر اس دنیا میں۔

”یہ ملن کا سفر ہے جو صرف سانس کا کام نہیں کرتا۔ سانس تو مرنے کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں، یہ روح کا کام کرتا ہے، احساس کا کام کرتا ہے، اگر ہمارے چاہنے والے ہم سے پھر بھی جا لیں تو ان کی محبت بھری آواز ہمیں سنائی دیتی ہے۔“

یہ الفاظ تو تسبیہ کے تھے، مجھے تو یہ الفاظ یاد بھی نہیں پھر یہ مجھے سنائی کیوں دے رہے تھے؟ میں نے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو وہ پیچھے سے میرے پاس آرہے تھے، وہ تسبیہ تھے، میرے تسبیہ۔ شادی والی شیروانی پہن کر وہ میرے پاس آرہے تھے۔

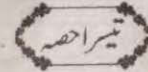
”تم بہت محبت کرتی ہو ناں مجھ سے؟ مجھے اپنا نا چاہتی ہو؟ ہمیشہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟“ وہ میرے قریب آ کر مجھ سے پوچھنے لگے۔

”تسبیہ آپ زندہ ہیں! حیرت جو بھی ہے، میرے ساتھ چلیں، گھر والے بہت خوش ہوں گے آپ کو دیکھ کر۔“ ان کو دیکھ کر میرے مردہ جسم میں جان آ گئی تھی۔ اور میں ان کے گلے لگ گئی، ٹھیک اسی طرح جس طرح ملن کا سفر کے آخری دن لگی تھی۔ مگر یہ کیا ہوا؟ ان کے گلے لگنے کے چکر میں میں خود آپ کو ہی چھو گئی۔

بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت



خواہش امن تو ہر ذہن کی مجبوری ہے
اب تو جھجھکا بھی نام ہیں ہلاکت پہ یہاں
یہ ہے وہ لمحہ جہاں جوش و جنوں بھی سوچیں

آزمائش ہے قیادت کی۔ تدبیر کی۔ بصیرت کی
یہاں اب اگر جیت ہے تو صرف حقیقت کی یہاں

خواب کوشش سے حقیقت میں بدل سکتے ہیں
پر حقیقت - تو کبھی خواب نہیں بن سکتی
آئیے مان لیں۔ ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا
سرحدیں خون سے لکھی ہوئی تقدیریں ہیں

سرحدیں دل میں ابھرتی ہوئی تصویریں ہیں
آئیے مان لیں ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا

ایک طویل دن بیت چکا ہے۔ اس روز
کتنے تاریخی واقعات گزرے ہیں۔ کتنے
ہنگامے رہے ہیں۔ ٹی وی چینل بہت کچھ
دکھاتے رہے ہیں۔ دکھا رہے ہیں۔ دلی سو

ایک شام پاک ہندوؤں کے نام۔ ڈھل رہی
ہے۔ رات بھٹکنے لگی ہے۔ میں نے یہاں کے لیے
خاص طور پر نظم لکھی ہے۔ جس کا ابھی کوئی عنوان نہیں
دیا ہے۔ میں داؤ پیٹتے ہوئے بیٹھ رہا ہوں نظم آپ بھی
لاحظہ کیجیے۔

رات کی کوکھ سے ہوتا ہے سویرا پیدا
جنگ کی راکھ سے ہی امن جنم لیتا ہے

ہو چکی رات بہت ہی لمبی
ہو چکی رات بہت ہی کالی
جنگ تو کتنے ٹکڑے پھونک چکی
کتنی ماؤں کے جگر کاٹ چکی

بہہ چکا کتنا لہو۔ گرم لہو۔ تازہ لہو
دشت و صحرا میں۔ پہاڑوں میں گلی کوچوں میں
رنگ لاتا ہی نہیں اب تو شہیدوں کا لہو

اب یہ لگتا ہے کہ تاریخ نے کروٹ بدلی
شل ہوئے ظلم و ستم کے بازو
تھک گئے خون بہانے والے

رہی ہے۔ کل آگرے روانہ ہونا ہے۔

15 جولائی 2001ء

اتوار صبح کی کرنیں۔ درتچے پر دستک دے رہی
ہیں۔ آگرہ ہماری منزل ہے۔ اخبارات کل کے
طویل دن کی خبروں اور تصویروں سے بچے ہیں۔ اور
آج کے تاریخی دن کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔
امیدیں باندھ رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف۔
وزیراعظم واجپائی اپنے اپنے طباعروں سے آگرہ پہنچ
چکے ہوں گے۔ ہم بسوں میں نکلے ہیں۔ ہوٹل سے
پہلے دہلی سے باہر نکلنے میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے ہیں۔
راستے میں چائے وغیرہ کے لیے رکے ہیں۔ اس
درمیان ہی پڑاؤ کبھی بھارت کی ساحتی کارپوریشن نے
ایک ساحتی مرکز بنادیا ہے۔ اچھی چائے، اچھے
کھانوں اور شروبات کے ساتھ بھارت کی
دستکاریوں کے شوروم بھی قائم کیے گئے ہیں۔ جوسایح
جلدی میں ہوتے ہیں۔ وہ جو چیز جہاں اچھی لگے۔
خرید لیتے ہیں۔ آگے کا انھیں پتا نہیں ہوتا کہ وقت
ملے نہ ملے۔ چیز ملے نہ ملے۔

یہاں ہمارا قیام مغل شہنشاہ میں ہے۔ یہ موریہ
شہنشاہ میں ہے، ہی تعلق رکھتا ہے۔ کمرؤں کے لیے تو ابھی
رٹش ہے۔ دیر لگے گی۔ جین ٹی وی والے پوچھتے
پھر رہے ہیں کہ جنگ کے محمود شام کون ہیں۔ آئیے
آئیے کچھ دیر کے لیے آپ سے بات کرتی ہے۔

”میں نے ابھی چیک ان بھی نہیں کیا۔ سامان
بھی یہیں پڑا ہے۔“

”یہ ہمارا آدمی یہاں رہے گا۔ چلے جائے راتیش تو
یہاں بیٹھ بٹنا نہیں۔“ آئیے شام جی۔ اور چھت پر
چلتا ہے۔ انٹرویو لایو جائے گا۔ یہ موبائل لیں یا اپنے
گھر کا نمبر بتائیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو
دیکھ بھی لیں گے۔ سن بھی لیں گے۔

”نہیں بھائی ہمارے کیبل چینل نہیں آتا۔“
”کھانا کھائیں گے آپ۔“ جین نے ہوٹل کے
جس کمرے کو اسٹوڈیو بنایا ہے۔ اس کے ساتھ
والے کمرے میں کھانا چل رہا ہے۔

”چائے پی لیں۔ آپ ابھی تو پہنچے ہیں۔

ہاں چائے چل جائے گی۔

”چائے ہاتھ میں لیے۔ ہم سڑھیاں عبور
کر رہے ہیں۔ چھت پر چینلوں نے تجھے لگائے
ہوئے ہیں۔ سی این این، بی بی سی، زی، چین، اشار،
سب موجود ہیں۔

مذاکرات سے کیا امیدیں ہیں۔
میں کہہ رہا ہوں کہ دونوں ملکوں کے غریب عوام
واجپائی جی۔ اور پرویز مشرف صاحب کی چوٹی
کانفرنس سے بہت سی امیدیں باندھے ہوئے ہیں۔
وہ سوچ رہے ہیں کہ ان کی مونی زندگی میں رونقیں
آجائیں گی۔ اگر دونوں نے ان غریب لوگوں کو
ساننے رکھا اپنے فیصلے کئے تو وقت اس کی دسترس میں
ہوگا۔ اور اگر انھوں نے اس غریب کے دل کی آواز
نہی۔ تو تاریخ ان سے ناراض ہو جائے گی۔

واپس۔ استقبالے پر۔ کمرے میں ابھی دیر لگے
گی۔ ہم میڈیا سینٹر دیکھنے چلے آئے ہیں۔ بہت
خصوصی انتظامات ہیں۔ بریفنگ ہال۔ جہاں سو سے
زیادہ کیمرہ مینوں کے لیے الگ الگ جگہ مخصوص
ہے۔ خبریں سمجھنے کے لیے کمپیوٹر ٹیکس مشین، فون، اردو
کمپیوٹر کا بھی انتظام ہے۔

لیکن پاکستانی سفارت خانے نے اپنا انتظام
الگ کیا ہوا ہے۔ جہاں انٹرنیٹ۔ فیکس، فون
سب کچھ دست یاب ہے ساتھ ایک مختصر سا
بریفنگ روم ہے۔

میڈیا سینٹر کے باہر ان میں بھی کچھ چینلوں نے
پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ یہیں سے براہ راست نشریات
جاری ہیں۔ ششما سورا جی آرہی ہیں۔ دور درشن
والوں نے انھیں کیمرے کے سامنے بٹھا دیا ہے۔
مذاکرات کی کیا خبر ہے۔ بلے اچھے جارہے ہیں۔
تمام مسئلوں پر بات ہو رہی ہے۔ سرحد پار دہشت
گردی۔ داؤ دا براہیم پر بھی کچھ مسئلوں پر بات ہو رہی
ہے۔ دور درشن والے والے نے کشمیر کا پوچھا ہی
نہیں۔ ششما جی نے خود بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بھارت کی ترجمان نوپو مارائے
آ رہی ہیں۔ انھوں نے چار سطر کا بیان پڑھا ہے۔

اور کہا ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ وہ سوالات نہیں سنیں گی۔ چار سطر کے اس بیان کا اصول تو یہی ہوتا ہے کہ جب یہ طے ہو کہ مذاکرات کی ترجمانی ایک صاحب یا صاحبہ کریں گی۔ اور دونوں ملکوں کی طرف سے جو بھی مشترکہ یا متفقہ بیان طے ہوگا۔ اسے ہی کافی سمجھا جائے گا۔ ششاکوئیل ویژن پر آنا ہی نہیں چاہیے تھا اس کے بعد چھ میگزینیاں چل پڑی ہیں۔ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے۔

پاکستان کے سیکریٹری اطلاعات سید انور محمود اور آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل راشد قریشی ہوں میں نظر آتے ہیں تو انھیں بھارتی صحافیوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ انتہائی محتاط انداز میں بات کر رہے ہیں۔ لیکن صحافی ان سے کچھ کہلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ کہا ہے کچھ نہیں بھی کہا ہے پاکستان کے وفد پر پاکستان کے عوام کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا ہے۔ بھارت چینلوں سے پاکستانی ناظرین نے جب یہ دیکھا اور سنا کہ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے احتجاج کیا ہے کہ پاکستان کے سربراہ اور پاکستانی وفد آگے کیا کرنے گئے ہیں۔ رات گئے پاکستان نے بیان جاری کیا ہے کہ کشمیر ہی بھارت پاکستان کی گفتگو کا مرکزی نکتہ ہے۔

اندازہ ہو رہا ہے کہ پاکستان بھارت مذاکرات آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ امیدیں جو بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ دم بھری ہوئی ہیں۔ رات کو ہوں میں بھارتی حکومت کی طرف سے پر تکلف عشاء یہ ہے۔ کھانا بھی ہے۔ پینا بھی۔ گانا بھی ہے۔ ناچنا بھی۔ یہ ایک مقام اور ایک کیفیت ہے جہاں بھارتی اور پاکستانی ایک ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر اور دانشور ثقافت، شعر و شاعری انھیں اپنے مختلف ہونے کا یقین غالب ہونے لگتا ہے۔

میں نے آج اپنی یہ خصوصی رپورٹ سمجھوائی ہے۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے سیاست اور سفارت میں انتہائی کم مدت کا تجربہ ہونے کے باوجود بھارت میں صرف 36 گھنٹے کے قیام کے دوران بھارت کی نصف صدی سے زیادہ عرصے کی

راج نیقی۔ جوڑ توڑ، اور سفارت کاری کا تجربہ رکھنے والی قیادتوں پر اتنی سبقت حاصل کر لی ہے کہ بھارتی ٹی وی چینل کے ماہر نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر صدر پاکستان اور وزیراعظم بھارت کی مشترکہ پریس کانفرنس ہوئی تو یہ بھارت کے لیے ایک ریلیشنز (تاثر قائم کرنے) Disaster (خالی) ہوگی۔ کیونکہ ان کے بقول واجپائی جی بہت سست بولنے والے اور زیادہ مؤثر نہ کرنے والے ہیں۔ پرویز مشرف بہت مستعد۔ تیز رفتار۔ اور چالاک ہیں۔ عالمی رائے عامہ کے سامنے پاکستان زیادہ حمایت حاصل کرے گا۔ صدر پرویز مشرف نے دہلی ایئر پورٹ پر آمد سے گاڑز آف آزمہ تھا گاندھی کی سادھی۔ ظہرانے، استقبالے۔ اور ضیافت سے تاحمل کی سیر تک بغیر کچھ کہے اپنے لباس کی تبدیلی۔ چال مسکراہٹوں اور بے تکلفانے ملنے سے بھارت کے میڈیا کو حیرت میں اور بھارت کے عوام کو قربت میں ڈال لیا ہے۔ ہفتے کی صبح تک جتنا تاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ صدر پرویز مشرف کی پراعتماد بے تکلفی نے اسے کبھی کر ایک نری میں تبدیل کر دیا ہے۔ بھارتی سرکاری حلقے سیاسی جماعتیں اور میڈیا سخت تعجب میں ہے کہ پاکستان کو آگرہ مذاکرات میں کیا لیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وزیراعظم واجپائی اور صدر پاکستان کی تنہا ملاقات میں پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر کچھ اشارہ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے صدر پاکستان سے لے کر پاکستان کے وفد کے ارکان اور پاکستانی صحافیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہفتے کی صبح سے پاکستان اور بھارت کی قیادتوں نے ایک دوسرے کے حمل، بصیرت، تدبیر اور گہرائی کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس پہلی تنہا ملاقات میں دونوں ملکوں کے درمیان مسائل کے انبار میں سے کچھ نکات نکلے گئے۔ مسئلہ کشمیر سرفہرست ہے۔ جو پاکستان کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ انتہائی کشیدگی اور تلخیوں کے بعد ہونے والی اس سربراہی ملاقات کے لئے پہلے سے باقاعدہ کوئی ایجنڈا مذاکرات کے لیے نکات کی فہرست مرتب نہیں کی گئی تھی۔

اس لیے دونوں سربراہوں کو گزشتہ کئی سال سے دونوں ملکوں کے افقی پر میڈیا لاتے ہوئے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے انھیں ایک ترتیب میں لانا تھا۔ اس ترتیب کو لے کر انھوں نے اپنے اپنے وفد کے ارکان کے ساتھ ملاقات کی دونوں وفد کے ارکان نے اپنے سربراہوں کے درمیان غیر رسمی طور پر رابطہ بنانے والے نکات کو سمجھا اور بعد میں الگ الگ بیٹھ کر ان نکات کا تجربہ کیا۔ اور پھر ترتیب دی سرکاری اور وزارت سطح پر ترتیب پانے والے نکات تمام کی سربراہی تنہا ملاقات میں تجدیدگی سے زیر غور آئے۔ صبح کو ہونے والی ملاقات کی نسبت شام کی ملاقاتوں میں رسمی انداز اور ضابطے غالب رہے۔ دونوں سربراہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں بات چیت جو تاثرات قائم رکھے تھے۔ وہ ملنے سے دور ہو گئے ہیں۔ دونوں نے یہ جان لیا ہے کہ ایک دوسرے سے مسائل پر مفاہمت کیسے کی جاسکتی ہے۔ پاکستان کو یہ برتری حاصل ہے کہ حکومتی سطح پر سربراہی ملاقات کے سلسلے میں اختلافات نہیں ہیں بھارت کے لیے یہ مشکل ہے کہ اس کی کابینہ میں بھی ملاقات کے مخالفین ہیں۔ اور بیوروکریسی میں بھی۔ پھر بھارت کا میڈیا بالخصوص ٹی وی چینلز فوری اور قبل از وقت تبصرے کر کے گفتگو شروع کر رہے ہیں۔ اور پرویز مشرف کے دونوں ملاقاتوں اور سرگرمیوں کے بعد آگرے کی فضا میں مذاکرات کے لیے مثبت انداز فکر غالب ہے۔ اگرچہ سب کو حیرت ہے کہ انتہائی متضاد اور متضاد موقف رکھتے ہوئے کون سا مشترکہ نکتہ ہے۔ جو پرویز مشرف اور واجپائی نے دریافت کر لیا ہے۔ جو مذاکرات کو آگے بڑھانے کا محرک بن رہا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے تو کہا تھا کہ میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر۔ ہرمغریوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ تاج محل کی قربت میں ہونے والی اس ملاقات میں جنوبی ایشیاء کے کروڑوں غریبوں نے امیدیں باندھ رکھی ہیں۔

اصل مسئلہ یہی ہے کہ دونوں کے موقف متضاد

اور متضاد ہیں۔ وہ مشترکہ نکتہ کون سا ہے۔ اتفاق کا مرکز یا نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔

16 جولائی 2001ء

صبح سویرے صدر پرویز مشرف کی ناشتے پر بھارت کے چند منتخب مدیروں کے ساتھ ملاقات ہے۔ جس کی ریکارڈنگ ٹی وی کی ہے۔ ہم موقع غنیمت جان کر تاج محل دیکھنے نکلے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی تاج محل آنا ہوا تھا۔ تاج محل میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ اور نہ بھارت پاکستان کے تعلقات میں۔ محبت کی یہ امر یادگار۔ جنوبی ایشیاء میں محبتیں نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ ہوں واپس پہنچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ 9 نکات پر کوئی سمجھوتہ ہو رہا ہے۔ ساڑھے چار بجے سہ پہر دستخط ہوں گے۔ سب کچھ طے ہو گیا۔

کچھ طے نہیں ہوا۔ مذاکرات ٹوٹ گئے ہیں۔ ششما سوراج آ رہی ہیں۔ وہ وضاحت کر رہی ہیں کہ انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ خواہ خواہ طوفان برپا ہو گیا ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب ایک باقاعدہ ترجمان مقرر ہے۔ آپ کوئی وی سے انٹرویو دینے کی ضرورت کیا تھی۔

لایوں میں سرگوشی ہو رہی ہے کہ ششما سوراج نے جان بوجھ کر بلکہ ایل کے ایڈوانائی کے کہنے پر ٹی وی میں یہ بیان دیا کہ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے۔ اب صدر پرویز مشرف کی ایڈیٹروں سے ناشتے پر گفتگو بھی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اشاری وی نے اس کی پوری فلم چلا دی ہے بھارت کے صحافی کہہ رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف کو یہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ گفتگو ریکارڈ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ٹی وی چینلوں کی لڑائی نے انتہائی سنگین مذاکرات کو اپنی رقابت میں سبوتاژ کر دیا ہے۔ رات کے 10 بج گئے ہیں۔ گوہلوی کیفیت ہے۔ 11 بجے رات آخری لئے شور مچا ہے۔ صدر پاکستان پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔ ہوں سے تمام صحافی کی قیام گاہ امرولا کی طرف دوڑ رہے ہیں بس سے گاڑیوں سے۔

پھر آنے والے بتا رہے ہیں کہ پریس کانفرنس نہیں ہو سکی۔ اخبار نویسوں کو اندر ہی جانے نہیں دیا گیا۔ پھرتی وی چینل دکھا رہے ہیں۔ آخری لمحات آگئے ہیں۔ عقاب جیت گئے ہیں۔ امن کی تلاش ناکام ہوئی ہے۔

صدر پرویز مشرف، وزیر اعظم واجپائی سے الوداعی ملاقات کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر اداسی ہے۔ صدر مشرف کا چہرہ سخت کھنچا ہوا ہے۔ حال واجپائی کا بھی یہی ہے۔

بھارتی ترجمان نے چند سطروں کی بریفنگ دی ہے۔ اس کے بعد کوئی سوالات طلب نہیں کیے ہیں۔ پاکستان کے صحافیوں کا اصرار ہے کہ وہ بتائیں مذاکرات کیوں ٹوٹے ہیں۔ صدر پاکستان کو پریس کانفرنس کیوں نہیں کرنے دی گئی۔ کیا انھیں نظر بند کر لیا گیا ہے۔

نرو پو مارا کو کوہٹل کی لابی تک اسی طرح گھیرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

بھارت سرکاری الیکار بھی سخت غصے میں ہیں، چند بھارتی صحافی بھی کہ یہ تو اخبار نویسوں کے انداز نہیں ہوتے۔ اس طرح تو دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔

مغل شیرین کی لاویوں میں فضا بہت کشیدہ ہے۔ کچھ عقاب صحافی خوش ہیں۔ دونوں طرف ایسے اخبار نویس دانشور ہیں۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ بہت اچھا ہوا ہے کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ پاکستان کے بعض صحافیوں کا کہنا ہے۔ اب صدر پرویز ہیرو بن گئے ہیں۔ تاریخ پاکستان کے ہیرو، جنھوں نے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ کشمیر کا مسئلہ پوری شدت اور اعتماد سے عین دشمنوں کے درمیان بیٹھ کر پیش کیا ہے۔ پاکستان کا سر فخر سے اٹھایا گیا ہے۔

بعض صحافیوں کا کہنا ہے کہ اتنا تو ہوتا ہے کہ آئندہ مذاکرات کے لیے کوئی تاریخ مقرر کر لی جاتی۔ 1972ء میں معاہدہ نہ ہوتے ہوئے کیا ہو گیا تھا۔ اب ہوتے ہوئے نہیں ہوا ہے۔

میں رات گئے اپنا یہ ڈیوٹی سنبھال رہا ہوں۔ بیکر کی شام بھارت کے غیر اخلاقی اور سفارتی

آداب کے قطعی منافی رویے کے باعث جنوبی ایشیا میں امن کے قیام کا ایک شہرہ امونج وقتی طور پر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ جاتے وقت صدر پاکستان کو بھارتی حکام نے پریس کانفرنس سے خطاب کی سہولت بھی سکیورٹی کی وجہ کا بہانہ بنا کر نہیں فراہم کی۔ باخبر پاکستانی ذرائع کے مطابق ڈیڑھ بجے دھپہ پاکستان کی طرف سے تیار کردہ ایک مسودے میں بھارت کی تجویز کردہ دوتاہیم پر رضامندی ظاہر کر دی گئی تھی۔ صدر پاکستان نے بھی ان ترامیم سے اتفاق کر لیا تھا۔ یہ دونوں ترامیم کا مسئلہ کشمیر کے حل سے متعلق تھیں۔ صدر پاکستان نے لچکدار رویہ اختیار کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے عوام کے سنگین مسائل کے حل کی خواہش میں ان ترامیم کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر نکات پر بھی پاکستان اور بھارت دونوں رضامند ہو گئے تھے۔ بھارت کے دفتر خارجہ کے اہلکار اس مسودے کو دوبارہ ٹائپ کرنے کے لیے لے گئے۔

اور یہ کہہ کر گئے کہ ہم اسے تیار کروا کے دستخط کرنے کے لیے لے کر آتے ہیں۔ یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ میڈیا کے سامنے اس مسودے پر دستخط کیے جائیں گے۔ ذرائع کے مطابق جب پاکستان نے مسودے کے لیے دریافت کیا تو کہا گیا کہ وزیر اعظم واجپائی کھانے میں مصروف ہیں۔ صدر پاکستان بھی دوسری طرف کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ دونوں کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ تو مسودہ لے آتے ہیں۔ کھانا کھانے کے قریب ایک گھنٹے بعد صدر پاکستان نے پوچھا مسودہ کہاں ہے۔ تو بھارت کے وزیر خارجہ اور سیکریٹری خارجہ پاکستان کے وزیر خارجہ اور سیکریٹری خارجہ سے ملے۔ اور کہا کہ بھارت اس مسودے میں مزید ترامیم چاہتا ہے۔ اور تین شقوں پر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے کہا گیا کہ یہ معاملہ تو درست نہیں ہے۔ جب رضامندی ہوئی تو ٹائپ شدہ مسودہ آنا چاہیے تھا۔ بھارتی وزیر خارجہ سے کہا گیا کہ آپ جو بھی نئی ترامیم ہیں۔ وہ لے آئیں۔ تاکہ ہم ان کا جائزہ لیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لے کر آتے ہیں۔ اس کے بعد رات تک وہ آئے

ہی نہیں۔ صدر پاکستان نے طویل انتظار کے بعد 9 بجے کہا کہ میں واپس اپنے وطن جا رہا ہوں۔ لیکن میں واپس جانے سے پہلے پریس کانفرنس سے خطاب کرنا چاہوں گا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد یہ جواب ملا کہ سکیورٹی وجہ کی بنا پر پریس کانفرنس منعقد نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ امر ولاز جہاں صدر اور ان کا سرکاری وفد ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سینکڑوں صحافی پہلے سے باہر کھڑے تھے۔ لیکن پریس کانفرنس نہیں کرنے دی گئی۔ اس تمام غیر اخلاقی اور غیر سفارتی رویے کے باوجود صدر پاکستان نے بھارتی حکام سے کہا کہ وہ رواں جی سے پہلے وزیر اعظم واجپائی سے الوداعی ملاقات کریں گے۔ اس الوداعی ملاقات کے لیے وہ امر ولاز سے جے بی بیس گئے۔ جہاں ان کی وزیر اعظم واجپائی سے ایک گھنٹے تک ملاقات رہی۔ اس ملاقات کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ کیونکہ بھارت کی ترجمان نرو پو مارا نے اس کے بعد اپنی بریفنگ میں صرف یہ کہا کہ وہ مایوسی سے یہ اطلاع دے رہی ہیں کہ قیام پاکستان کے لیے جس سفر کا آغاز کیا گیا تھا۔ وہ مشترکہ بیان کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔

انھوں نے سوالات کے جوابات دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ منگل کی صبح دس بجے پریس کانفرنس میں تمام مسائل پر بات کی جائے گی۔ اور تمام سوالات کے جوابات دیے جائیں گے۔

17 جولائی 2001ء

ہم اپنی بسوں سے دہلی روانہ ہو رہے ہیں۔ ادھر میڈیا سینٹر میں بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔

اب ہمیں فائیو اسٹار ہوٹل مور یہ شیرین چھوڑ کر جنپٹ ہوٹل میں منتقل ہونا ہے۔ کچھ روز غیر سرکاری طور پر ٹھہرنا ہے۔ ترن و بے بی کے ساتھ ہوٹل کلیرج میں رات کا کھانا ہے۔ جہاں 'سچ جانے' کے ڈائریکٹرز بھی ہیں۔ بھارت کی سیاست پر بات ہو رہی ہے۔ مذاکرات ٹوٹنے پر زیادہ مایوسی نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارتی وزیر خارجہ نے آکرے کی پریس

کانفرنس میں اور پاکستانی وزیر خارجہ نے اسلام آباد میں امید کا اظہار کیا ہے۔ بات یقیناً آگے بڑھے گی۔

18 جولائی 2001ء

پران سہروال کے صاحبزادے گوتم سہروال آگئے ہیں۔ ان کے ہم راہا پالوہ پتال رواں جی ہے۔ جہاں بھارت کے سینئر صحافی پران سہروال زیر علاج ہیں۔ پران سے 1972ء سے ملاقات رہی ہے۔ وہ پاکستان میں صدر بھٹو سے انٹرویو کرنے آئے تھے۔ بہت بے باک، دیگ اخبار نویس۔ کتنی ہی حکومتوں سے ٹکراتے رہے ہیں۔ اپالوہ پتال میں ایک دنیا ہی ہوئی ہے۔ یہ پورا ایک شہر ہے۔ سیکورٹی کا سخت انتظام بہت بڑا ہال کئی ایئر پورٹوں پر اتنے بڑے لاؤنج نہیں ہوں گے۔ یہیں کیفے ٹیریا ہے۔ انٹرنیٹ ہیں، پبلک کال آفس ہیں، بیرون ملک رہنے والے کسی بھارتی ڈاکٹر نے یہ ہسپتال بنایا ہے۔ جدید ترین آلات ماہر معالجین، طویل برآمدے، وسیع کشادہ لفٹیں، ایک اجروم، ایک نظم و ضبط۔

میں اور پران گزشتہ 29 سال کی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔ انتہائی شدید علالت کے باوجود ان کا ذہن حاضر ہے۔ قوت حافظہ عروج پر ہے۔ وہ پاکستان کے وزیر خارجہ کی صلاحیتوں اور استعداد کے بہت قائل ہیں۔

ان کی بیگم اور صاحبزادے کہہ رہے ہیں۔ آج بہت عرصے بعد انھوں نے کسی سے اتنی طویل گفتگو کی ہے۔ ورنہ یہ پانچ دس منٹ بات کر کے منہ پھیر لیتے تھے۔ آج یہ واپس اپنی فارم میں آگئے ہیں۔

اب ہم پاکستان کے ہائی کمشنر جناب اشرف جی قاضی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ ایک مجھے ہوئے ڈیپلومیٹ۔ حالات و واقعات پر گہری نظر رکھنے والے اور مملکت پاکستان کی پالیسیوں کے مکمل علمبردار وہ خاصے پر امید ہیں۔ ان سے ملاقات کے بعد یہ ڈیوٹی سنبھال رہا ہوں۔ جس سے صورت حال سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر اشرف قاضی نے کہا ہے کہ اگر وہ مذاکرات کے نتیجے میں اگرچہ کوئی

دستاویز دستخطوں کے ساتھ جاری نہیں ہوئی۔ لیکن صدر پاکستان اور بھارتی وزیراعظم کے درمیان 8 معاملات پر بھرپور مفاہمت ہوئی ہے۔ دستاویز جاری ہوتی تو یہ معاملات اس میں شامل ہو جاتے۔ اب ان پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر عملدرآمد کی ابتدا ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں لیڈروں کے درمیان مسئلہ کشمیر پر بہت طویل اور بار بار گفتگو ہوئی ہے۔ اس کے بعد دونوں وزرائے خارجہ بھی جنوں کشمیر کے مسئلے سے متعلق نکتے پر رضامند ہو گئے تھے اور اسے اعلان آگرہ میں سرفہرست شامل کیا جا رہا تھا۔ لیکن بھارتی مرکزی کابینہ نے اسے دوبار مسترد کر دیا جو افسوس ناک ہے۔ یہ پاکستان کی کامیابی ہے کہ وزیراعظم بھارت اور وزیر خارجہ کشمیر کے متعلق نکتے پر اتفاق کر گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جن نکات پر مفاہمت ہو رہی تھی۔ ان میں سارک کانفرنس کا انعقاد، آئندہ میٹنگوں کے لیے ایجنڈے کی ترتیت۔ ستمبر میں دوبارہ سربراہی ملاقات ہر سال سربراہی ملاقات۔ وزرائے خارجہ کی سال میں دوبارہ ملاقاتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ صدر پاکستان کی طرف سے بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے دورے کی دعوت بھی طے شدہ نکات میں شامل تھی۔ انھوں نے کہا کہ آگرہ مذاکرات کسی صورت میں ناکام نہیں رہے ہیں۔ دونوں لیڈروں نے بہت سے تنازعات اور معاملات پر جو مفاہمت حاصل کی ہے۔ اس سے جنوبی ایشیاء کے حالات میں بہتری لانے کے لیے راہ ہموار ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کو اس موقع سے بہت سیاسی اور سفارتی فوائد حاصل ہوئے ہیں جن میں کل جماعتی کانفرنس کے رہنماؤں سے ملاقات سرفہرست ہے۔ صدر پاکستان کی بھارت کے سابق وزیراعظم، دانشوروں، اور صرف اوّل کے ایڈیٹروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کے ذریعے پاکستان کا نقطہ نظر بھارت کے اکثر حلقوں تک پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ صدر پاکستان کے نہرو والی حویلی اور تاج محل کے دورے سے بھارت کے عام شہریوں تک یہ تاثر پہنچا

ہے کہ صدر پاکستان کشمیر کے مسئلے پر سخت موقف رکھتے ہیں۔ وہ اصول پر ڈھنڈے ہیں۔ لیکن وہ عام زندگی میں وہی محسوسات اور جذبات رکھتے ہیں جو دوسرے انسانوں کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم الزام تراشی سے ماحول خراب نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان مذاکرات نے مفاہمت کے ایک اچھے سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ پاکستان نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ 9 نکات پر دونوں سربراہوں، وزرائے خارجہ کے درمیان مفاہمت ہو چکی تھی۔ لیکن بھارتی کابینہ کی طرف سے مسئلہ کشمیر سے متعلق نکتے پر رضامندی نہ ہونے کے باعث یہ دستاویز جاری نہیں ہو سکی۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس سربراہی ملاقات کے لیے ایجنڈا اس لیے نہیں رکھا گیا تھا کہ یہ ایک Retreat خلوت کی میٹنگ تھی۔ ایسی میٹنگوں کے لیے ایجنڈے تیار نہیں کیے جاتے۔ نیز پہلے سے جوائنٹ سیکریٹری یا سیکریٹری کی سطح پر میٹنگیں کر کے کاغذات تیار کیے جاتے ہیں۔ ایسی سربراہ ملاقاتوں میں میڈیا کو بھی اتنی رسائی نہیں ہوتی چاہے تھی۔ خلوت اور گوشہ نشینی کا مطلب تو دونوں سربراہوں کو زیادہ سے زیادہ الگ اور سکون سے بات کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن آگرے میں میڈیا کا دباؤ اتنا بڑھادیا گیا کہ اس سے حالات خراب ہوتے رہے۔ اس میں بھارتی وزیراعظم کی گفتگو نے غلط تاثر دیا۔

یہ تو میرا ذہن پہنچ رہا ہے۔

پاکستان ایک سفارتی حملہ کر رہا ہے۔

صدر مملکت دو روز بعد پریس کانفرنس کر رہے ہیں جس میں وہ تمام معاملات کو دنیا کے سامنے رکھنے والے ہیں۔ اس کے لیے بھارتی صحافیوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ جو بھی جانا چاہے اس کو فوری طور پر ویزا دیا جائے گا۔

نشر انفرامیشن کا مران علی خان کے پاس بھارتی صحافیوں کے فون آرہے ہیں۔ کافی بڑی تعداد اسلام آباد جانا چاہتی ہے۔ یہ ایک اچھی سفارتی کوشش ہے۔

اب ہماری منزل وزارت اطلاعات و نشریات کے دفتر ہیں۔ جہاں ہمیں وزیر اطلاعات و نشریات ششما سوراج سے کچھ رسمی کچھ غیر رسمی گفتگو کرنی ہے۔ ششما جی۔ اردو بھی روانی سے بولتی ہیں۔ پنجابی بھی، اور انگریزی بھی، ان کے ہاں وزارت اطلاعات کا دائرہ کا زیادہ وسیع ہے۔ ہمارے ہاں تو اب وزیر یہی نہیں ہے۔

رات گئے۔ شاعروں، ادیبوں سے ملنے کا ارادہ ہے۔ نعمان شوق سے خط و کتابت ایک عرصے سے تھی۔ آج ان سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ مشرف عالم ذوقی ناول لکھتے ہیں۔ ٹی وی پر پیریل لکھتے ہیں۔ سب کو فکر ہے۔ پاکستان بھارت تعلقات میں ابتری کی۔

19 جولائی 2001ء

صبح ساڑھے چھ بجے ہیں۔ میں بستی نظام الدین اولیا کی طرف روانہ ہوں۔ دلی آئیں اور یہاں حاضری نہ دیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ عقیدتیں بکھری ہوئی ہیں۔ چادریں، پھول، اور مسلمانوں کی پسمنڈگی کے آثار۔ میں اخبارات خریدنے رک گیا ہوں۔ انگریزی، اردو، ہندی کے بارہ تیرہ اخبارات خریدے ہیں۔ اور سب کی قیمت صرف 17 روپے ادا کی ہے۔ ہمارے اور یہاں کے اخبارات کی قیمتوں میں کتنا فرق ہے۔

موسم بھیگ رہا ہے۔ ہم بازاروں میں کتابیں اور سوغاتیں تلاش کر رہے ہیں۔ پھر ٹائمر آف انڈیا میں خبروں اور تصویروں کے تبادلے کے سلسلے میں دلیپ گوانکر..... انجلی سے ملاقاتیں۔ دل ڈھل رہا ہے۔ پر ان سہروال کی دانشمند، مدبر صاحبزادیاں آئی ہوئی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دوستی اگلی نسل تک بھی جاری رہنی چاہیے۔ گوری سہروال، جن کی اہل کے ایڈوانٹی کے صاحبزادے سے شادی ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ بندھن ٹوٹ رہا ہے۔ اخبارات میں بھی اس کی گونج ہے۔ پران سہروال کا گھر انہ ایک لبرل سیکرٹری گھر انہ ہے۔ ایڈوانٹی جی کے ہاں سخت ہندوازم، تعصب، یہ رشتہ

جاری نہ رہ سکا۔ ان سے بڑی گویا سہروال نے ٹیلیفون پر تحقیق کی ہے۔ ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے۔ وہ اپنی یہ کتاب انکل کو پیش کر رہی ہیں۔ پران جی نے اس کے لیے خاص طور پر کہا ہے۔ دور درشن سے آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہو گیا ہے۔ ہم پھر آگرے سے پہلے والے دور میں پہنچ چکے ہیں۔

20 جولائی 2001ء

آج بھارت میں آخری دن ہے۔ گوتم سہروال کچھ رسالے لے کر پہنچ گئے۔ بیچ جانے کے ترن دے سے مقابلے کے خوش نصیبوں کے پاکستان اور بھارت کے دوروں کا فیصلہ بھی کرنا ہے ایک غیر رسمی ملاقات وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانٹی سے۔

ان کا دفتر بہت شکوہ ہے۔ یہ انگریز کے دور میں برصغیر پر حکومت کرنے والی انگریز کونسل کے ممبر قانون کا دفتر ہوتا تھا۔ جیت پر۔ دیواروں پر اس حوالے سے پینٹنگز بنی ہوئی ہیں۔ ایڈوانٹی جی کو افسوس ہے کہ پاکستان میں انھیں ولن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مذاکرات کو سیٹاؤ کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ ان سے بات چیت آف دی ریکارڈ ہے۔ وہ کسی وقت طویل انٹرویو دیں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات معمول پر آجائیں۔

ترن دے اس ملاقات کے بعد رخصت ہو رہے ہیں۔ ایئر پورٹ تک ہمیں بیچ جانے کے لوگ گوسوامی نے پہنچا دیا ہے۔ راستے میں ٹوٹو گرافر سے تمام تصویریں لینے کا انتظام بھی تھا۔ بیچ جانے نے اس دورے کے قیام کے دوران بھرپور پروڈکول دیا ہے۔ ادھر والی ایئر پورٹ پر۔ جہاں سے ہم دوبارے آبرو ہو کر نکلے ہیں۔ نئی خدشات اب بھی ہیں۔ لیکن پی آئی اے کی گیتو نے اپنی مسکراہٹوں اور نفاستوں کے ساتھ ان مراحل کو آسان کر دیا ہے۔

پی آئی اے ہمیں کراچی لے آئی ہے۔ پاکستان بھارت تعلقات ایک بار پھر اس سطح پر ہیں جہاں وہ اکثر رہتے ہیں۔

”آپ نئی دہلی جا رہے ہیں؟“

”پان امریکن کے کاؤنٹر انچارج نے میرا ٹکٹ دیکھا اور پھر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اسی حیرت میں ڈوبے ہوئے اس نے کہا۔“

”اپنا پاسپورٹ دکھائیے۔“

پاسپورٹ پر سوئٹزر لینڈ کے سفارت خانے کی طرف سے ہندوستان کے لیے ویزے کی مہر دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا، اور اس نے مجھے بورڈنگ کارڈ دے دیا۔

اس زمانے میں واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک پاکستانی بھارت جا رہا ہے، جبکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں، سرحدیں بند ہیں۔ خود جانے والا بھی کافی تذبذب کے عالم میں رہتا ہے۔ پرواز میں کچھ وقت باقی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک دشمن ملک میں وقت کیسے گزرے گا۔ پرواز کے لیے اعلان ہوتا ہے تو میں اپنا بیگ اٹھا کر سامنے کھڑی بس میں جانا چاہتا ہوں، میں پہلا مسافر ہوں۔ بس کی کھڑکی میں سے میں دیکھتا ہوں کہ تمام مسافر حفاظتی بکس میں سے گزر کر آ رہے ہیں۔ جائزہ لیا جا رہا ہے کہ کوئی جہاز ہائی جیک نہ کر لے۔ میں اس بکس میں سے گزرے بغیر ہی چلا آیا ہوں، کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ اتنے حفاظتی اقدامات پھر بھی بھول چوک ہو جاتی ہے، یہی بھول چوک بعض اوقات بڑے واقعات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ میں اپنا نفسیاتی تجربہ کرتا ہوں۔ میرا جہاز ہائی جیک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور میرے پاس اصلی تو کیا فٹنی پستول بھی نہیں ہے۔

جیو جیٹ کی دقتیں میری منتظر ہیں۔ بیٹھنے کی ہی نہیں لیٹنے کو بھی وافر جگہ ہے۔ کافی وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ دیرانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس وقت پی آئی اے کی یاد ستارہ ہی ہے۔ اپنا وطن پھر بھی اپنا وطن ہے۔ جہاز پرواز کا آغاز کرتا ہے تو انا ڈنسر کی آواز بلند ہوتی ہے۔

”صبح بخیر۔ ہم ایک گھنٹہ 20 منٹ کی پرواز کے بعد دہلی میں جا پہنچیں گے۔“

صرف ایک گھنٹہ 20 منٹ کا فاصلہ..... کراچی اور دہلی کے درمیان..... پاکستان اور ہندوستان کے درمیان۔ کیونکہ میرے پاس خصوصی ویزا ہے۔ خصوصی اجازت ہے۔ ورنہ دہلی اور کراچی کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ کتنے خاندان ہوئے ہیں۔ سمیٹوں خیریت کی اطلاع نہیں ملتی ہے۔ میرے ساتھ کتنے ہی ایسے خاندانوں کے خطوط ہیں جو مجھے دہلی جا کر ڈاک کے حوالے کرنا ہیں، جن سے یکطرفہ خیریت کی اطلاع مل جائے گی، جانے کتنے دلوں کو سکون نصیب ہو جائے گا۔ یہ خاندان ایک عرصے سے منتظر ہیں کہ راستے کھلیں اور وہ اپنے خاندانوں کی خیریت جان سکیں، یا تو یقین ہو تو خود بھی جا سکیں کتنے فاصلے ہیں۔ یوں صرف ایک گھنٹہ میں منٹ کا فاصلہ..... جو ملک جھپکتے گزر جائے گا۔ ہندوستان کتنا قریب ہے مگر کتنا دور ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں کچھ سیاسی مصلحتیں، کچھ سیاسی غلطیاں، کچھ بین الاقوامی طاقتوں کے مفادات کچھ بھارت کے حکمرانوں کی تو بیعت پسندی کا جنون۔ کچھ پاکستان میں جمہوریت کا فقدان۔ سب عوامل نے مل کر ان ہمسایوں کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ معاہدہ شملہ کے بعد ایک نیا باب شروع کرنے کی خواہش کی گئی ہے، لیکن ماضی کی گتیاں راہ میں بار بار دیوار بن رہی ہیں۔ ہندوستان کی خواہش ہے کہ اب کے پاکستان کو شکست ہوئی ہے، اب کے تمام اگلے پچھلے جھگڑے چکا لیے جائیں، اسی لیے پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرنے سے پہلے ہندوستان کی طرف سے مختلف شرائط عائد کی جا رہی ہیں۔ اسے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے فیصلے سے منسلک کیا جا رہا ہے۔ پاکستان بہر حال بنگلہ دیش کو ضرور تسلیم کرے گا، لیکن پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور دوسرے ملکوں کی طرف سے تسلیم کرنے میں بہت فرق ہے، اسی لیے اس میں تاخیر تا کریر ہے۔ غلبت میں اور دباؤ کے تحت

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے برصغیر میں امن قائم نہیں ہوگا، کیونکہ جمہوری کے تحت کیسے گئے فیصلے ہمیشہ عارضی اور وقتی ہوتے ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم ہوں، پلین ایم کی ایئر ہوئس چائے وغیرہ کے لیے پوچھتی ہے، میں شکریہ کے ساتھ انکار کر دیتا ہوں، رات کے چار بجے بھی کوئی چائے پیتا ہے۔ امریکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بے چاری بھی تو اپنے اس مسافر کی خدمت اسی عرصے میں کر سکتی ہے۔ دہلی ایئر پورٹ آگئی ہے جو جیو جیٹ کے گیزر ایئرپورٹ کی طرف آواز پکارتا ہے، پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ گیزر کی آواز ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں شیشے میں سے دہلی ایئر پورٹ کو دیکھ رہا ہوں۔ آخر شب میں پالم ہوائی اڈے پر ہوں۔ آج 13 فروری ہے۔ مقامی وقت بائیں بج کر تیس منٹ ہے۔ کچھ مسافر ٹرانزٹ میں چلے گئے ہیں، اور ہمیں امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرنا ہے۔ اتنے سارے مسافروں میں سے صرف ایک میں پاکستانی ہوں۔ مسافروں کے خیر مقدم کے لیے ان کے عزیز رشتے دار آئے ہوئے ہیں، اگر بھارت کے فارن آفس (وزارت خارجہ) والوں کو اطلاع مل گئی ہوگی، تو شاید کوئی آیا ہو۔ مگر یہاں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ میں نے آمد کا کارڈ پر کیا۔ خدشے اور دوسرے تو بہت ہیں صحت کے شوقیت دیکھنے والا امیگریشن افسر پہلا بھارتی ہے جس سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ بہت شائستگی سے پیش آتا ہے میرے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ فارن آفس کی طرف سے کوئی اطلاع تو نہیں ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں، یہاں انتظار کر لیجے گا، امیگریشن کے مرحلے میں بہت تاخیر ہوتی ہے۔

مجھے کارڈ میں پیشگی کے خانے میں پاکستان لکھتے ہوئے دہلی کے ایئر پورٹ پر جتنا فخر محسوس ہوتا ہے۔ شاید یہ زندگی میں ہی ہوا ہو..... پاکستانیوں کے لیے امیگریشن کے فارم مختلف ہیں آج کل ان کی کبھی بکھار ضرورت پڑتی ہے، اس لیے افسر انہیں ساتھ رکھ کر

نہیں بیٹھے ہیں۔ مجھے امیگریشن افسر نے بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔ اس پرواز کے علاوہ ایک اور پرواز کو بنانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں انہوں نے اپنی ساری فائلیں دیکھ لی ہیں، میرے بارے میں انہیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ کئی جگہ فون کیے، وقت گزر رہا ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ میں کچھ فون کرنا چاہتا ہوں، ڈائریکٹری میں ایکسٹرنل پبلیشی کا ڈائریکٹر ہے این بھٹ کا فون تلاش کرتا ہوں۔ ڈائریکٹری 1971ء کی چھپی ہوئی ہے، اس میں ان کا نمبر نہیں ہے۔ اپنے ایک اور دوست کے نمبر ڈھونڈتا ہوں، وہ دہلی سے باہر گئے ہوئے ہیں پھر اپنے ایک اور دوست سن پالٹی مور کے بیورو چیف پر ان سروال کا نمبر مل جاتا ہے، انہیں فون کرتا ہوں۔ بے انتہا خوش ہوتے ہیں میں صورت حال بتاتا ہوں، پوچھتے ہیں کہاں ہو۔

کسٹم کے مرحلے میں۔

”ہمیں رکو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔“

اس وقت پران سروال میرے لیے فریضہ رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ پران خالص پنجابی ہیں۔ میں کسٹم سے فارغ ہو کر باہر نکل آیا ہوں۔ ایئر پورٹ کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مجھے ڈالر انڈین کرنی میں تبدیل کر دینا پڑتا ہے ایک ڈالر کے سات روپے اسی پیسے ملتے ہیں۔ ایک ڈالر تقریباً 11 پاکستانی روپوں کا ملتا تھا۔ کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتا ہوں، ٹیکسی ڈرائیور آ لیتے ہیں، صاحب چلیے۔ آپ کو ڈالر کے اچھے پیسے دلوادیں گے۔ اس کے بعد ایک اور ٹیکسی ڈرائیور آتا ہے، وہ بھی یہی پیشکش دہراتا ہے۔ پران کے آنے تک کافی ٹیکسی ڈرائیور یہ پیش کش کر چکے ہیں، ایئر پورٹ کا یہ حصہ کافی بے رونق ہے۔ ہندوستان کی بنی ہوئی اینیسیڈر گاڑیاں اور وہیں تیار شدہ فلیٹ کاریں، نظر آتی ہیں، پرائیویٹ بھی اور ٹیکسیاں بھی..... پران مجھے اشوکا ہومل لے گئے ہیں، یہاں کمرہ لینے کے بعد پران فارن آفس کو اطلاع دیتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہے، خیر بارہ بجے کے قریب فارن آفس سے ایک صاحب

مسٹر ڈی شرملا آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ساڑھے چار بجے مجھے بھارتی وزارت خارجہ کے شعبہ پاکستان کے انچارج مسٹر اشوک چب سے ملنا ہے۔ میں آپ کو یہیں سے لے جاؤں گا۔ اسی عرصے میں پریس ایسوسی ایشنز کے دیوان بریڈر ناتھ اور ان کی بیگم منورما دیوان بھی تشریف لے آتے ہیں۔ ان سے ملاقات رہتی ہے۔ پھر پران ہروال اور ان کے ایک دوست 'سیکولر ڈیموکریسی' کے ایڈیٹر مسٹر گوگل بھی آگئے ہیں۔ سیکولر ڈیموکریسی ایک پرچہ نہیں ایک تحریک ہے۔ کانگریس کے رکن پارلیمنٹ شری منتی جوشی اس کی قائد ہیں۔ جن سنگھ ان کی سخت مخالف ہے۔ ان کے خلاف اخبار بیانات جاری کرتی رہتی ہے۔ گوگل صاحب سے ملاقات کے بعد پران مجھے فارن آفس لے چلے ہیں۔ دہلی کا سیکریٹریٹ انگریز کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک شکوہ ہے۔ برصغیر کے فن تعمیر کا مظہر جدید دور کے سیکریٹریٹ اس طرز تعمیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھارتی حکومت نے دفاتر کے لیے نئی عمارت بنائی ہیں، وہ ان کے مقابلے میں بیچ معلوم ہوتی ہیں۔ فارن آفس کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے کنول جیسی سے ملاقات ہوتی ہے، وہ کراچی کے بھارتی ہائی کمیشن میں ہوتے تھے۔ بعد میں اشوک چب صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔ وزارت خارجہ کے جوائنٹ سیکریٹری اور شعبہ پاکستان کے انچارج سے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود مسائل پر بات کر رہا ہوں۔ گفتگو سے انتہائی خلوص جھلک رہا ہے اور باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعتاً پاکستان سے اچھے تعلقات کے خواہشمند ہیں ان کا زور اس بات پر ہے کہ آپس میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات کی بحالی ضروری ہے۔ کم از کم اخبارات اور رسائل کا تبادلہ ضروری ہے۔ تاکہ مسائل سے براہ راست آگاہی ہو سکے۔ میں اپنی معلومات کے مطابق ان کی بہت ہی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، بنگلہ دیش کے مسئلے پر بات ہوتی ہے میں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر بھی اور پاکستان

کے لوگ بھی جنگی قیدیوں کی واپسی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں کوئی ربط نہیں سمجھتے، دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور انتہائی بھی۔ بنگلہ دیش کے تسلیم کیے جانے کی بات چل رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ شیخ مجیب الرحمن سے جولائی میں صدر بھٹو کی ملاقات کی بات بھی ہوئی تھی، جس سے شیخ صاحب نے انکار کر دیا اور اس طرح سارا مسئلہ الجھ گیا، اسی لیے یہ مسئلہ پاکستان نے قومی اسمبلی میں پیش نہیں کیا۔ پاکستان کے عوام صدر بھٹو کے اس موقف کو حق بجانب خیال کرتے ہیں کہ شیخ صاحب سے صدر بھٹو کی ملاقات پہلے ہونی چاہیے کیونکہ بہت سے مسائل پر پہلے کچھ بات اور مفاہمت ہو جائے۔ جو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے بعد بھی تلخیوں کا سبب بنے رہیں گے اور اس دباؤ اور تلخیوں کے درمیان اگر پاکستان اسلام آباد سے ہی Recognitin کا اعلان کر دے، اس سے نئی اور نفرت میں کمی نہ ہوگی، اس لیے ہندوستان کو پاکستان پر یہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے بات چیت اچھے دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ انگریزی، پنجابی اور اردو، تینوں زبانیں استعمال کی گئیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کی طرف سے ایک بھی تو خیر رسائی کا اظہار نہیں ہوا۔ آپ شہری قیدیوں کو رہا کر دیتے، بچے ہیں، شیر خوار بچے، نوزائیدہ بچے، عورتیں ان کا کیا قصور ہے۔ ہمارے صحافی ہیں۔ نیلی ویٹن کے کیمرہ مین ہیں پروڈیوسر ہیں۔ یہ تو اپنے ملک میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، صحافیوں کے ساتھ ہمیشہ اخلاقی طور پر کچھ ترس بھی سلوک ہوتا ہے۔ میں نے کہا اردو کے مشہور شاعر حفیظ ہوشیار پوری کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کی بیٹی عصمت، اپنے خاوند کے ساتھ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہیں، مرتے دم ان کے منہ پر اس بچی کا نام تھا۔ آخر ان لوگوں نے کیا قصور کیا، اور ان کو یہ حال رکھ کر آپ کو کیا ملے گا۔ آپ کی طرف سے کچھ تو خیر رسائی کا مظاہرہ ہو۔

میں نے اپنی بات کہہ ڈالی ہے انہوں نے اپنی بات کہی وہ تو بہر حال سرکاری افسر ہیں، اس لیے سرکاری ترجمانی ان کا فرض ہے۔ میں نے ایک

پاکستان اخبار نویس کی حیثیت سے بات کی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان میں گھومے، پھرے لوگوں سے ملے، دیکھیں آپ کیا تاثرات لے کر جاتے ہیں۔

میں اشوک میں واپس چلا آیا ہوں۔ اب میں سرکاری مہانداری میں ہوں۔ ہندوستان جانے والے صحافیوں میں بعض کو بھارتی حکومت نے براہ راست دعوت دی ہے۔ اس میں روزنامہ ڈان کے دو حضرات جو پہلے ہوئے ہیں اور مزید دو صحافی ہیں، وہ بھی ڈان کے ہی ہیں۔ کچھ صحافیوں کے لیے انہوں نے حکومت پاکستان سے کہا کہ وہ کچھ لوگوں کو بھجوائیں۔ ان میں سے دو جا چکے ہیں۔ میں پہلا صحافی ہوں۔ جسے نہ بھارت سرکار نے بلایا ہے اور نہ حکومت پاکستان نے بھجوا دیا ہے۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ یہ بھارتی وزارت خارجہ کی صوابدید کہ انہوں نے میرے پہنچ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ میرے لیے بھی سرکاری مہانداری کا انتظام کریں اور یوں مجھے بھارت سرکار کو کافی مالی گزندہ پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ اشوک پانچ ستاروں والا ہوٹل ہے۔ بھارت کی سیاسی کارپوریشن کے زیر انتظام ہے۔ بہت بڑا ہوٹل ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ کمرے ہیں اور بے پناہ ہوتیس ہیں۔

دہلی میں یہ میری پہلی رات ہے، آج کوئی پروگرام نہیں ہے، اس لیے ہوٹل میں ہی رہتا ہوں، ہوٹل کی کھڑکی سے دہلی کی روشنیاں دیکھتا ہوں، جو خاصی مایوس کن ہیں۔ دہلی اپنے کو کچھ جانتی نہیں رہا ہے۔ یا یہ شہر کاب سے دیران حصہ ہے۔

یہی دہلی کی ویران روشنیاں ہیں۔ آج مجھے پرانی دہلی میں جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے، اپنے ایک دوست کے عزیزوں کے ہاں کچھ خطوط اور سامان پہنچانا تھا۔ میں ایک ٹیکسی سے کوچہ ملی ماراں پہنچا ہوں۔ اس کے بعد پیدل چلتا ہے۔ یہ پرانی دہلی ہے غالب و میر کی۔ یہی وہ کوچے ہیں جو اوراق مصور تھے، مسلمانوں کی تاریخ یہاں انکڑائیاں لے رہی ہے، اب یہاں کچھ مکانوں اور کونوں میں

ہندو بھی آئے ہیں۔ دہلی کے ان کوچوں میں صدیاں سانس لیتی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ میں اپنی تاریخ کے اوراق میں گم ہو گیا ہوں، ان کوچوں سے گلیوں سے، حویلیوں سے صدیاں سال، ماہ، دن کے لمحے کی طرح گزرتے رہے ہیں۔ ان تنگ تنگ کوچوں میں جو اپنائیت ہے، دیواریں جس طرح بغل گیر ہونے کو ہوں، دروازے جیسے نیم والہ، کھلی اور بڑی سڑکوں جدید بنگلوں میں یہ لگاؤ کہاں ہے، یہاں ٹریفک رینگتا ہے۔ کالیں، ٹیکسیاں تو ادھر آئی نہیں پائیں، سائیکل رکشے، سائیکل، اسکوٹر، ٹیلی، ریڑھے اور انسان، سب رینگتے ہیں اور کبھی بھی ایک ٹھہراؤ آتا ہے۔ سب رُک جاتے ہیں، چنچیں شورا اور پھر روانی۔ مجھے وہ مکان مل گیا ہے۔ لیکن نہیں ملا، امانت ہمسائے کے سپرد کر کے میں تاریخ کے ان اوراق کو تیزی سے الٹا پھر بیسویں صدی میں لوٹ آیا ہوں، جہاں سے بھاگ رہے ہیں، ٹیکسیاں، گاڑیاں، بسیں۔

دہلی کی صبح

نئی دہلی اور پرانی دہلی میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ دہلی کی صبح..... نئی دہلی میں کوئی خاص نہیں لگتی۔ آج دس محرم ہے۔ مجھے ایک سیکولر لیکن ہندو اکثریت کے دیش میں شیعہ بھائیوں کو دیکھنا ہے کہ یہاں عزاداری حسین کا کیا عالم ہے۔ میرے ساتھ ترکی کی ایک بزرگ خاتون صحافی بھی تعزیے اور ماتم دیکھنے جارہی ہیں۔ مسز ادیبہ دلو کردار۔ پاکستان بھی آپکے ہیں، ہمارے دفتر میں بھی آئی تھیں، دشمن ملک میں اپنے ایک دوست ملک کی خاتون صحافی سے ملنا کافی دلچسپ ہے اس ترک خاتون کے لیے تو یہ ایک خبر ہے کہ ہندوستان میں ایک پاکستانی صحافی۔ جبکہ دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ وہ مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہیں، ہم جامع مسجد میں جا پہنچے ہیں۔ لال قلعہ، عظمت رفتہ کی یادگار۔ اب جس پر ہندوستان کا ترنگا لہرا رہا ہے۔ جامع مسجد کی میڑھیوں کا تصور میرے ذہن میں بچپن سے تھا۔ میں یہاں آیا تھا۔ اب میڑھیاں، جمو پیڑیوں میں چھپ گئی ہیں۔ سامنے

کی طرف جمہورپنیاں ہی جمہورپنیاں ہیں، یہ کون لوگ ہیں، مسلمان ہیں، جامع مسجد کے میناروں کے سائے میں پناہ لے رہی ہے۔ جامع کی خوبصورتی بھی اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اتنے بڑے شہر کے عین قلب میں جمہورپنیاں میں لوگ کیوں رہتے ہیں۔ میں نے بعد میں ایک مسلمان سے ہی پوچھا ہے کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حکومت انہیں متبادل جگہ تو دینے کو تیار ہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ اس طرح مسلمان بھر جائیں گے۔ ایک سیکولر ملک میں بھی اقلیت کو بھر جانے کا خوف کیوں ہے۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی عقلندی ہے یا حماقت۔

ادھر مسلم ملک میں مسلمان اکٹھے رہتے ہوئے بھی کسی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

میں اور ترک خاتون جامع مسجد کی میزبیاں چڑھ رہے ہیں۔ میزبیاں، ہماری تاریخ کے باب، دروازے پر اس ترک خاتون کو ایک جبر پہنا دیا جاتا ہے تاکہ گھسنے ننگے نہ رہیں، یہ انتظام وقف بورڈ کے ذمے ہے۔ کیمبر اندر لے جانے کے پچاس پیسے دینے پڑتے ہیں۔ مسجد میں حرمت ہو رہی ہے۔ یہ مسجد جس سے کئی صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے اس مسجد کے میناروں نے جانے کتنے دور، کتنے جہان، کتنے حادثے، کتنے سانحے گزرتے دیکھے ہیں، کبھی یہ صحن سجدہ گزاروں سے معمور ہوتا ہوگا، آج یہاں غیر ملکی سیاح، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہندو، سکھ، مسلمان سب گھوم رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے۔ سب گھوم پھر رہے ہیں، جیسے بکنگ کی جگہ ہو۔ وسیع صحن میں حوض کے پاس نمازیوں کے لیے صرف ایک صف بھی ہے۔ بانی پوری مسجد تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔ مینار پر اور ادھر گیلری میں بی بی نورسٹ گھوم رہے ہیں۔ مسجد کا احترام کیا ہوا۔ یہ کس کا قصور ہے۔ ہندوؤں کا، مسلمانوں کا لیکن مسجد کا انتظام تو دہلی وقف بورڈ کے ذمے ہے، دونوں دروازوں پر اسی بورڈ کے نگران ہیں، جو داخلے کا ٹکٹ دیتے ہیں، مینار پر چڑھنے کا ٹکٹ الگ ہے۔ دوسری یادگار عمارتوں کی اتنی اچھی حالت ہے اور جامع مسجد

کی اتنی دل آزار کیوں اس کا جواب تو دہلی وقف بورڈ ہی دے سکتا ہے؟

ہم ٹکٹ لے کر مینار پر چڑھ رہے ہیں ترک خاتون بائپ رہی ہیں۔ مینار سے نیچی اور پرانی دلی کتنا فرق ہے دونوں میں۔ دلی، عظیم دلی، قدیم دلی، ہندو، چین، مسلمان، تعلق، غلاماں، غلبی، لودھی، عظیم مغل شہنشاہ، برطانوی سامراج اس فضا نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔

ہم مینار سے نیچے اتر کر گیلری سے عزاداران حسین کو ماتم کناں دیکھ رہے ہیں، تعزیہ برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا اور اردو کا علاقہ ہے۔ اردو بازار حمید ریسٹورنٹ، ٹیمن ریسٹورنٹ، ادھر سے ہو کر ہم جو باغ کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں تعزیہ برداروں کے جلوس پہنچیں گے۔ ایک خلقت جمع ہے۔ پولیس بھی بھاری تعداد میں ہے۔ یہاں تعزیوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ مقام بکرا کھلاتا ہے۔ اب ہم اندرون دہلی، تنگ تنگ گلیوں سے ہوتے سینی یم خانے پہنچے ہیں، جہاں مجلس برپا ہے۔ عزاداران حسین ماتم کر رہے ہیں۔

غریب و سادہ و رکیں ہے دستان حرم نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل ہندو اکثریت کے سیکولر ملک میں مجلس، جلوس، تعزیہ اور ماتم حسین۔ کچھ اور ہی کیفیت رکھتے ہیں۔ چند نو جوان لہو لہان ہاتھوں میں زنجیریں لیے کھڑے ہیں۔ کچھ نو جوان زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک صاحب بیمار کراہتا حضرت زین العابدین کے چہلم کے سلسلے میں اشتہار بانٹ رہے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیکیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہول کا رخ کرتے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیکیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہول کا رخ کرتے ہیں۔ راستے میں بھارت کے مہاتما گاندھی، پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی سادھیاں پڑتی ہیں، ساھی ہندوؤں کے لیے اتنی ہی قابل احترام جگہ ہے، جیسے ہمارے لیے مزار، سادھی بھی

مزاروں کی طرح کافی جگہ گھیرتی ہے، لیکن یہاں جسم کی بجائے صرف راکھ دفن ہوئی ہے۔ بھارتی قوم نے اپنے رہنماؤں کی راکھ کو نہایت عقیدت اور احترام سے دفن کیا ہے اور اس کے ارد گرد، باغیچے، گھاس کے لاس اور بہت کچھ بنایا ہے۔ اسکولوں کے بچے پچیاں یہاں عقیدت کے اظہار کے لیے بھی آتے ہیں اور کچک مٹانے بھی۔

اپنے ہول سے تازہ دم ہو کر ہمیں لال قلعے میں صوت و نور (Light And Sound) کا پروگرام دیکھنے جانا ہے۔ صبح سے محکمہ خارجہ کے مسٹر اشفاق محمد خاں میرے ساتھ ہیں، لال قلعے میں ان کے ساتھیوں مسٹر سپرا، اور مسٹر پوری سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ٹیکیم کے دو صحافیوں کے ہمراہ آئے ہوئے ہیں۔ صوت و نور کا پروگرام ہمارے ہاں بھی لاہور کے قلعے میں ہوتا ہے۔ لال قلعہ مغلیہ دور کی تاریخ کا مرکزی مقام رہا ہے، اس لیے اس پروگرام میں زیادہ جامعیت ہے۔ یہ پروگرام ہندی اور انگریزی میں ہوتا ہے۔ میں چونکہ غیر ملکی ہوں، اس لیے مجھے انگریزی والا پروگرام دکھایا جاتا ہے۔ کافی محنت سے یہ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اکبر صوبے اچھا شہنشاہ تھا۔ اورنگ زیب سب سے تنگ نظر۔ صورت و نور میں بھی ان کا انداز بیان یہی ہے۔ شاہجہان کے ذکر اور قلعہ معلیٰ کی تعمیر میں شاہجہان کے کارناموں، دیوان خاص، دیوان عام، مینا بازار ہرشے کا ذکر کرنے کے بعد جب اورنگ زیب کا ذکر آتا ہے تو انتہائی افسوس اور مذمت بھرے لہجے سے بتایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب تنگ نظر مسلمان تھا۔ موسیقی کا اس کے عہد میں گلا گھونٹ دیا گیا، ختیاں کی گتیں اور یہ کہ مغلیہ دور کے زوال کی بنیاد اورنگ زیب نے ڈال دی۔ پھر محمد شاہ رنگیلا کا زمانہ بھی خوب دلچسپی سے بیان کیا جاتا ہے۔

یاری بار موسیقی کی دھنوں کے ساتھ مغنیہ کی آواز ابھرتی ہے۔

رس بھرے نین تو رہے۔

نادر شاہ کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہنوز دہلی دور است۔
اور گاؤ۔ جاؤ لاؤ۔
پھر قلعے کے چاروں طرف گھوڑوں کی ٹانہیں
ٹٹائی دیتی ہیں۔
دلی میں ٹٹل عام۔

محمد شاہ رنگیلا کی اس رنگیلا داستان کے دوران مجھے دہلی کے لال قلعے میں بیٹھے ہوئے سابق صدر یحییٰ خاں کی جانے کیوں یاد آتی رہی۔ لال قلعے کی صوت و نور کی یہ داستان انگریزوں کے ظلم و تشدد کے واقعات بیان کرتی ہوئی تحریک آزادی کے تین انقلابی کارکنوں پر اس قلعے میں ڈھائے جانے والے مظالم بھی بیان کرتی ہے۔ ان تینوں کارکنوں میں ایک ہندو ایک سکھ ایک مسلمان بتایا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی المناک داستان پھر انگریزوں کا دور۔ پھر دلی لٹنے اور اجڑنے کی کہانیاں اور بالآخر لال قلعے کے باہر بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی پہلی تقریر۔ یہ ہے لال قلعے کا صوت و نور کا پروگرام جو بھارت کی سیاسی کارپوریشن کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ مجھے بعد میں ایک صاحب نے بتایا کہ 1971ء کے بعد اس میں بنگلہ دیش کا کچھ ڈرامہ بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن معاہدہ شملہ کے فوراً بعد اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ صوت و نور کے ایسے مظاہرے دہلی کے علاوہ احمد آباد اور سری نگر میں بھی دکھائے جاتے ہیں۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد محکمہ خارجہ کے یہ صاحبان مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ پروگرام آپ کو کیسے لگا۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ یہ تو میری اپنی تاریخ ہے۔ کچھ آپ نے سنا کر دی ہے، کچھ ٹھیک بیان کر دی ہے۔ یہ عمارتیں، یہ عظیم یادگاریں، ہمارے آباؤ اجداد نے ہی تو تعمیر کیں، یہ ہماری نشانیاں ہی تو ہیں۔ کیا ہوا آج ہم ان سے دور چلے گئے ہیں، مگر ہم اپنی تاریخ کے اوراق کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔

اس دلچسپ سفر نامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔



طرف دیکھا جہاں مجھے کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔ تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے سر ہانے بہت ہی پیارا ایک لال گلاب رکھا تھا، اتنا پیارا گلاب میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور بڑا اتنا کہ اگر دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنالیا جائے اور اس میں وہ پھول رکھ لیا جائے۔ وہ پھول اس پیالے میں ساتا، اتنا پیارا پھول دیکھ کر تو میں اپنا سارا خوف ہی بھول گئی۔ میں بھول گئی کہ اتنی رات کو اچانک کس نے اسے یہاں رکھا ہے اور جہاں اتنے اندھیرے میں اور کچھ نظر نہیں آ رہا وہاں یہ پھول کیسے..... میں نے جلدی سے پھول اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ کو حرکت دی تو یوں لگا جیسے میرا ہاتھ کسی بہت بڑے پتھر کے نیچے آ گیا ہو۔ وزن ہاتھ پہ اتنا آ گیا کہ میں بے بس ہوئی۔ میں نے مدد کے لیے اماں کی چارپائی کی طرف

آ گئی تھی۔ اپنے قریب کی چارپائیوں پر نظر ڈالی تو اماں آیا اور بہن بھائی سب سو گئے تھے۔ ساتھ والے گھروں میں بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ یقیناً وہاں بھی سب نیند میں گمن تھے۔ ہر طرف کالی رات کا راج تھا۔ باقی راتوں سے یہ رات کچھ زیادہ ہی کالی تھی۔ چاند بھی آسمان پر نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تاروں کو تکتے تکتے نیند کی وادی میں اتر گئی اور جانے کتنی دیر نیند میں رہی کہ اچانک ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے اپنے ارد گرد دیکھا مگر وہاں مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایک پل کو دل میں خوف اٹھا۔ مگر پھر اگلے ہی پل میں پھر سے آنکھیں موند لیں۔ مجھے آنکھیں بند کیے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے سر کے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اس



مختصر مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے
غلاب کے دل میں ایک بار خوف ضرور دکھائی دے گا

سب کچھ تیرا ہے

ارم خان

اُس رات اگر وہ بچہ میں پہنچ جاتی تو شاید جنت اسے محسوس ہی کر ڈالتی

کیونکہ غربت اس گھر کی اینٹ اینٹ میں بسی تھی۔ میں بھی بچپن سے جوانی تک کے سفر میں غربت کیا نے مجھ چلی تھی۔ مجھے اپنے گھر کی حالت پر بہت دکھ ہوتا تھا۔ لیکن بھلا میں کیا کر سکتی تھی۔ ایک تو اس گھر میں غربت تھی، جسے میں بچپن سے دیکھتی آرہی تھی، اور ایک اور بات جو میں نے اماں کے منہ سے کئی بار سنی تھی وہ یہ کہ اس گھر میں جنت کا سایا ہے۔ اماں اکثر ہمارے گھر آئی گاؤں کی عورتوں کے سامنے ذکر کرتی تو میں اکثر اچانک پہنچ جانے پرسن لیتی ورنہ اماں نے بھی مجھے خود نہیں بتایا تھا۔ ان کا خیال تھا شاید میں ڈر جاؤں گی۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ اماں کے سوا وہاں اور کسی کو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ہمارے گھر میں جنت ہیں۔ اس لیے وہاں کبھی کسی نے خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر ایک بار میری زندگی میں ایسی رات آئی جس نے آج تک خود کو مجھے بھولنے نہیں دیا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ میں اپنے سارے کام مکمل کر کے اپنی چارپائی پر

وہ رات، وہ کالی سیاہ رات بھلا میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔ ان بیس سالوں میں تو کیا پوری زندگی وہ رات نہیں بھلائی جاسکتی۔ وہ رات مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے گئے دن کی گزری رات یاد ہے۔ سوچوں تو سر پھلا سا جاتا ہے کہ آخر وہ کیسی رات تھی۔ کیا اس میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب حقیقت تھی یا میری نظر کا ایک دھوکہ تھا یا پھر میرا ایک خواب۔

نہیں، نہیں میں اسے خواب نہیں کہہ سکتی کیونکہ خواب بند آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب کہ میں نے تو کھلی آنکھوں سے وہ سب دیکھا تھا۔

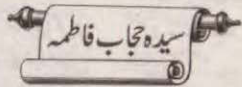
☆☆☆

میراث نام نہا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہوں میرے بعد ایک بہن اور تین بھائی ہیں۔ آج سے بیس سال قبل میرا باپ ایک غریب کسان تھا۔ جو دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ابا کے سارے دن کی محنت سے ہمارے گھر کا دو وقت کا چولہا جلتا تھا۔ ہمارا گھر ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے اور بچی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ مگر اس چھوٹے سے گھر کو بھی اماں بڑی مشکل سے سنبھالتی



دوسری اسرار بھری کشتی

وہ بڑھیا کون تھی؟



تیر خوشبوؤں کی شوقین، ایک دوشیزہ کی خوف یقی

ہوئے بھی ہمیں اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔ اب یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہمیں کوئی آزار نہ پہنچائیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے بھلا میں اس اسرار بھری دنیا کے باسیوں کی حمایت کیوں کر رہی ہوں؟ تو پھر کیجیے آپ ہی فیصلہ کیجیے۔

کہتے ہیں کہ ہمارے ارد گرد بھی ایک اسرار بھری دنیا آباد ہے۔ اس دنیا کے باسی نہ ہمیں دکھائی دیتے ہیں نہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ مگر بھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو ہم اپنی کم تہی سے یا بھی جان بوجھ کر اتنا مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے



مسلل گزرتی جا رہی تھی اور جلتے جلتے میں تقریباً آدھا سفر کر آئی تھی کہ اچانک مجھے کسی چیز سے ایک شدید ٹھوک لگی جس نے مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لا کھڑا کیا۔

ہوش آتے ہی میں نے ارد گرد دیکھا اور پھر مکمل خوف مجھ پر حاوی ہو گیا۔ میں نے اسی وقت گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پیچھے نہیں دیکھا اور پھر گرتے پڑتے گھر آ کر سانس لی۔

”نازی کیا کر رہی ہو وہاں۔“ میں باہر کا دروازہ بند کر رہی تھی کہ اماں کی آواز سنائی دی، جس سے میری جان میں جان آئی۔

”اماں کچھ نہیں وہ بس ایسے ہی دروازہ کھلا تھا۔ ابھی میری آنکھ کھلی، میں نے دیکھا تو بند کرنے چلی آئی۔“ میں نے اماں سے بات چھپائی کہ اصل بات کیا ہے۔

”ٹھیک ہے آ کر سو جاؤ۔“ اماں شاید آدمی نیند میں تھیں سو مجھے کہہ کر سو گئیں۔

پھر صبح میں نے اماں کو سارا رات کا قصہ سنایا تو اماں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں وہاں سے سلامت واپس آ گئی جہاں گئی تھی۔ ورنہ رات پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اس رات کے دو سال بعد میری شادی ہوئی لیکن ان دو سالوں میں پھر ایسا میرے ساتھ کچھ نہ ہوا جیسا اس رات ہوا تھا۔ نہ ہی اماں کو پھر کبھی کچھ محسوس ہوا۔

میں آج بھی سوچتی ہوں کہ اس رات کا آخر قصہ کیا تھا۔ کیا وہ رات میرے لیے ایک خواب تھی۔

جسے میں نے حقیقت سمجھ لیا تھا۔ اگر خواب تھا وہ سب تو میرا کھیتوں میں جانا اور پھر ٹھوک کھا کر واپس آ جانا کیا تھا۔ مجھے آج بھی یہی سوال ستاتا ہے کہ مجھے وہاں تک لے جانے والے نے واپس کیسے آنے دیا۔ اور وہ سونا چاندی ہیرے موتی اور خاص طور پر میرے قریب رکھا وہ لال گلاب..... ان سب میں کتنی حقیقت تھی۔

☆☆☆

دیکھا تو وہ نیند میں نظر آئیں۔ سو بے بسی سے ایک بار پھر گلاب کے پھول کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، پھول وہاں سے غائب تھا اور میرے ہاتھ کا وزن بھی غائب تھا۔ میں نے ہاتھ کوئی بار ہلا کر دیکھ لیا مگر اب ہاتھ بالکل ٹھیک تھا۔ میں ابھی اس کشمکش میں تھی کہ آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر زندہ ہو گیا۔ میں جس کروٹ لیتی تھی اسی طرف ہمارا کمرہ تھا اور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے عجیب سی روشنی پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ روشنی دیکھ کر میں اٹھ بیٹھی اور پھر بے اختیار چار پائی سے اتر کر کمرے کی طرف بڑھ آئی۔ جانے میرا خوف اس وقت کہاں چلا گیا تھا جو میں اس طرح بنا سوچے سمجھے چلی جا رہی تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اس روشنی والی جگہ کو دیکھتی رہ گئی۔ سونا، چاندی اور شاید ہیرے تھے جو چمک رہے تھے۔ اور وہ بھی اتنے کہ کمرے کا ایک کونا بھرا پڑا تھا۔ میں بت بنی کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔

”لے لو نازی! یہ سب تمہارے لیے ہے۔“ ایک آواز جو میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ میرے کانوں سے نکرائی۔

”لے لو یہ سب تمہارا ہے۔“ ایک بار پھر وہی آواز آئی تھی۔ لیکن میں نے ان چیزوں کی پروا نہیں کی اور اس آواز دینے والے کو تلاش کرنے لگی۔ مجھ پر کوئی عجیب سی بے خوفی سوار ہو چکی تھی۔ میں اس آواز دینے والے کو تلاش کرتے کرتے گھر سے باہر آ چکی تھی۔

میرے گھر سے باہر آ جانے پر وہ آواز تو ختم ہو گئی تھی لیکن اب میرا رخ کسی اور جانب تھا اور جبکہ بھی بہت سے کھیتوں کو پار کر کے ایک پرانی بستی۔ جہاں مشہور تھا کہ وہاں جنات بستے ہیں۔

کوئی طاقت تھی جو مجھے اپنے ساتھ لیے چلی جا رہی تھی اور میں خاموشی سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ بغیر کسی چپل، جوتے کے میں کھیتوں سے

میں ان دنوں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی۔ جب ہم نیوکراچی سیکٹر 3 میں شفٹ ہو کر آئے۔ اس عمر میں لڑکیوں کو فطرتاً پھول، خوشبو اور دل کو لبھاتے موسم ویسے ہی بہت اچھے لگتے ہیں اور مجھے تو بچپن سے ہی رنگ اور خوشبو بہت بھاتے تھے۔ اسی لاکھ بھانپیں گمران کی نصیحت کو میں ہنس کر ایک جملے سے ہوا کی غذا بنا ڈالتی تھی۔

”امی جان! خوشبو لگانا تو سنت نبویؐ ہے۔“ اور اتنی گری ہے بس میں طرح طرح کے لوگوں کی بو سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پلیز ای!“

”بنا خوشبو لگانا بے شک سنت ہے مگر تمہاری عمر کی چھوٹی لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اتنی خوشبو لگا کر اسکول جاؤ جبکہ تمہارا اسکول بھی دوپہر کا ہے اور زوال کے وقت ویسے ہی اوپری ہواؤں کا زور ہوا میں ہوتا ہے۔“

مگر میں نے تو نہ ماننا تھا نہ مانی۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں کوئی نافرمان بچی تھی۔ میری امی کہتیں تو شاید بھی دوسرا سانس بھی نہ لیتی۔ میری ماں میں ہی ایسی۔ سراپا محبت بہر حال بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ہاں! تو میں بتا رہی تھی کہ خوشبو میری ایسی کمزوری تھی جسے میں چاہ کر بھی چھوڑ نہیں سکتی تھی اور اس وجہ سے میں ایک ہفتے میں پرفیوم کی پوری بوتل خالی کر دیا کرتی تھی۔ مگر اس دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے بعد میری یہ عادت خود بخود چھوٹ گئی۔

”بیٹا! یہ لالو کھیت کون سی بس جائے گی۔“

آج پورے پندرہ دن ہو گئے تھے کہ اتنی عوام کے ہوتے ہوئے بھی وہ خاتون مجھے ہی مخاطب کرتی تھیں۔ میں بے زاری سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آئی آپ روز مجھ سے ایک ہی سوال پوچھتی ہیں اور میں روز ایک ہی جواب دیتی ہوں پھر بھی آپ کو پتا نہیں چل سکا کہ لالو کھیت یہاں سے بس ایک ہی بس جاتی ہے۔ F-16۔“ ابھی وہ کچھ بولتی کہ میری مطلوبہ بس نے آکر کشتگو میں مداخلت کی اور میں انھیں نظر انداز کر کے بس میں چڑھ گئی۔

آج ویسے ہی مجھے دیر ہوئی تھی اور میرا سانس کا

ٹیسٹ بھی تھا۔ پھر سارا دن کی مصروفیت میں یاد ہی رہا کہ آخر وہ آئی کون ہیں۔ اور مجھ سے کیوں روز ایک ہی سوال کرتی ہیں۔“

اس دن کے بعد پورے دو ہفتے سکون سے گزرے، نہ وہ آئی مجھے نظر آئیں اور میں بھی اس قصے کو بھول بھال گئی اور پھر انیکزائیز کی تیاریوں میں لگ گئی۔

یہاں میں یہ بات واضح کرتی چلوں کہ میرا وہ مطلوبہ اسٹاپ کچھ پراسرار سا تھا۔ آنے جانے والی دونوں سڑکوں کے بیچ ایک گندا اور پر سرار نالہ تھا۔ جس سے آئے دن نامعلوم اشخاص کی لاشیں برآمد ہوتی رہتی تھیں۔

اس طرف جہاں میرا گھر تھا۔ نالے سے کچھ دور کچے کچے مکانات تھے۔ جن میں سے بیشتر خالی تھے اور جو رہائشی تھے ان میں بھی زیادہ تر کرائے داروں کا بسرا تھا۔ پھر اس سڑک کے لیے یہ بھی مشہور تھا کہ وہ سڑک ہر چھ ماہ میں بیچھٹ لیتی ہے۔ مجھے روڈ کراس کر کے اسکول کی طرف مطلوبہ بس لینی ہوتی تھی اور جس طرف میرا اسٹاپ تھا۔ وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں خود رو جھاڑیوں کا ایک گہنا جنگل آباد تھا۔ میرے اسکول جانے کے وقت اکثر ہی وہاں سانے کا راج ہوتا تھا۔ بھی بکھاری وہاں رش ہوا کرتا تھا۔ مگر میں اس وقت کیونکہ بچی تھی اس لیے بھی ان باتوں کو محسوس نہیں کیا۔ بہر حال یہ بچپن نومبر 1992ء کی بات ہے کہ میں خلاف توقع یا معمول آج اسکول جلدی جانے کے خیال سے گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر ہی جب عادت پکڑوں پر خوب پرفیوم لگا کر اپنے رومال کو بھی گنبد کی تیز خوشبو سے تر کر کے اسی کو خدا حافظ کہتی، بیگ سنبھالتی لیے لیے ڈگ بھرتی اسٹاپ پر پہنچی ہی تھی کہ مجھے پھر وہ عجیب و غریب آنٹی طرف آنی دکھائی دیں۔

میں دعا کر رہی تھی کہ میری مطلوبہ بس B-2 جو کہ نیوکراچی سے میرے اسکول کے اسٹاپ ہی حسن تک پہنچانی تھی۔ آجائے کہ اسی اثناء میں وہ آنٹی مجھ تک پہنچ گئی۔

”کیسی ہو کرن!“ ان کے منہ سے آج اپنا نام من کر میں بڑی طرح چونگی تھی۔

”جی..... جی..... میں..... جی ٹھیک مگر..... آ..... آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

میں نے بھکاتے ہوئے پوچھا تو ایک بڑی عجیب سی ہنسی ان کے منہ سے برآمد ہوئی جیسے کسی ریل کی پٹری پر بڑی رفتار سے کوئی ٹرین گزر گئی ہو یا کوئی لاؤڈ اسپیکر چھٹ گیا ہو اور دماغ کو کن کر دینے والی آواز کان کے پردے پھاڑ رہی ہو۔ میں اسٹاپ پر اکیلے ہی اور بس نہ جانے آنے میں کیوں اتنی دیر لگا رہی تھی۔ گھبرا کر میں نے اس عورت کی طرف دیکھا وہ اب بھی مسلسل ہنس رہی تھی۔

چہرے پر ہمیشہ کی طرح نقاب تھا۔ جس سے اس کی لبورنگ آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ جو ایک میل میں لگتا تھا کہ ابل پڑیں گی۔ خوف کے مارے میرے پیر زمین پر جم چکے تھے۔ سانسیں ختم کر کرگوں میں خون کو منجمد کرنے لگی تھیں۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر حلق سے تو کوئی آواز ہی نہیں نکل پارہی تھی۔ اسی اثناء میں اس عورت نما آ سیب یا آ سیب نما عورت نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسٹنا شروع کر دیا۔

وہ مجھے گھسٹ رہی تھی اور مجھے جیسے سکتے ہو گیا تھا۔ اب میں مکمل اس کی گرفت میں تھی۔ سخت سردی میں بھی میرا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا اور دل لگتا تھا کہ ابھی سینے میں قید توڑ کر رہا ہو جائے گا۔ دفعتاً میرے پورے جسم میں خراشیں پڑنے لگیں۔ سکتے ٹوٹا اور میں نے دیکھا کہ میں اس میدان کی خورد رو جھاڑیوں کی رد میں اس مخلوق کے ساتھ ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔ اچانک جیسے میرے دماغ کو کسی نے گنجل دیا کہ تم تو قرآن پاک پڑھی ہوئی ہو۔ پھر کیوں اپنے اللہ سے رجوع نہیں کرتیں۔ اسی کی مدد چاہیے۔ میں..... بس پھر مجھے جتنی آیات قرآنی یاد آتی تھیں میں نے درد شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس عورت سے اپنا ہاتھ چھڑاؤں کہ اچانک ہی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ ہوئی اور ایک نہایت ضعیف بزرگ باہر آئے جن کے ہاتھ میں لاشی

تھی۔ جیسے ہی انھوں نے اپنی لاشی اس عورت کی طرف ماری۔ وہ خوف ناک عورت ایک دلدوز چیخ مار کر میرا ہاتھ چھوڑتی تیزی سے بھاگی اور ان ہی جھاڑیوں میں کہیں گم ہو گئی۔ میں بھی ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئی، اور پورے تین دن بعد ہوش میں آئی تھی۔

اس کے بعد کے حالات مجھے امی کی زبانی معلوم ہوئے کہ تم کو ایک پارلیش بزرگ نے بچایا ہے۔ بیٹا وہ پتا نہیں کس کس سے گھر کا پتا معلوم کر کے تمھیں گھر لائے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر وہ وقت پر تمہارا ہاتھ نہیں پکڑتے تو تم بس کی تیز رفتار کی نظر ہو جاتیں۔ روڈ کراس کرتے ہوئے احتیاط کیا کرو پٹی۔ اگر وہ بزرگ تمھیں نہ بچاتے تو تم..... خدا جانے کیا ہوتا تمہارا۔“ امی کی باتوں سے متنا کی مہک آ رہی تھی۔

شاید ان بزرگ نے امی کو حقیقت سے مطلع نہیں کیا تھا۔ ورنہ امی اتنی بڑی بات برداشت نہیں کر پاتیں۔ اس میں بھی میرے اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ لیکن میرے لیے یہ بات بہت سکون کا باعث تھی کہ میری امی پریشانی سے بچ گئیں۔ مگر اس بات پر تشویش کا اظہار ضرور کرتی ہیں کہ بیٹا کرن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جب تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تو تمھیں ان بزرگ نے بچا بھی لیا تھا، پھر تمہارے یونیفارم پر گھسٹنے کے نشان اور بدن پر خراشیں کیوں تھیں؟“

”اور میں بس اتنا ہی کہہ پاتی ہوں کہ امی جان..... میں تو بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا ہوگا۔“

اور میں خود آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ وہ کون تھی اور مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی؟؟ کہیں امی کی کہی ہوئی بات کانوں سے نگر جاتی ہے۔

”بیٹا کرن! تم اتنی تیز خوشبو لگا کر اسکول مت جایا کرو، زوال کا وقت ہوتا ہے۔“ اور اب میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ میں اس بات کو رد کر دوں۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ اس دن کیا ہوا؟؟؟ وہ سب کیا تھا؟؟؟ کوئی غیبی مدد یا غیبی نصیحت؟؟؟

☆☆☆

نجات

الماس فاطمہ ارمان

کراچی سے اس چائے فروش کا قصہ عجیب جس نے چالیس سال سے بھنگی روح کو

وہ ایک ٹھنڈی سردرات تھی۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھر لحاف میں جا کر دبک کر چائے کو پی کر مڑے لے رہے تھے مگر غریب کی کیا سردی کیا گرمی۔ وہ تو بس روزی کمانے کی فکر میں کسی بات کی پروا نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے کاروبار اور ہوا والوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ ان ہی میں ایک بندہ نواز تھا جو کہ ملتان کا رہنے والا تھا جو کراچی روزی کمانے آیا تھا۔ گرمیوں میں وہ منگے والی قافلی بیچتا اور سردیوں میں چائے اور ساتھ ہی مرغی کی بیٹی بھی۔ تین بیٹی پر اس کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اس چھوٹی سی روزی میں اللہ نے اسے بہت برکت عطا کی تھی زیادہ رش کی وجہ سے اس نے دولڑکے بھی اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ آج غصہ کی سردی تھی۔ سردی کے ساتھ کوئٹہ کی ہوا بھی چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے سردی میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ اکا دکا لوگ آتے اور سوپ کی جگہ آج چائے کا زور زیادہ چلا۔ رات کا ایک بجنے والا تھا شاید آج لڑکوں کو بھی سردی بہت لگ رہی تھی۔

”استاد دکان بند کر کے گھر چلنا چاہیے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے ایک ایک چائے کا گرم کپ پی لو تمہارا پیدل کا راستہ ہے۔“

”ٹھیک ہے استاد۔“

”تمام کام ختم کر کے بچے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ نواز بھی کچھ چیزوں کو سمیٹ کر چائے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اسے چوڑیوں کی کھٹک سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ جس نے اورنگ کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے لباس اور جسم سے عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی جو نواز محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتا۔

”مختصر آپ اتنی رات میں کیا کرنے آئی ہیں۔“

”ارے یہ کیسا سوال پوچھ رہے ہو۔ سردی ہے تمہارے ہونٹ سے چائے پینے آئی ہوں۔“

”مگر بی بی میں تو اپنا ٹیکسین بند کر چکا ہوں، تمام سامان بھی، آپ گھر جائیں اور اپنے بچوں میں اچھی سی چائے بنا میں۔ خود بھی پیئیں اور گھر والوں کو بھی اگر وہ جاگ رہے ہوں تو۔“

”جناب باتیں اچھی کرتے ہیں آپ۔ میں بہت ضدی ہوں۔ چائے تو آپ کے ہاتھ ہی کی بیویں گی۔“

”جائیں اپنے گھر۔ یہ سن کر وہ لڑکی زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ایک عجیب سی جلتہ لگتی تھی۔ جسے وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فضا میں ہنسی گونج رہی تھی۔

نواز نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں، گلابی گلاب کی طرح چہرہ جو میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ اس کے حسن میں کھوسا گیا۔ اس

نے جلدی سے چولہا جلایا۔ فریج سے دودھ نکال کر دودھ پی کی چائے اسے بنا کر اسے پیش کی۔

”یہ بیس جلدی سے پی کر آپ اپنے گھر کی راہ پکڑیں۔“

”ارے آپ کو بڑی جلدی ہے۔“

”محترمہ۔۔۔۔۔۔“

”میرا نام محترمہ نہیں رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے راجا صاحبہ! اگر پولیس کی موہاں یہاں تک پہنچ گئی تو آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔ میں شریف آدمی ہوں آپ جلدی سے چائے ختم کیجیے۔“

”ارے آپ کتنے ڈر پوک ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں پرندہ بھی پر نہیں مارے گا۔ انسان کو تو چھوڑ دیے۔“

نواز کے جسم میں سناٹا ہی سی دوڑ رہی تھی آخر یہ کیا بلا ہے۔ بلا کا نام ذہن میں آتے ہی نواز کی ہوا کم ہو گئی۔ یہ کوئی چیل یا آئینی سایا ہے کیونکہ اس کے سین کے ساتھ ہی بڑے بڑے برگد کے درخت تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا یہاں پر سایا ہے۔

”ارے تم جو سوچ رہے ہو بالکل ویسا ہی ہے۔ میں ایک جڑیل ہوں مگر تم سے پیار کر رہی ہوں۔ میں سامنے والے درخت پر بیٹھی تم کو دیکھتی رہتی تھی، مگر موقع نہیں ملا تم سے اکیلے میں بات کرنے کا۔ آج موقع مل گیا جس کی

میں تلاش میں تھی۔ میں رجا کی روح ہوں۔ میں سب بتاتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کپ ایک طرف رکھا اور دو درختوں میں دیکھتے ہوئے بولنے لگی۔

”میرا نام رجا ہے۔ میں نے خود کشی کی تھی۔ ذات کی بھنگن یعنی جعدا رقوم سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں تمہیں دوسری ملاقات میں سب کچھ بتاؤں گی۔ میری وجہ سے تم پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی، بس تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ جاؤ۔ اب تم گھر جاؤ تمہاری بیوی اور ماں فکر مند ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔ نواز تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور گھر کا رخ کیا۔ راستے میں بھی اسے رجا کا خیال آ رہا تھا۔

جیسے ہی وہ گھر پہنچا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے دو لحاف اوڑھا دو، مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔“

رات بیت رہی تھی مگر نواز کی آنکھوں سے نیند اوجھل تھی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر وہ پھر لحاف میں دبک گیا۔ بتا نہیں کس وقت نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ ظہر کی نماز کے لیے اس کی بیوی نے اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔ اس کا پورا جسم درد کر رہا تھا۔ اس نے تھوڑا بہت ناشتا کیا۔ دروی دوالی کھائی اور مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆



جب سب نمازی جا چکے تو اُس نے مولانا صاحب جو کہ عامل بھی تھے۔ انہیں متوجہ کر کے رات والی ساری داستان سنانی۔ وہ حیرانی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ انہوں نے نواز سے کہا۔

”تم کل میرے ساتھ میرے استاد کے پاس چلو وہ ضرور تمہیں اس سے نجات کا تعویذ بنا کر دیں گے۔“ نواز کو کچھ آس نظر آئی۔

وہ شام کو بہن پر چلا گیا۔ اُس نے اپنے ارد گرد آیت انکری اور چاروں مل کا حصار کھینچا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ وہ کوشش میں تھا کہ بارہ بجے دکان بند کر کے چلا جائے وقت کا پتہ بھی نہ چلا۔ آج بھی سردی عروج پر تھی۔ مگر آج کل کے مقابلے میں دس زیادہ تھا۔ دس کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس طرح پھر وہی ٹائم ہو گیا۔ لڑکے چلے گئے۔ نواز ڈر رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی سب سیٹ کر گھر کا رخ کر رہا تھا۔ وہ دکان سے نکل کر چوٹی کی طرف آ گیا۔ اُس نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں چھڑی لیے سڑک کے بیچ میں کھڑی کانپ رہی ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روک دی تھی۔ نواز نے اپنی بائیک روکی اور قریب جا کر پوچھا۔

”اماں آپ اتنی رات میں کیا کر رہی ہو۔“

”بیٹا میں راستہ بھول چکی ہوں۔“

”کہاں جانا ہے۔“

”مجھے لالو گھیت جانا ہے۔“

”اماں اسکول پر بیٹھو میں تمہیں لالو گھیت چھوڑ دیتا ہوں۔“ وہ جلدی سے اسکول پر پہنچ گئیں۔

ابھی وہ اپنے خیالوں میں چل رہا تھا کہ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پیچھے جو بڑھیا بیٹھی ہے۔ اُس کے پاس سے وہی معطر خوشبو اور چوڑیوں کی ٹھنک آرہی ہے، اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ راجستانی وہی بدروح تھی۔

”ارے سامنے دیکھو ٹرک آ رہا ہے۔“ واقعی اُس کی بائیک کے سامنے ٹرک تھا۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بائیک بے ساختہ رگڑ گئی۔ ”آپ.....“

”ہاں میں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارا آسانی سے چھپا چھوڑ دوں گی نہیں..... جب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی تو تم مولویوں کے پکر میں پڑ رہے ہو۔ تمہارے مولوی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”مجھے گھر جانا ہے گھر والے میرا انتظار کرتے ہوں گے۔“ میں بھی تو کب سے تمہارے انتظار میں سڑک پر کھڑی تھی۔ چلو میرے ساتھ۔“ نواز درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”دیکھو میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے ہند گھڑی بات کر لیا کرو۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔“

”بویو لے کیا کام ہے؟“

”میں بتاتی ہوں۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے جہاں برگد کا درخت اور چالی گراؤنڈ ہے، یہاں چند بچے کئے مکانات تھے۔ میری فیملی بھی ان ہی میں رہتی تھی۔ ہم لوگ کرچن تھے۔ مجھے سامنے جھوٹیڑی میں رہنے والے ایک لڑکے شوکت سے محبت ہوئی جو کہ مسلمان تھا۔ ہم ساتھ ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ کئی عمر میں چار ہو گیا۔ وہ بھی مجھ سے دو ہاتھ آگے نکلا۔ ہم لوگ اسکول کے بھانے سے ادھر ادھر ملتے رہتے۔ ایک دن میرے ابا نے دیکھ لیا۔ مجھے بہت مارا اور شوکت کے ابا سے بھی شکایت کی۔ وہ بہت ہی نیک آدمی تھے۔ انہوں نے شوکت کو ڈانٹا۔ میرا اسکول جانا بند ہو گیا بہت ہی پابندیوں کے باوجود میں شوکت سے ملتی رہتی۔ اس راز میں میری چھوٹی بہن شامل تھی۔ پھر میرے ابا نے فیصلہ کیا کہ مجھے تانی کے پاس پنجاب بھیج دیا جائے۔ وہیں پر کوئی اپنی ذات کا لڑکا دیکھ کر میرا بیاہ کر دیا جائے۔ جس دن مجھے پنجاب جانا تھا۔ اُس سے ایک دن پہلے میں نے اور شوکت نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ میری چھوٹی بہن کو پتا چل گیا، عین وقت پر اُس نے ابا کو بتا دیا۔ ابا نے مجھے بہت مارا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر شوکت کے علاوہ کسی کی نہیں بنوں گی۔ میں نے رات کو سونے سے پہلے فائل لی لیا جو میرا ابا اسپتالوں میں ہاتھ روم دھونے کے لیے لاتا تھا۔ میں ختم ہو چکی تھی۔ میرے ابا نے جب یہ دیکھا کہ میں مر چکی ہوں تو اُس نے مجھے صبح ہونے سے پہلے اس برگد کے درخت کے نیچے گڑا کھوکھو کر دین کر دیا اور خود اماں اور بہن کو لے کر پنجاب بھاگ گیا۔

چند دن بعد شوکت اور اُس کے ابو بھی نہ جانے کہاں چلے گئے مگر اُس دن سے میری روح بھٹک رہی ہے۔ اس

درخت کے نیچے آج بھی میری تازہ لاش موجود ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے نکال کر مسیحی قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تمہاری شکل شوکت سے بہت ملتی ہے۔ تم کل رات دو بجے کے بعد میری ڈیڈ باڈی درخت کے نیچے سے نکال کر مسیحی قبرستان میں ڈال آؤ کیونکہ یہاں تمام مسلمانوں کی درگاہ ہے۔ یہاں سے مجھے آزادی ملے۔ جب بھی میں یہاں سے آزادی کی کوشش کرتی ہوں کوئی نہ کوئی چیز آڑے آ جاتی ہے۔ تم صرف میری ڈیڈ باڈی مسیحی قبرستان کی پیچھے والی جھڑیوں میں پھینک کر آ جانا باقی سب میرا کام ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

نواز نے فوری بائیک اشارت کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اُس کو سخت سردی میں بھی بیٹھے آ رہے تھے۔ گھر آتے آتے اُس پر سخت کچی طاری ہوئی تھی۔ بیوی نے دو کبل دو لحاف اوڑھا دیے، دودھ میں ہلدی ڈال کر پلایا مگر نواز کو سخت بخار اور سردی کی کیفیت طاری تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح اُس نے مسجد سے مولانا صاحب کو بلایا اور تمام حقیقت بیان کی۔ مولانا صاحب پریشان ہو گئے انہوں نے اُسے فوری استاد کے پاس چلنے کو کہا۔ بڑی مشکل سے وہ بستر سے اٹھا اور وہاں تک پہنچا۔

وہ اپنے آستانے میں ہی تھے۔ انہوں نے نواز سے شروع سے آخر تک داستان سنی۔ یہ حقیقت سن کر وہ خود حیران تھے۔

”مولانا صاحب آپ بتائیں کیا میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں کیسے اُس کی لاش کو نکال کر وہاں تک لے کر جاؤں اور وہاں جھڑیوں میں پھینکوں۔“

”تمہیں ہمت کر کے یہ کام کرنا ہوگا، ورنہ وہ کبھی بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میں تمہیں پانی دم کر کے دیتا ہوں اور شش بنا کر دیتا ہوں۔ تم اُسے فوری گلے میں ڈال لو۔ جب تم یہ کام کرو تو یہ پانی کی بوتل ساتھ رکھنا۔ اس کے پانی کو تم اس جگہ کے ارد گرد پھینکنا اور وقت وقت سے پانی کو پینا۔ اس کے اثر سے وہ تم پر نہ تو حملہ کر سکے گی اور نہ ہی اُس وقت تک بیدار ہوگی جب تک تم اُسے جھڑیوں میں نہیں پھینک دیتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری مدد کروں۔ میں پڑھائی کرتا رہوں گا۔ تم اس کام کے لیے کسی سے گاڑی لے لو۔“

”ہاں میرے ماموں کے بیٹے کے پاس ٹیکسی ہے۔“

میں اُس سے لے لوں گا۔“

بہر حال نواز دوسرے دن تمام کاموں سے فارغ ہو کر اُس درخت کی طرف چل دیا۔ مولانا صاحب آگئے تھے۔ اُس نے تمام چیزوں کا پتہ لے لیا۔ ہی انتظام کر لیا تھا۔

اُسے اُس جگہ کو کھودنے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس جگہ سے معطر خوشبو آنا شروع ہوئی۔ نواز نے پانی پیا اور چاروں طرف پھڑکا اور کام تیزی سے کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ایک لڑکی کی لاش مل گئی۔ وہ لڑکی بالکل رجا کی طرح خوبصورت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ایک عرصے بعد بھی اس کی لاش بالکل تازہ تھی۔ اُس نے وہی اورنگ لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے گلے میں مسیحی لاکٹ بڑا ہوا تھا۔ اُس نے جلدی سے لاش کو چادر میں باندھا، کتلی کی ڈبگی میں رکھا۔ مولانا صاحب بھی جلد ہی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنی بڑھائی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اچانک لاش میں سے ایک گندی بد بو آنے لگی۔ گاڑی میں سانس لینا مشکل ہو گیا۔ مولانا صاحب بولے۔

”نواز جلدی کرو اگر یہ بیدار ہوئی تو تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔“ بڑی مشکل سے وہ لوگ قبرستان تک پہنچے نواز نے رجا کی باڈی کو جلدی سے جھڑیوں میں پھینکا۔ اُسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کو مولانا صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔

چاروں طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فضا میں عجیب سی سرسراہٹ طاری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بچی سسک سسک کر رو رہی ہے۔ مولانا صاحب آنکھیں بند کر کے قرآنی آیتوں کا ورد کرتے رہے۔

نواز نے گاڑی جلد ہی گھر کو جانے والے راستے پر موڑ دی۔

گھر پہنچ کر انہوں نے شکر ادا کیا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ تم بالکل پریشان مت ہونا۔ وہ اپنی جگہ پر پہنچ گئی ہے۔

یہ داستان نواز نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے دوست کو سنائی تھی۔ جس کی بدولت آج میں لکھ رہی ہوں۔ اللہ جانتا ہے کیا جھوٹ ہے کیا سچ۔

☆.....☆.....☆



چوتھی اسرار پوری کتبھا

بیٹا دے یا..... مایا

یساعروج صدیقی

اُس ماں کی کہانی جس سے مایا بیٹے کی بھینٹ مانگ رہی تھی

”ہائیں یہ کیا بک رہا ہے تو۔“
”ہاں اماں زرا ذہین کو چھو کر دیکھو تو۔“

گلشن نے جیسے ہی زمین کو ہاتھ لگایا ارشد کے ارد گردی زمین اُسے گرم محسوس ہوئی۔ ارشد وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ مگر گلشن تشویش میں مبتلا ہوئی۔ مگر پھر اس نے اپنا وہم سمجھ کر اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ ارشد کھانا کھا کر دکان چلا گیا۔ اور گلشن پردوس میں قرآن خوانی میں مشغول رہنے چلی گئی۔ شام کو جب سب لوگ گھر لوٹے تو ارشد گلشن کے علاوہ کچھ بھی چونکے۔ بناندر ہا کہ زمین کا ایک خاص حصہ جہاں ارشد سوتا تھا وہ نہایت گرم گرم ہو رہا تھا۔ اتنا گرم کہ ہاتھ رکھنے پر جلنے لگتا۔ وہاں سوتا تو دور بیٹھنا تک ممکن نہ تھا۔ یہ ایک انوکھی اور عجیب سی بات تھی۔ ایسا بھی نہ تھا کہ کچھ کسی چھاڑی علاقے کا باقی تھا۔ جہاں آتش فشاں کے باعث زمین گرم ہو رہی ہو۔ خیال آیا کہ ساتھ کے گھر والے حلیم بریانی کا کاروبار کرتے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے رات بھر حلیم پکایا جو جس کے اثر سے زمین گرم ہو گئی ہو۔ گلشن فوراً دیوار کے چبھے رہنے والے محمود بھائی کے گھر دوڑی مگر انہوں نے تو کئی مہینوں سے حلیم بریانی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اور انہوں نے حلیم وغیرہ کچھ بھی نہیں پکایا تھا۔ گلشن اب پریشان ہوئی۔ وہ دوڑی دوڑی گھر اہٹ کے عالم میں میرے پاس آ گئی۔ اس وقت میں مغرب کی نماز ادا کر کے فارغ ہوئی تھی۔ جب بھی اُسے کوئی دینی مذہبی بات

آج پھر کچھ کی بیوی نے وہی خواب دیکھا تھا۔ جو وہ گزشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اُس کا گھاٹک ہو رہا تھا۔ اس کے بڑبڑا کر اٹھنے سے کچھ کی نیند خراب ہو گئی تھی اور وہ بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ ”ارے بھئی کیا بات ہے۔ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔“ ”آج پھر مجھے وہی خواب دکھائی دیا ہے۔ ارشد کے ابو تم کسی سے میرے خواب کی تعبیر پتا کرو۔ کوئی میری آواز میرے بچے کو مانگ رہی ہے۔ جب سے یہ خواب دکھائی دیا ہے ارشد بھی بیمار رہنے لگا ہے۔ اور دوسرے اس کا ایک ہیٹ ہوتے ہوتے چلا ہے۔ تم کل جا کر مفتی صاحب سے میرے خواب کی تعبیر پتا کرو۔“ کچھ خوابوں پر یقین رکھنے والا بندہ نہ تھا۔ وہ اول قول بٹکا ہوا کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے نزدیک گلشن کے خوابوں کی جب تبخیر معدہ کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ گلشن رات بھر سو نہ سکی۔ صبح وہ بوچھل اور تھکی تھی۔ اُس نے تمام کام ختم کیے۔ وہ پھر کو ارشد دکان سے کھانا کھانے آیا۔ ہاتھ دھو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ”ای جلدی سے مجھے کھانا دے دو واپس دکان جانا ہے۔“ ”ہاں اچھی لائی۔“ گلشن نے ارشد کے آگے کھانا لا کر رکھ دیا۔ جو پہلے سے تیار تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اُسے احساس ہوا کہ جس جگہ وہ بیٹھا ہے وہاں زمین کچھ گرم ہے۔ ”ای دیکھا زرا یہ زمین گرم ہے یا مجھے محسوس ہو رہی ہے۔“

گرم ہو رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”تم فوراً میرے ساتھ چلو۔“ میں ایک لمحہ کی دیر کے بنا اُسے قریبی مسجد کے امام صاحب کے پاس لے گئی۔ کیونکہ امام صاحب مخصوص دنوں اور مخصوص وقت تک مسائل کا حل لوگوں کو دیتے تھے۔ اگر وہ اٹھ جاتے تو دیر ہو جاتی۔ گلشن میرے ساتھ دوڑ پڑی۔ امام صاحب نے مسئلے کو غور سے سنا اور مسئلے کا حل عنایت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ فوراً گھر جائیں ابھی اسی وقت گھر کے مردوں سے گھر کے چاروں کو نوں میں اذان دلوائیں۔ یہ دم کیا ہوا پانی اُس جگہ پھڑک دیں۔ اور تین دن تک اذانیں چاروں کو نوں میں دلوائیں۔ اور اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔“ گلشن نے ایسا ہی کیا رفتہ رفتہ زمین ٹھنڈی ہوئی گئی۔ اور وہ زمین جس پر پانی پھڑکنے پر چلنے کی آواز سے دھواں اٹھتا تھا۔ رفتہ رفتہ دو دن کے اندر ٹھنڈی ہوئی چلی گئی۔ اس کے بعد گلشن کو بھی وہ خواب نظر نہیں آیا۔ اُس نے وہ گھر فروخت کر دیا ہے۔ آج بھی وہ گھر موجود اُس گھر کے نئے مکین آرام سے رہ رہے ہیں۔ میں اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہوں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ تجا نے وہاں آج بھی اُس گھر میں دفن ہے یا زمین نیچے سے قرآن و اذان کی برکت سے کہیں اور بھینٹ مانگنے لگی ہو۔ کون جانے۔

☆☆☆





پانچویں اسرار پیری گتھا

پچھل پیری

بشیر احمد بھٹی



بہاول پور سے ایک خوف بیتی

اس خوفناک کہانی کا راوی عظیم الدین کا بھائی نعیم الدین ہے۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت نعیم الدین کی کوئی بستی چوک میں آڈیو ڈیو کی شاپ بھی تاج دین کا بیٹا اکبر شاہ نعیم بھائی کی دکان پر کام کرتا تھا۔ گرمی کی ایک رات کا ذکر ہے۔ نعیم الدین کو چند پوز لینے کی خاطر بازار جانا پڑا وہ بازار گیا اور اپنے ایک دوست کی دکان سے اس نے چند ڈیو کیسٹ لیں اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔ سینٹرل لائبریری روڈ اس وقت ویران رہتا تھا۔ اس روڈ پر لائٹ وغیرہ کا بندوبست نہیں تھا۔ رات کو اس روڈ پر آٹو بولتے تھے۔ بہت کم لوگ اس روڈ کو استعمال کرتے تھے۔ نعیم بھائی نے یہ افواہ بھی سن رکھی تھی کہ رات کو اس روڈ پر ایک پراسرار عورت نظر آتی ہے جو چلتے چلے اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ کئی لوگ تو اس نظارے کو اپنی نظروں کا دھوکہ سمجھتے تھے۔ دل کا وہم سمجھ کے کئی لوگوں نے اس بات کی پروا نہیں کی۔

وہ مافوق الفطرت پراسرار عورت کون تھی؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سینٹرل لائبریری اور اب موجودہ آڈیو نعیم کی جو عمارت ہے۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان ایک کھلی نما روش، جس میں اینٹوں کا فرش لگا ہوا ہے۔ عدالت کی طرف جاتی ہے۔ پہلے یہ راستہ عدالت کی طرف جانے والے لوگ استعمال کرتے تھے۔ آج کل اس راستے کو بند کر دیا گیا ہے۔ یہ راستہ اب جھاڑ جھنکار سے پُر، ویران پڑا

ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف لوہے کا جنگل لگا ہوا ہے۔ ایک جانب لائبریری کا پلاٹ ہے۔ دوسری جانب آڈیو نعیم کا پلاٹ اور عمارت موجود ہے۔ آڈیو نعیم میں ریلوے کا ایک قدیم کالا انجن بھی جنگل کے قریب مصنوعی لائن پر کھڑا ہے۔ آڈیو نعیم میں موجود پاکستانی ثقافت کو دیکھنے کا ٹکٹ 10 روپے ہے۔ اندر بہت کچھ موجود ہے۔ جب پاکستان وجود میں آ رہا تھا۔ اس وقت کی ادب و ثقافت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قائد اعظم، لیاقت علی خان، مجتہد فاطمہ جناح کی ماضی کی شاندار تصاویر کا اس آڈیو نعیم میں نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادارہ اتوار کو بھی کھلا رہتا ہے۔ سرکاری ملازمین اتوار کو ڈیوٹی کرتے ہیں اور اتواری جگہ سوموار کو تعطیل یعنی چھٹی کرتے ہیں۔

ویڈیو فلمیں لے کر رات کو دس بجے جب لائبریری روڈ پر پہنچا۔ اس وقت روڈ ویران پڑا تھا۔ اس پُر اسرار عورت کے بارے میں اس نے بھی سن رکھا تھا۔ مگر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس وقت یہ روڈ سنگل تھا۔ اب خیر سے اس روڈ کو ڈبل (دو روے) کر دیا گیا ہے۔ لائٹ کا بھی بندوبست ہے۔ دونوں سروں کے درمیان درخت بھی لگا دیے گئے ہیں۔ جو کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ سروں کے دونوں جانب لوہے کے فنگلے بھی موجود ہیں۔ یعنی سینٹرل لائبریری والی سمت میں اور کونور یہ اسپتال کی سمت میں۔

نعیم الدین جون ہی سینٹرل لائبریری کے سامنے پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک عورت چلتی چلی جا رہی ہے۔ وہ عورت چونکہ کافی آگے تھی۔ اس لیے جب نعیم الدین اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔ مرد حضرات کی یہ عادت ہوتی ہے۔ دن ہو یا رات۔ عورتوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اُن پر ایک طائرانہ سی نگاہ ضرور ڈالتے ہیں۔ جب نعیم الدین نے اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ اس گلی کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ جو سینٹرل لائبریری اور آڈیو نعیم کے درمیان سے عدالت کی طرف جانے کا راستہ تھا۔ عورت کا لباس چمکا تھا۔ سر پر چڑیا تھی۔ گھٹنوں سے اوپر تک پیش کی لمبائی تھی۔ شلوار کی جگہ اس نے گھٹا کھرا پن رکھا تھا۔ مکمل ہندوؤں کا لباس تھا۔ عورت عدالت کی طرف جانے والے گلی نما راستے کے کنارے برکی ہوئی تھی۔

ایک نعیم الدین کی آنکھوں میں ایک روشنی سی لہرائی۔ اس کی آنکھیں خیر ہو گئیں۔ یہ روشنی چمکل کرتے انداز میں اس کے چہرے کی طرف آ رہی تھی۔ وہ عورت ہاتھ کی دو انگلیوں کو اوپر نیچے کر کے اسے اپنی جانب بلاری تھی۔ اس کی انگلیوں کے ناخن بوڑھے تھے۔ اُن ناخنوں کی سطح چمکیلی تھی۔ ناخنوں سے تو سبز و قرمز جیسے نیلے پیلے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ چمک اتنی تیز تھی کہ نعیم الدین کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کر لیا اور پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے ہاتھ کر کے اس نے عورت کے پیروں کی طرف دیکھا۔ پیر پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ اس کا گھٹا کھرا ناخنوں سے ذرا اوپر تھا۔ نعیم الدین نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ عورت پچھل پیری ہے۔

اب اس کا وہاں ٹھہرنا جان جو کھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اُس نے فوراً آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی دکان پر جا کے دم لیا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ یہ پچھل پیری ہندو ہے۔ اس نے اکبر شاہ سے کہا۔ ”تم دکان بند کرو۔ میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔ طبیعت خراب ہے۔ سر درد ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر نعیم الدین گھر گیا اور اُس نے دو گولیاں اسپرین کی کھانسی اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ ساری رات نیند اس کی آنکھوں سے دور رہی۔ وہ کمرٹ بدلتا رہا۔ یہ نظارہ اسے پریشان کر گیا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ دکان پر دن کے بارہ بجے آیا۔ اس نے مجھے اور اکبر شاہ کو رات کا یہ واقعہ سنایا۔ نعیم الدین نے ہمیں تلقین کی کہ رات کو لائبریری روڈ پر نہ جایا کرو۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ وہ روڈ رات کو ویران کیوں ہو جاتا ہے۔ لوگ اس روڈ سے کیوں دور رہتے ہیں؟ اگر تم رات کو بازار جاؤ تو ڈی سی آفس چوک سے ہو کر جاؤ اور اُنی راستے سے واپس آؤ۔ ہاں لائبریری اور آڈیو نعیم کے درمیان جو گلی ہے۔ اس میں سے تو ہرگز نہ جانا۔ وہ اس پُر اسرار عورت کا مسکن ہے۔“

یہ کہانی سن کر نعیم الدین نے اکبر شاہ سے کہا کہ اس رات میں آیت الکرسی کی برکت سے بچ کر آیا ہوں۔ ہر مسلمان عورت مرد اور بالغ بچوں پر لازم ہے کہ وہ آیت الکرسی زبانی یاد کر لیں۔ اس سے جنت گھر ہے۔ اور نقصان نہیں پہنچتا۔“

☆☆☆



چشتی اسرار پوری گستا

خلوہ کھاؤں گی!

محمد اسامہ



اُس جوڑے کو خدا نے اولاد تو دی، لیکن.....!

دس بجے مجھے اوپر بلانے آئی اور بڑی خوشی کے ساتھ کہا ”انیسہ جلدی میرے ساتھ چلو بھائی کی لڑکی ہوئی ہے۔ دونوں ساتھ چل کر اپنی بیٹی کو دیکھتے ہیں۔“ جب ہم دونوں نیچے پہنچے تو بچی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ بچی عام بچیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے چہرے کا آدھا حصہ خاصا گورا تھا جبکہ باقی آدھا حصہ سانولے رنگ کا تھا۔ کسی کی امی نے بتایا کہ یہ بچی اب تک ایک منٹ کو بھی نہیں روئی۔ میں نے جلد ہی یہ محسوس کیا کہ یہ بچی اس گھر کی درود یوار کو اس طرح تک رہی تھی جیسے برسوں پہلے یہاں رہ چکی ہو۔ وہ بچی جسمانی طور پر دو ٹکڑے پہلے پیدا ہوئی بچی معلوم ہو رہی تھی لیکن اس کی حرکات کسی بے حد ذہین اور چالاک انسان کی سی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شہین نے بچی کو گود میں لیا اور ہر ماں کی طرح پیار سے اس سے پوچھنے لگی کہ میری بیٹی کو پھوک لگی ہے، میری بیٹی کیا کھائے گی؟ مگر اس وقت ہم سب کے قدموں تلے زمین نکل گئی جب اس بچی کے منہ سے تقریباً بیس بائیس سالہ عورت جیسی آواز نکلی اور وہ بولی ”میں طلوہ کھاؤں گی“ یہ آواز اتنی صاف تھی اسے وہم کا نام نہ دے سکے۔

بھی بھی ہماری زندگی میں ایسے پراسرار واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جنہیں جب ہم کسی اور کو بتاتے ہیں تو لوگ یقین نہیں کرتے یا پھر ہنس دیتے ہیں۔ ایک ایسا ہی پراسرار واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم لوگ سیالکوٹ میں رہا کرتے تھے۔ ہمارا گھر دو منزلہ تھا اوپر ہم رہتے تھے جبکہ نیچے والا پورشن ہم نے عنایت صاحب کو کرائے پر دیا ہوا تھا جو اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جلد ہی عنایت کی چھوٹی بہن کسی سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ انہی دنوں میں عنایت بھائی کے لیے ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے رشتے کی بات شروع ہوئی۔ لڑکی چونکہ خوبصورت اور معصوم تھی اس لیے عنایت کی ماں نے فوراً حامی بھری۔ ایک سال کے اندر شہین دہن بن کر عنایت کے گھر آئی۔ شادی کے بعد تقریباً چھ سال تک عنایت اولاد جیسی نعمت سے محروم رہا لیکن ساتواں سال عنایت کے لیے خوشی کا سورج لے کر طلوع ہوا۔ مجھے وہ رات اچھی طرح یاد جب عظمیٰ رات کو

شہینہ تو ایک دم سکتے کی حالت میں آگئی، اس نے ہمارا اس پراسرار بچی کو پلنگ پر چھوڑ دیا۔ کیا بتاؤں اس وقت ہم سب کی کیا حالت تھی۔ وہ بچی ہم سب کو لڑی باری اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے بس ابھی ہم کو کسی بھوکے شیرنی کی طرح کھا جائے گی۔ ہم سب ڈر کی وجہ سے اس بچی کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ کسی کی امی نے جلد ہی مولوی صاحب کو بلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں مولوی صاحب آ گئے۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے اس بچی کو غور سے دیکھا۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ انہوں نے بچی

مولوی صاحب نے یہ سننے کے بعد عنایت سے چادر مانگی، بچی کو اس میں لپیٹا اور اس پراسرار بچی کو فرش پر لٹا دیا۔ آپ یقین کریں اس وقت میں وہاں موجود تھی۔ پلنگ جھپکتے ہی وہ لڑکی فرش سے غائب ہو گئی اور جیسے ہی وہ فرش سے غائب ہوئی، موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ عنایت صاحب نے ہمت کر کے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مولوی صاحب یہ سب کیا تھا۔“ مولوی صاحب نے کہا، ”بیٹے یہ سب خدا



کے فیصلے ہیں۔ وہی بہتر جانتا ہے ہم بندے کیا کہہ سکتے ہیں۔“ دو ماہ کے بعد عنایت صاحب سیالکوٹ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں آباد ہو گئے اور ہم نے بھی اپنا دو منزلہ گھر فروخت کر دیا۔ آج بھی جب وہ پراسرار بچی آنکھوں کے سامنے تصویر بن کر آتی ہے تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں اس بچی کی شکل کو اب تک نہیں بھولی ہوں حالانکہ اس واقعے کو برسوں گزر گئے ہیں۔ ☆☆☆

کے پیروں کو پکڑا اور پوچھنے لگے ”بتا کون ہے تو؟“ اس بار اس بچی کے منہ سے ایک الفاظ بھی نہیں نکلا، بس صرف اس کی آنکھیں لال ہو گئیں، جن میں خون سا تیرنے لگا۔ مولوی صاحب نے دوبارہ یہی عمل دہرایا اور پوچھا ”بتا کون ہے تو؟“ اس بار اس بچی کے منہ سے بچ نکلی اور اس نے خوفناک آواز میں کہا۔ ”مجھے کچھ مت کرو۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی، مجھے چادر میں لپیٹ کر رجن میں چھوڑ دو۔ لیکن یاد رکھنا میرے جانے کے بعد تیز آندھی آئے گی اور بارش ہوگی۔“

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(دوسرا حصہ)

تمام قزاق اپنی کشتی میں سوار ہو چلے تو کشتی میں چپو چلانے پر معمور قزاق جو پہلے ہی چپو تھامے جیسے تیار کھڑے تھے۔ نے تیزی سے چپو چلانے شروع کر دیے۔ جسم کی طاقت بازوؤں سے چپوؤں کو منتقل ہوئی۔ چپو نیلے پانی کو مخالف سمت دھکیلتے اور کشتی آگے کی طرف سرکتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی بحری بیڑے سے دور ہوتی گئی۔ قزاقوں کے سردار نے اپنی دہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک لاکٹ تھا۔ لاکٹ میں ایک سفید رنگ کا گینگہ جڑا تھا۔ گینگہ سے روشنی اس طرح منعکس ہوتی کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی۔ یہ گینگہ سردار نے بیڑے کی ایک امیر خاتون کے گلے سے اترا دیا تھا۔ قہقہہ لگا کر سردار نے گینگہ کی ٹھنڈک کو ہاتھوں کی پوروں سے محسوس کیا اور اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔ ”یہ ایک نایاب گینگہ ہے، اس کی قیمت لگانا جو ہریوں کے بس میں نہ ہوگا۔“

مکروہ چہرے والے قزاق کی آنکھوں کی چمک بھی دہشت میں مبتلا کرنے والی تھی۔ سبھی قزاق سردار کے ہاتھ میں دبے گینگہ کو شوق سے دیکھنے لگے۔ سوائے کنارے پر کھڑے سنہری بالوں والے عربی النسل قزاق کے۔

”کیا یہ ہیرا ہے؟“

”ہاں۔“ سردار نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ سردار ہیرے کی وضع، تراش اور ساخت کے بارے میں بتانے لگا، سبھی سنبھک ہو کر سنتے ہوئے جوڑ توڑ کرنے لگے کہ ہیرا کس قیمت میں فروخت ہوگا۔ سنہری بالوں والا قزاق بولا۔

”سردار میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ سردار نے عربی النسل نوجوان کو بغور دیکھا۔ جیسے نظروں میں تو لا۔ یہ اس کے گروہ کا سب سے نرم دل قزاق تھا۔ جسے ہمیشہ لوٹے جانے والے لوگوں کی فکر رہتی تھی۔ یوں تو اس کی رحم دلی سردار کو زیادہ پسند نہ تھی مگر وہ جانتا تھا کہ یہ رحم دلی اسے نسل منتقل ہوئی ہے۔ دراشت میں منتقل ہوئی۔ چیز پر اب سردار کیا اعتراض کرتا۔

”بولو۔“ سردار کی آواز گرجدار تھی۔ سنہری بالوں والے قزاق نے ایک نظر لمحہ بد لمحہ دور ہوتے بیڑے پر ڈالی۔ جس کا پھٹا ہوا بادبان ہوا کے دوش پر لپھٹا تا عجیب منظر پیش کرتا تھا۔

”سردار اس بیڑے کا بادبان پھٹ گیا ہے۔ بیڑہ بے سمت ہو کر سمندر میں بھٹک جائے گا۔ سمندر میں بھٹکنے والے بھلا کہاں منزل کو پہنچ پاتے ہیں۔“ سردار نے توجہ سے سنا۔ چند لمحے خاموش نظروں سے اپنے عرب النسل

کیا آج صاحب آئے گا۔ اس دن مال میں اس نے جو احتیاط نہ حرکت کی تھی اس کے بعد بھی اگر وہ صاحب آتا ہے تو یقیناً وہ چنبیلی سے کچھ خاص لگا کر رکھتا ہے۔

”دیئے شکر ہے صاحب کے ساتھ لڑکی کو شک نہ ہوا اور صاحب نے بات سنبھال لی۔“ مشرق سے مغرب فٹ پاتھ مانے کے بعد چنبیلی نے رخ موڑا اور اب مغرب سے مشرق قدم قدم چلنے لگی۔

سرخ گاڑی فٹ پاتھ کے قریب جھٹکے سے رکی۔ قبل اس کہ چنبیلی متوجہ ہوئی۔ بدر دروازہ کھولتا اتر ا۔ اور قدموں سے دھک پیدا کرتا چنبیلی کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ بدر کے چہرے کا تناؤ اس کے غصے کی وضاحت کر رہا تھا۔ چنبیلی نا چنبی سے بدر کو دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتی۔ بدر نے دایاں ہاتھ گھمایا اور ایک پھپر چنبیلی کے بائیں گال پر پڑا تھا۔

”فاجشہ“ تجھے پیسے اس لیے نہیں دیتا تھا کہ تو شہر میں



ایک بار پھر سیفی کو مبارک بادیں دینے لگیں۔
”مبارک ہو، بہت، بہت“

☆.....☆.....☆

اور پھر وہ دن آئی گیا۔ جس کا پچھلے اڑھائی مہینوں
سے انتظار تھا۔ رزلٹ کا دن۔

ساری رات یونہی سوتے جاگتے گزری تھی۔ یہ کوئی
رات کے دو بجے کا وقت تھا جب اسفر کی آنکھ کھلی تو دوبارہ
نہ لگی۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔ مگر نیند نہ آتا تھا،
نہ آئی۔

تھک آ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ساتھ والی چار پائی پر زور
سوئے ہوئے تھے۔ جب کہ افقی سمت میں چمکی چار
پائیوں پر فاخرہ اور سدرہ تھیں۔ اسفر یک تک سدرہ کو
دیکھے گیا۔ یہ فکر نیند تھی۔ حالانکہ اس کا بھی رزلٹ تھا۔
سدرہ تھوڑا سا کسمائی اور نیند میں ہی کروٹ
بدلی۔ رشک و حسد کے طے جلے جذبات سے اسفر سدرہ

سفری پن تھا۔ لڑکیاں کلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سیفی مزید
رہانے لگا۔ منہ سے دوپٹہ نکال کر انگلی پر تل دینے لگا اور
کہا ہوا۔

”میں شادی کر رہا ہوں۔“

”اوہو۔۔۔۔۔“ کی آوازیں بیک وقت ابھری تھیں۔

”مبارک ہو۔ بہت، بہت“

”کون ہے وہ کیا کرتا ہے۔“

”کہاں ہے؟“

”مرد ہے یا عورت؟“ مہارکباد دیتے ہوئے
لڑکیاں طرح طرح کے سوال پوچھنے لگیں۔

”مرد، عورت کی تقسیم ہمارے حصے میں کہاں۔“

میری برادری کا ہے اور کرنا کیا ہے۔ میری طرح دلال
ہی سمجھو۔ پر ہے بہت خوبصورت اور مجھ سے محبت بھی
خوب کرتا ہے۔ سیفی کی باتوں میں اچانک اتر اٹھ
آگئی۔ کمرے میں لمبے بھر کو خاموشی چھائی۔ لیکن لڑکیاں

آئی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں“ سوئی نے بات ٹالی
سیاہ آنکھوں، بھورے تھکے بالوں والی سوئی اس
گھر کی سب سے سادہ لڑکی تھی۔ رات کو سنگھار کیے بغیر
ہی سب کے ساتھ جاتی۔ پیادہ، دوپٹیوں والی سواری والا
یا شاندار گاڑی والا جو شخص سوئی کی طرف سب سے پہلے
متوجہ ہوتا سوئی اس کے ساتھ چلی جاتی۔

”سوئی تم ہی بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ اب
چنبیلی کا سرخ گاڑی والا صاحب، کتنی تعریفیں کرتی تھی
چنبیلی، آج اپنی اصلیت دکھا گیا۔ وہ شریف آدمی یہ کر سکتا
ہے تو خود سوچو اگر کوئی خبیث مل گیا تو وہ تو ہماری
بوتیاں۔۔۔۔۔“

”چندہ“ چنبیلی نے اکتا کر چندہ کو ٹوکا۔

”یہ جو تو خود چیل کوؤں کو اپنی بوتیاں کھلانے پر بھند
ہے۔ یہ سوچ سوچ کر تو ایک دن پاگل ہی ہو جائے گی۔
چاہے تو میری بات لکھ کر رکھ لے۔“ چنبیلی نے کچھ ایسے
انداز میں کہا کہ ناچا جتے ہوئے بھی باقیوں کے چہرے پر
مسکراہٹ آگئی۔

اسی وقت سیفی ہاتھ میں یک لیے کمرے میں داخل ہوا۔

”لڑکیو، لڑکیو، میں آج تم سب کے لیے یک
لایا ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“ سیفی نے یک
ایک طرف رکھا۔ دور پڑی میز لاکر درمیان میں رکھی اور
پھر یک اس میز پر رکھ دیا۔

”ایسی بھی کیا خاص بات تھی کہ سیفی آج ہمارے
لے یک لے آیا۔“ رانی خوش دلی سے بولی۔

خوش رنگ چاکلیٹ یک سبھی کی نظروں کا محور ہے۔
”پہلے تم سب منہ بیٹھا کر لو۔ پھر بتاتا ہوں۔“ سیفی
نے اٹھلا کر ایک اداسے کہا تھا۔ ”رانی تم سب سے بڑی
ہو۔ تم ہی اس یک کے کٹوے کرو۔“ سیفی نے چھری
رانی کی طرف بڑھائی تھی۔ رانی نے چھری پکڑ لی اور
آگے بڑھ کر یک کے کٹوے کرنے لگی۔

”اب بتا بھی دے سیفی کہ ایسی کون سی خوشخبری
ہے۔“ چنبیلی نے یک کا کٹوہ منہ میں ڈالا تھا۔

خوش و خرم کھڑی سیفی اپنے پیلوے دوپٹے کا پلو پکڑ کر منہ
میں دبا کر شرماتے لگا۔ سیفی کی اس اداس میں غضب کا

ڈھنڈورا پیٹے۔“ مغلظات کا طوفان تھا جو بدریک رہا تھا
اور چنبیلی کے کانوں میں زہری کا مانند منتقل ہو رہا تھا۔ ”اگر
سارہ کو شک بھی ہو جاتا تو۔۔۔۔۔“ بدر نے چنبیلی کو گردن
سے دبوچا تھا اور شہادت کی انگلی سے تنبیہ کر رہا تھا۔
”معمولی سی فاحشہ! نہ آگے نہ پیچھے۔ آج زندہ
گاڑیوں تو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ کہاں مرکھپ گئی۔
گندے نالے کے پاس اگی کھمبیوں سے زیادہ تیری
اوقات نہیں۔“

یہ افتاد اس قدر غیر موقع اور اچانک تھی کہ چنبیلی
سنبل ہی نہ پائی۔ بدر نے گردن چھوڑی۔ چنبیلی کھانسی،
گردن سہلائی جب تک سنبل بدر بٹکا جھکتا گاڑی میں
بیٹھا اور گاڑی یہ جاوہ جا۔

”سالا، کمینہ، کتا۔۔۔۔۔“ چنبیلی نے ایسی
واہیات مردانہ گالیاں دیں کہ بس اینٹا۔ سرخ گاڑی دور
مشرق کی سمت جا رہی تھی۔ چنبیلی نے فٹ ہاتھ پر بڑا پتھر
اٹھایا اور گاڑی کی سمت پھینکا۔ پتھر گاڑی کی گرد کو چھی نہ
چھو سکا۔

گردن سہلاتی، سرخ چہرہ لیے چنبیلی کتنی جھکتی فٹ
پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”میرا ڈر بلا وجہ نہیں۔ میں پہلے نہ کہتی تھی کہ کوئی
چاہے ہمیں مار کر پھینک جائے کون ہے ہمارا پوچھنے
والا۔“ چندہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”چندہ اگر پاس کوئی شے پڑی ہوئی تو میں ضرور
تجھے دے مارتی۔“ چنبیلی کا لہجہ معمول سے تیز تھا۔

”ہونہ۔“ چنبیلی تو بھی میری بات کو اہمیت نہیں دے
گی۔ ”چندہ نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ ”چلو چھوڑو اب ان باتوں
کو کیا فائدہ۔“ رانی نے اس موضوع کو رفع دفع کرنا چاہا۔

خلاف معمول آج بھی لڑکیاں اکٹھی بیٹھیں تھیں۔ وہ
لڑکیاں جو ایک دوسرے کی کچھ نہ کہتی تھیں پر برس ہا برس
سے اکٹھے رہ رہی تھیں۔

”سوئی تو کیوں اداس لگ رہی ہے۔“ رانی نے
موضوع بدلنے کے لیے سب کی توجہ سوئی کی طرف
مبذول کی۔

اداس چہرہ سوئی چہرے پر ایک سوگوار مسکراہٹ لے



ہی ڈسکشنز کا ہی نتیجہ تھا کہ اسفر کو احساس ہونے لگا وہ دماغی طور پر اتنا کم بھی نہیں اور اسی گردب ڈسکشنز کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ ان دونوں بہن بھائی میں موجود کثافت اور بیگانگی کی دیوار میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ آج ان لوگوں نے بائبلوجی کا چیمپن ٹری ڈسکس کرنا تھا۔ ہفتے کا دن تھا اور کالج آف ہوئے لگ بھگ اداھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ تو کر لیا تھا لیکن لائبریری میں بولنے کی اجازت نہ تھی اسی لیے ڈسکشنز کے لیے آج انھوں نے آڈیٹوریم کی بیڑھیوں کو چنا تھا۔

آڈیٹوریم کی اوپر کی طرف سے چوتھی سیڑھی پر جواد اور اسفر بیٹھے تھے اور ایک سیڑھی نیچے سدرہ اور دعا بیٹھی تھی۔ پونی ٹیل عادتاً جھلاتے ہوئے سدرہ نے کہا۔ ”اس جیسا آسان اور مختصر چیمپن کوئی ہے ہی نہیں۔ بھلا انزائمر بھی ڈسکس کرنے والا ناپک ہے۔“ اسفر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ جس چیمپن کو اس کی بہن آسان ترین کہہ رہی تھی اس پر پچھلے دو دنوں سے کئی کئی گھنٹے مغز ماری کرنے کے بعد بھی مکمل دھڑکن نہ حاصل کر سکا تھا۔

”میری بھی یہی رائے ہے۔ کوازانز، کوئیٹر، اپوزائمرز، ان ساری چیزوں کا تو ہمیں میٹرک سے پتا ہے۔ میں نے خود یہ چیمپن میں منٹ میں پڑھ کر کتاب ایک طرف رکھ دی تھی۔“ جواد نے ایک طرح سے سدرہ کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور اسفر بس آنکھیں پینچا کر جواد کو دیکھ کر رہ گیا۔

”تو پھر کیوں نا آج ہم پڑھائی سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ یوں بھی تو ویک اینڈ ہے۔“ جواد نے کہا تو سدرہ نے تائید میں سر ہلایا اور دعا جو اس مکالمے کے درمیان چپ بیٹھی اسفر کے تاثرات دیکھ رہی تھی، گویا ہوئی۔

”نا بھائی نا، مجھے تو بالکل سمجھ نہیں آیا اور میں نے تو اسے ڈسکس کرنا ہے، کئی سوال ہیں میرے ذہن میں۔“ ”پیر والے دن ڈسکس کریں گے دعا۔“ سدرہ نے پونی ٹیل کا ربن کسا تھا۔ آج اس کا پڑھنے کا دل نہیں کور ہاتھا۔

”بھئی اگر تمہارا اور جواد کا پڑھنے کے بجائے گپیں ہانکنے کا موڈ کا ہے تو تم لوگ بائیں کروڑ میں اور اسفر تو

پڑھیں گے۔ کیوں اسفر؟“ اسفر بھی پڑھنا چاہتا تھا اور لیے اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ”تم دونوں باتیں کرو ہم آخری والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ آؤ اسفر“ دعا اٹھی تو اسفر نے کہا کہ کتابیں میٹھے ہوئے دعا کی پیروی کی تھی۔

”سب سے پہلے تمہارا اسفر اس چیمپن میں کون سی چیز تمہیں ”آئی“ آخری سیڑھی پر بیٹھے ہوئے دعا نے پوچھا تھا۔ اسفر نے بتایا تو دعا اسے سمجھانے لگی اور وہ کافی دیر پڑھتے رہے۔ اس دوران دعا نے شعوری کوشش کی کہ اسفر کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے اس چیمپن پر عبور ہے۔ ویسے سدرہ اور جواد کی طرح یہ چیمپن اسے بھی بے حد آسان لگا تھا اور اسے پوری طرح سمجھ بھی آ گیا تھا اور وہ ڈسکشن کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ لیکن محض اسفر کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

اور پونی ٹیل بیڑھیوں پر بیٹھے جواد نے سدرہ کی بائوکی کتاب پکڑ لی اور پینٹ کی جیب سے گلاب کی ایک ٹلی نکال کر درمیان والے صفے پر رکھ دی تھی۔ نفاس سے ٹرانسپیرنٹ کاغذ میں لپٹی کس قدر خوبصورت تھی۔

”یہ سرخ گلاب کس لیے“ ”تمہارے لیے“ ”مگر کیوں؟“ ”کیوں کا ہونا ضروری ہے؟“ ”تم سوال کے جواب میں سوال کیوں کرتے ہو؟“ ”تم خود اسے سوال کیوں کرتی ہو؟“ ”میری مرضی“

”میری بھی مرضی“ جواد اور سدرہ میں یونہی مہمل سے فکروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ مہمل فقرے جن میں بہت سارے پوشیدہ معانی تھے۔

☆.....☆.....☆ جو کچھ اسفر نے سنا ایک لمحے کو تو اس کو اپنے گرد و نواح کی تمام چیزیں گھومتی محسوس ہوئیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کینٹین کا بوائز سیکشن تھا۔ اس حصے میں دیوار کو سہارا دینے والے بڑے بڑے گول ستون تھے۔ ان ستونوں نے ہی بوائز سیکشن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور اس ستون کے دونوں اطراف

میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسفر جواد کو ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ مل ہی نہ پا رہا تھا۔ یوں تو اسفر نے بھی کالج لائف شروع ہوتے ہی موبائل فون لے لیا تھا لیکن زیادہ گھر ہی بھول آتا۔ آج بھی گھر بھول آیا تھا اسی لیے میج کر کے بھی جواد سے نہ پوچھ سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

”کینٹین میں ہی ہوگا“ سوچتے ہوئے اسفر نے قدم کینٹین کی طرف بڑھائے تھے۔ کینٹین کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اسفر نے نظر دوڑائی۔ جواد ایک ستون کی آڑ میں ایک کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چونکہ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اسفر کو نہ دیکھ پایا۔ اسفر نے قدم اس میز کی طرف بڑھائے تھے۔ جواد اور دوسرا کلاس فیلو دونوں ایک ہی رخ بیٹھے تھے چنانچہ دونوں ہی اسفر کو نہ دیکھ پائے تھے۔

”یار داد دینی پڑے گی تمہاری حکمت عملی کی۔“ کلاس فیلو نے تھوڑی اور کچپ بوتل سے سامنے پڑی پلیٹ میں انڈلی تھی۔

”بس یار جواد جو بھی کام کرتا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔“ جواد نے فرارز کا ایک ٹکڑا دونوں سے کترا تھا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

”ابتدائی دنوں میں تو مجھے بھی سمجھ نہ آیا کہ تم اسفر کے ساتھ کیوں ہو۔ بھلا تمہارا اور اس کا کیا جوڑ۔ اپنا نام سن کر اسفر لمحے بھر کو رک گیا۔ کینٹین میں بلاشبہ شور تھا لیکن وہ پھر بھی ان لڑکوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔

”ہاں یار! اسفر تو میرے ساتھ جلتے ہوئے لڑکھڑاتا ہے۔ تم سے اس قدر لوسلیف کا نفیض میں نے نہیں دیکھی۔“ جواد ہنسنے لے کر فرارز کھار ہا تھا۔

”بس خالد۔ نہ وہ لڑکا پڑھائی میں اچھا ہے اور جیب بھی خالی ہے۔ ہم لوگ جب کبھی آؤ ٹنگ پر گئے ہیں نے ہی خرچ کیا۔“

اسفر کو اپنا نقش بھی گراں گزرنے لگا۔ ”اس طرح تو یہ طریقہ مہنگا پڑا۔ تم سدرہ سے ڈائریکٹ بات کر لیتے تو بھی تو ٹھیک تھا۔“ خالد اب کو لڑکھڑکی کی سب لے رہا تھا۔ ”کیا ہنسا کیا سستا۔ تم دیکھو کامیاب تو ہو گیا نا۔ اسفر

سے میں نے چنگیں بڑھائی اس لیے تمہیں کہ سدرہ تک پہنچ پاؤں۔ اب دیکھو سدرہ میری دوست ہے اور جلد ہی فنانسی بن جائے گی۔ اس حوالے سے اسفر بھی میرا سالا ہونا اور کر میں نے اسے سالے پر میرے خرچ کر لیے تو کیا ہو گیا۔ میرے ڈیل کا لون سائیک بیٹلس ختم ہو گیا۔“ جواد بقیہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ میز، کرسیاں، کینٹین کی عمارت کی چھت، زمین، سب چیزوں نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔

”اوبائی گاڈ۔۔۔ بات یہاں تک پہنچ گئی۔ سدرہ نے گرین سگنل دے دیا۔“ خالد نے چونک کر کہا تھا۔

”امم۔۔۔۔۔“ جواد سوچنے لگا۔ ”بس سمجھ لو دے ہی دیا۔ ڈائریکٹ بات تو نہیں ہوئی لیکن پھر بھی بات ہوئی۔“

”اوہ ہو گئی بوائے۔۔۔۔۔؟“ خالد نے جواد کی پشت تھپتھپائی تھی۔

”ویسے یار راج میں سدرہ اور اسفر تو سبز ہیں۔ کہاں سدرہ آسان کا تارا اور کہاں اسفر زمین کا آوارہ۔۔۔۔۔“ اس سے قبل کہ اسفر اس بے یقینی کے لمحوں میں لڑکھڑا کر گرتا کینٹین کے چھوٹے نے اسفر کو مخاطب کیا۔

صاحب کھڑے کیوں ہو بیٹو، چھوٹا سامنے والی میز کو کندھے پر رکھنے پڑے سے صاف کرنے لگا۔ جواد نے مڑ کر دیکھا۔ لمحے بھر کو بوکھلا لیکن جلد ہی اپنی ٹون میں آ گیا۔

”آؤ اسفر کہاں تھے تم؟ موبائل بھینا آج بھی گھر بھول آئے ہو گے میں نے ٹیکٹ کیا تھا تم نے ریلوئی نہ کیا تو سمجھ گیا کہ آج پھر۔۔۔ کھڑے کیوں ہو آؤ نہیں جوان کرو۔“

ساتھ بیٹھے خالد کو بھی اندازہ نہ ہو پا رہا تھا کہ گویا اسفر نے باتیں سنیں کہ نہیں۔ چند قدم کا فاصلہ اسفر نے طے نہیں کیا۔ بس بے یقین نگاہوں سے جواد کو دیکھتا رہا۔

”اسفر آؤ نا“ جواد اپنی تشویش چھپانے لگا۔ اسفر بس خالی نظروں سے جواد کو دیکھتا رہا۔

”آج دوستی سے ہی اعتبار اٹھ گیا۔“ یہ کہہ کر اسفر کا نہیں۔ ساتھ پڑی کرسی دھکیلتا کینٹین کے خارجی دروازے سے باہر چلا گیا۔

”اسفر“ جواد نے پکارا تو سہی لیکن پیچھے نہ گیا اور

جب اسفر کینین سے باہر چلا گیا تو ایک بار پھر فرارز کھانے لگا۔

”یہ تو برا ہوا جواد“ خالد کو حیرانگی ہوئی اتنی بڑی بات ہوئی اور جواد پھر سے فرارز کھانے بیٹھ گیا ہے۔

”اچھا ہی ہوا۔ اس ڈرامے کا تو دی اینڈ ہوا جو مجھے بے انتہا پور کرتا تھا۔“

”اور جب یہ سب سدرہ کو پتا چلا تو۔۔۔۔۔“

”کچھ بھی نہ ہوگا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے۔“ جواد اطمینان سے کچپ انڈیلنے لگا۔ دیے اس کا یقین کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

بیتے کی شام تھی۔ ویک اینڈ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی لیے ہر چیز پر فرصت کا رنگ نمایاں تھا۔ جا بجا روغن اتاری دیواروں والے ہال کمرے میں اسفر بیٹھا تھا۔ چہرے پر تناؤ لیے۔

عام سے حلیے میں بے ترتیب بالوں کے ساتھ فاخرہ کچھ سوچتے ہوئے کریم کی تہہ سے بھی کوئی گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

سدرہ نے کن اکھیوں سے ماں کے تاثرات جانچے تھے۔ اس کے دل کی رفتار معمول سے تیز تھی۔ فاخرہ نے اسفر کی بات پوری توجہ سے سنی، پہلوؤں پر غور بھی کیا اور پھر گویا ہوئیں۔

”تمہارا غصہ بے جا نہیں اسفر۔ یوں استعمال ہونا برا ہی لگتا ہے لیکن۔۔۔۔۔“ فاخرہ خاموش ہوئیں۔ اور گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتاری تھی۔ اسفر نے پہلو بدلا تھا۔ یہ ”لیکن“ آگے کی باتوں کی صحیح طرح وضاحت نہ کر رہا تھا۔

”سدرہ، اسفر نے بتایا کچھلے دو مہینوں سے تم دونوں اس لڑکے کے ساتھ گرپ اسٹڈی بھی کرتے تھے۔ کیا ہے وہ لڑکا؟“ فاخرہ نے سدرہ کو مخاطب کیا تھا۔ سدرہ نے تھوک نگلتے ہوئے دھڑکتے دل کو سنبھالا تھا۔

”اچھا ہے“ بلاشبہ سدرہ چاہے جتنی بھی اعتماد دہی لیکن تھی تو لڑکی ہی۔

فاخرہ نے ایک بار پھر گھونٹ گھونٹ کوئی حلق سے اتاری تھی۔ اسفر نے ایک بار پھر پہلو بدلا تھا۔ عموماً فاخرہ یوں ٹھہر ٹھہر

کر گفتگو نہیں کرتی تھی۔ لیکن آج کی بات کچھ خاص تھی۔ ”اسفر اس کا طریقہ بے حد غلط ہے لیکن اگر وہ سدرہ کے لیے سنجیدہ ہے تو یہ زیادہ بری بات نہیں۔“ ماں کی بات اسے چابک کی طرح ہی لگی۔

”امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس کہنے نے مجھ سے اس لیے دوستی بڑھا لی اور اس نیت سے کھلاتا پلاتا رہا کہ میں سدرہ کا بھائی ہوں۔ مجھے الو بنانا رہا اور اپنا الو سیدھا کرتا رہا۔ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔“ اسفر کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

جواباً فاخرہ نے بس اتنا کہا۔

”کسی کے لیے برے القاب نہیں استعمال کرتے۔“

سدرہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے دل کی رفتار مزید تیز ہو رہی تھی۔

فاخرہ نے کپ ایک بار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ کوئی ختم ہوئی تھی۔ گنگ اس نے ساتھ پڑی میز پر رکھا اور سوچتے ہوئے بولی تھیں۔

”اسفر یوں کرو اس لڑکے سے کہو کہ اگر وہ سنجیدہ ہے تو اپنے ماں باپ کو بھیجے۔“

اسفر کے چہرے کا تناؤ پورے جسم پر پھیل گیا۔ ”امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اسفر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل رہی تھیں۔

”جو کہہ رہی ہوں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم کل کے بیچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ویسے سدرہ اس لڑکے کو تم نے ڈرانگ روم میں بٹھا کر چائے پلائی تھی۔ وضع قطع تو مجھے تھوڑی تھوڑی یاد ہے سب کچھ ہوا تھا۔“ فاخرہ اب بالوں کی چٹیا کھول کر بال بنانے لگی تھیں۔

غصے میں دکھ کھلتے لگا۔ یہ غم وغصہ مل کر اسفر کو پامال کرنے لگے۔

”امی اس لڑکے نے مجھے Exploit کیا۔ میرے دل چاہ رہا ہے اسے مار ڈالوں اور آپ کہہ رہی ہیں اسے کہوں سدرہ کے رشتے کے لیے ماں باپ کو بھیجے۔ کس قدر اذیت ناک ہے یہ، آپ کو میری عزت کی تو پروا نہیں۔“ یہ کہتا اسفر اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا چلا گیا۔ کسی نے اسے نہ پکارا۔

سدرہ یونہی سر جھکا کر بیٹھی تھی۔ اس کا دل تو جیسے کالوں میں دھڑک رہا تھا۔

فاخرہ نے معمول کے لیے بیٹھ گیا۔ ”تم پریشان نہ ہو۔ اس طرح کے معاملات میں لڑکے ایسے ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔“ فاخرہ بالوں کو ترتیب دیتی رہیں۔ بال بنانا شاید زیادہ اہم تھے۔

☆.....☆.....☆

ہال کمرے سے نکل کر اسفر نے کچن کا رخ کیا تھا۔ ایک گلاس غٹا غٹا پانی پینے کے بعد بھی اس کے اپنے اوپر چھائے تناؤ میں کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کچن کے شیفٹ پر دونوں ہاتھ جمائے کتنی دیر وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر بھی دماغ ویسے ہی جھٹی کی طرح جلتا رہا۔

کچن سے نکلا اور گھر کے خارجی راستے کو ناپا۔ سڑکوں پر بے تحاشہ اثر ٹپک بھی۔ لوگوں کا سیلا تھا۔ جو ہر طرف رواں دواں تھا۔ اسفر کو اپنا اندر باہر جلتا محسوس ہوا۔ کتنی دیر وہ یونہی سڑکوں پر بے مقصد چلتا رہا۔

ذہن میں جواد کے ساتھ گزارا ہوا وقت اور اس کی طرف سے کی گئی مہربانیاں آنے لگیں۔

”دوستی ایک خالص جذبہ ہے، تم مجھے اچھے لگتے ہو، دوستی کے لیے یہ ایک بات ہی اہم ہے اور دوستی کی ٹھوس وجہ بھی۔ معاشرتی فرق کی بنا پر دوستی نہ کرنا بے دقتی ہے۔ ہاں البتہ میں تمہیں ناپسند ہوں یا پھر میری کوئی بات تمہیں ناپسند ہو جس کی بنا پر تم دوستی نہ کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔“ یہ کہنے والا جواد ہی تھا۔ جب وہ اسفر کو گیمز سٹوڈیو لے گیا تھا۔

اسفر کو اپنا آپ حد سے زیادہ بے وقوف لگ رہا تھا۔ کیسے جواد نے کھیل کھیلا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جواد اکثر و بیشتر سدرہ کا ذکر چیخ رہا تھا۔ حالانکہ اگر اسفر احتراز کرتا تب بھی۔ اور گرپ کی تشکیل بھی شاید جواد نے اسی لیے کی تھی کہ سدرہ تک رسائی ہو۔ وہ خود تو بس شاید ایک شطرنج کا مہرہ ہی تھا۔

اسفر چلتا رہا، رکتا رہا، رک رک کر چلتا رہا۔ یونہی بے لگام سوچوں کے ساتھ سڑکیں ناپتا رہا۔ ذیلی سڑک پر دائیں طرف ایک موٹر سائیکل شاپ تھی۔

بسم اللہ موٹر سائیکل شاپ۔۔۔۔۔ پرو پرائیٹرز محمد زوار۔ ”میں ہاں پر تمام کمپنیوں کے ایزی لوڈ کی سہولت

میسر ہے۔“ دکان کی سامنے والی دیوار پر چارٹ پر خوشخط لکھا ہوا تھا۔ دکان کی دیوار کے ساتھ لگے اسٹینڈز پر سستے موٹر سائیکل کیٹنگ، ہینڈ فری، بیٹریاں اور دوسری موٹر سائیکل اسریز لگی تھیں۔ ان موٹر سائیکل اسریز کو تو شاذ و نادر ہی کوئی خریدتا ہے۔ موٹر سائیکل شاپ تو ایک طرح سے بس ایزی لوڈ شاپ تھی۔ اہل محلہ اور راہ گیروں کو ایزی لوڈ کی سہولت مہیا کرتی۔

زوار ناک پر چشمہ دکھائے حدیثوں کی تشریح پر مشتمل کتاب پڑھ رہے تھے۔ جب کاؤنٹر پر کھکا ہوا اور انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے اسفر کو کھڑے پایا۔

”آؤ اسفر“ اسفر دکان پر شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ زوار کی بھی شعوری کوشش ہوتی کہ بیٹا دکان پر نہ آئے۔ وہ بیٹے کو مستقبل میں اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ موٹر سائیکل شاپ ان کے بیٹے کے شایان شان نہ تھی۔

”آؤ اسفر کیسے آنا ہوا؟“ زوار نے کتاب کا صفحہ موڑا تھا۔ تشریح شدہ حدیثوں کی کتاب ان کی ذاتی تھی۔ قرآن مجید کے بعد ان کے مطالعے میں سب سے زیادہ رہنے والی دوسری کتاب یہی تھی۔

”بچے تو باغ کے پھول ہیں۔“ یہ حدیث انھیں کس قدر اچھی لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی حدیث کی تشریح پڑھ رہے تھے۔

”آؤ اسفر اندر آؤ۔“ کتاب بند کرتے ہوئے انھوں نے جب دیکھا کہ اسفر کاؤنٹر کے پار ہی رک گیا ہے تو انھوں نے کہا تھا۔

اسفر نظر انداز کیے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا رہا۔ نظر باپ کے سامنے پڑی کتاب کے سرورق پر پڑی تو ناچا ہے ہوئے بھی من میں کڑواہٹ کھلنے لگی۔

”اسفر خیریت تو ہے نا۔“ انھیں غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

”خیریت“ اسفر کے لبوں پر استہزاء ایسے مسکراہٹ آن ٹھہری۔ ”آپ کو کبھی ضرورت پڑی اپنے بچوں کی خیریت جاننے کی۔ آج کس لیے پوچھ رہے ہیں۔“ کڑوے الفاظ منہ سے نکلنے لگے تھے۔ زوار لمبے بھر کو تو سکتے میں آ گئے۔

(جاری ہے)

سنگار دیواروں کے پیچھے ہے جرم کی کوکھ میں بل کر جرم بنے والوں کی عبرت سامان
دل سوز غریب بن بن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سستی ہوئی زندگی کے نوتے بھی

منی باجی



جاوید راہی

اُس عورت کا قصہ 'عبرت' جس نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے
شیطانِ طاقتوں کو قابو کر لیا تھا 'جاوید راہی' کے قلم سے ایک اور پراسرار راج کا پردہ فاش

بڑے سے کڑا ہے کے قریب ہی آرام کرنے کیلئے زمین
پر پڑی چٹائی پر جا بیٹھے، یہ ہم سب کا معمول تھا۔ جب
خٹک ہڈیوں کو ٹرک پر لوڈ کرنے کا وقت ہوتا تو ہم تمام
مازین یہ کام سر انجام دیتے۔

اسی طرح ایک دن ہم ٹرک لوڈ کر رہے تھے کہ
بڈیاں اٹھانے کی غرض سے میں ایک کونے کی طرف
گھٹیا تو میں نے وہاں دیوار کے آخری حصہ میں کچھ
اینٹوں کو زمین پر ترتیب سے بڑے دیکھا اور ایک
طرف سفید موم بیٹوں کے تین ٹیکٹ، اگر بتی کا بڑا
ٹیکٹ، سیاہ ثابت ماش اور چھوٹے چھوٹے سیاہ
ٹیکٹوں کی ٹکھی بھر ڈھیری اور پوری کو چار حصوں میں
اکٹھا کر کے بیٹھنے کیلئے اس بھڑے پر رکھا ہوا تھا اور ایک
مٹی کا دیا جس میں شاندیل یا کچھ اور تھا آدھ جلی روٹی
کی بتی جو شاندیل روٹی کیلئے جلایا گیا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ
یہاں کوئی بیٹھ کر جادو نوٹہ کرتا ہے۔ پہلے تو میں اس کا

کام کرتا تھا۔ میرے ساتھ چار اور لوگ بھی کام کرتے
تھے۔ افضل اور میں گودام میں جبکہ دوسرے تینوں مرے
ڈنگروں کی کھالیں اُتارنے اور ان کے گوشت اور چربی کو
پکھلا کر لوہے کے خالی ڈرمنوں میں اکٹھا کرنے کے بعد
وہ پنجر اٹھا کر ہڈیوں کے ڈھیر پر پھینک دیتے۔ ٹکے اور
گدھ نوج نوج کر پنجروں پر سے بچا کھیا ماس اُتارنے
میں لگ جاتے۔ گودام اور ہڈی احاطہ کی بدبو ہمارے
لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی ہم اس کے عادی ہو چکے
تھے۔ آڑھت مالکان بھی ہمارے جیسے ہی تھے وہ بھی
ہمارے درمیان بیٹھتے اٹھتے اور کھاتے پیتے۔

افضل دوپہر کو اپنے گھر کھانا کھانے چلا جاتا جبکہ
میں گھر سے لایا کھانا آدھ گودام میں ہی بیٹھ کر کھالیتا۔
مالکان کی رہائش بھی گودام کے آخری حصہ میں تھی وہ بھی
دوپہر کو گھر چلے جاتے۔ مُردار جانوروں کی کھالیں
اُتارنے والے تینوں نو مسلم روغن چربی نکالنے والے

افضل اور کلثوم ملنے آئے اور اسے اپنے ساتھ لے
کر جانے کی کوشش کی مگر صدو نے انکار کر دیا کہ بہن کے
گھر بھائی رہتا اچھا نہیں لگتا لوگ باتیں کریں گے۔

صدو کے بارے میں جناب ایم اے راحت
صاحب نے بتایا۔ جب میں اُن سے ملنے مہران بلاک
اقبال ٹاؤن گیا تو وہ آدھ سامان اعوان ٹاؤن والے گھر
میں شفٹ کر چکے تھے۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ کوئی
صدو بابا ہے قصور میں جس کے ساتھ کچھ پراسرار واقعات
رو نما ہوئے ہیں اور اس سے ایک قتل بھی ہو گیا۔ عمر قید کی
سزا بھگت کر واپس آیا ہے۔ تم اس کو مل آؤ ہو سکتا ہے کہ
اس کی روداد تمہارے کام آ سکے، میں تو مصروف ہوں
ورنہ میں خود جاتا۔ مجھے بھی ایک دوست سے کچھ حالات
معلوم ہوئے تھے جو خاصے دلچسپ لگے۔ انہوں نے ہی
مجھے بابے صدو کا اُتارنا دیا تھا۔

پہلے تو بابا صدو کی لائن پر نہ آیا جب میں نے اسے
اپنا تعارف کروایا تو کچھ سوچ کر ٹائلیں سمیٹا اٹھا اور دیوار
کا سہارا لیتے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

بابے صدو نے کھالس کر اپنا گلا صاف کیا اور مجھے
مخاطب کر کے بولا۔

”پاؤنجی! میں تیرہ سال پہلے چڑا منڈی میں ایک
آڑھت پر کھالوں اور چمڑے کی صفائی اور نمک لگانی کا

بابا صدو دیوار کے ساتھ بنائے گئے کچے چبوترے
پر میلے پیلے بستر پر پڑا زندگی کے آخری پہر کی ڈھلکی
دوپہر کے ساتھ ساتھ پاؤں گھنٹے آگے بڑھ رہا تھا۔

عمر قید کی سزا کاٹ کر گھر واپس آیا تو سب کچھ
بدل چکا تھا۔ ماں باب اللہ کو پیار ہو گئے تھے، بیوی
اس کے جیل جانے کے بعد دونوں بچے لیکر ایک رات
چپکے سے گھر چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی، منی باجی
تو قتل کرنے پر مقدمہ کی بیروی کے سلسلہ میں جو پائی
پیسہ خرچ ہوا وہ افضل نامی آدمی جو اس کے ساتھ ہی
کام کرتا تھا لگانے کی منہ میں اس کی بہن کلثوم سے
نکاح کروا کر لے گیا۔ بوڑھے والدین کچھ سال ہی
زندہ رہے باپ تھے۔ گھر سے فرار ہونے والی بیوی کے
بھائی نے گھر پر قبضہ کر لیا۔ جب واپس آ کر صدو نے
واو پلا کیا تو حملہ کے چند لوگوں نے اکٹھے ہو کر اس کے
سالے سے مکان کا تھوڑا سا حصہ اسے دلوا دیا جو اس کی
بیوی نے اپنے بھائی کو ادا کرنے پونے فروخت کر کے
اسٹامپ پیپر پر اس کے نام لکھ دیا تھا۔

بچی پٹی اینٹوں سے چھوٹا سا کمرہ تو بنالیا تھا صدو
نے مگر زیادہ وقت اسی چبوترے پر ہی گزار دیتا جہاں
بچوں کے کھانے پینے کا کچھ سامان بازار سے لے آتا
اور اسی سے وال روٹی کما کر گزارا وقت کرتا۔ دو چار بار



تذکرہ ان سب سے کرنے لگا پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ مجھے کیا پڑی ہے۔ جو بھی کوئی کر رہا ہے کرے اور بند یوں کی نوکری سر پر رکھتے ترک کی طرف ہو گیا۔
 ترک لوڈ کر دیا کہ ہم وہاں سے دوبارہ گودام میں آ گئے۔ وہ بیٹوں مری ہوئی بیٹیس کی کھال اُتارنے کیلئے اپنی اپنی چھریاں اٹھائے اس طرف ہو گئے۔
 گدھ جو دیوار پر بیٹھے لپٹائی نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے پچا و پکار کرنے لگے آوارہ کتے بھاگ کر ادھر ادھر ہو گئے۔

گودام میں آکر میں نے افضل سے اس سارے معاملات کا تذکرہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور اپنا خیال ظاہر کرتے کہا کہ ”اس مردار کھاتہ میں آکر تو کوئی کالے جادو والا ہی کچھ کرتا ہوگا۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ ایسی جگہوں پر باہر کی چیزیں قابض ہوتی ہیں۔ چلو دفع کرو جو بھی کوئی ہے ہمیں اس سے کیا؟“

بات آئی کئی ہوئی۔ میں اپنے کاموں میں الجھ گیا۔ بڑے حاجی صاحب نے کڑا ہے کے پیچے جلانے والی لکڑیوں کی ریڑھی اُتارنے کیلئے مجھے مردار کھاتہ جانے کا کہا۔ میں چھری رکھتے اُٹھ چل پڑا۔ ابھی میں کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے مٹی باجی کو مردار کھاتہ کے اس حصہ میں سے نکل کر دوسری طرف جاتے دیکھا۔ جب تک میں وہاں پہنچا مٹی باجی رہا ہی حصہ کی طرف مڑ گئی تھی۔

مٹی باجی بڑے حاجی صاحب کی رشتہ میں سالی تھی اور دیوار طلاق ہونے پر پکی پکی حاجی صاحب کے پاس آ گئی تھی۔ ریڑھی سے لکڑیاں اُتارتے میں اس بات پر سوچ رہا تھا کہ مٹی باجی کا اس بیٹی دوپہر میں مردار کھاتہ میں کیا کام؟ کہیں وہ جادو نوٹہ مٹی باجی ہی تو نہیں کرتی؟ پھر یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کام کی غرض سے ادھر آئی ہو۔ اسی وجہ سے میں ریڑھی خالی ہوئی۔ ایک بار تو دل میں خیال آیا کہ جا کر اس جگہ کو ایک بار پھر دیکھ لوں شاید وہ سب کچھ وہاں نہ ہو جو کچھ روز پہلے میں نے اُٹھ کر کوئے میں دیکھا تھا مگر میں واپس گودام کی جانب چل پڑا۔

رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا اس لئے صبح والی بات ذہن سے نکل گئی مگر جب گھر آکر تمام کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر گر کر التوج والا واقعہ ایک بار پھر

ذہن میں جاگ اُٹھا کہ مٹی باجی ادھر مردار کھاتہ میں کیا لینے گئی تھی؟ اگر وہی کوئی علم سیکھ رہی ہے تو وہ کیا ہوگا؟ کوئی جواب نہ ملا تو میرا جیس اور بڑھ گیا اور میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اس راز کو جان کر رہی رہوں گا۔

☆☆☆

صبح چڑا منڈی پہنچ کر میں سید حاضر دار کھاتہ کی طرف گیا۔ جمع شدہ مرے ڈنگروں کے سوکھے کیلے پنجرہوں کا ڈھیر کافی اونچا ہو چکا تھا جس پر کئی گدھ ماس بوٹیاں نوچنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف آوارہ کتوں کا جھنڈ بھی ہڈیاں گوشت نوچ کھوٹ رہے تھے۔ گدھ اور کتے ہمیں دیکھ کر بھاگنے لگے کہ اپنی جگہ سے کس سے ہوں یہ ہمارے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ان کو ہم سے شائد ڈر ہی نہیں لگتا تھا۔ میں اس ڈھیر کے اوپر سے گھوم کر جب اس جگہ پہنچا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا مرقا جس کو پر د سمیت کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اپنے خون میں تھڑا ہوا اینٹوں کے چپو تے پر پڑا تھا جس کے چاروں جانب سفید موم پتیاں دائرے میں جل جل کر موم میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ تین بڑے سے لیون جن کے آکر پارابی مرنے کے بڑے ہڈ دھننے ہوئے تھے وہ پاس ہی موجود تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رات جو کوئی بھی تھا اس نے چپو تے پر بیٹھ کر ضرور کوئی عمل کیا ہوگا۔

اب میرا معمول بن چکا تھا کہ جب میں صبح گودام پر کام کیلئے آتا تو پہلے اس طرف ضرور جاتا تھا۔

تین دن بعد اس مرغ کے گوشت کے اندر بے شمار کلبلا تے سفید رنگ کے کیڑے ریک رہے تھے۔ چاروں جانب اُٹھنے والی ناگوار بدبو جس کے ہم یہاں کام کرنے والے عادی ہو چکے تھے مگر یہ اس بدبو سے الگ بدبو سیادہ مرغ کے گلے بڑے گوشت کی۔ ضبط کے باوجود مجھے انکا آتے آتے روئی اور میں تیزی سے مردار کھاتہ سے نکل کر گودام کی طرف آ گیا سامنے افضل کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا کیونکہ گودام کے تالے کی چابی میرے پاس تھی۔

”گدھر سے آرہے ہو تم؟“ افضل نے مجھے مردار کھاتہ کی طرف سے آتے دیکھ کر سوال کیا۔ جس کو میں

نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی چھوٹی انگلی دکھا کر مطمئن کر دیا اور تالا کھول کر ہم دونوں اپنے کام میں لگ گئے۔ دوپہر کو کھانے کیلئے اُٹھا اور پانی لینے پینڈ پپ کی طرف آیا تو سامنے رہائشی حصہ کی طرف سے مٹی باجی کو آتے دیکھا جو شائد بازار جانے کیلئے گھر سے نکلی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ میرے قریب رکی اور مجھے مخاطب کرتے کہا۔

”صدو میرے پیچھے اسٹیشن آؤ میں وہاں پہنچ کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے پانی والا ایک گودام میں رکھا اور تالا لگا کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا مٹی باجی کے پیچھے چل پڑا۔ اسٹیشن تھوڑے ہی فاصلے پر تھا میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کے پچھواڑے سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم کے دوسری طرف گھوم گیا جہاں مسافر گاڑی کے انتظار میں ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ آخری پہنچ پر بیٹھی مٹی باجی پر میری نظر پڑی اور میں چلے ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”مٹی باجی“ میں نے انہیں مخاطب کیا۔

”صدو بیٹھ جاؤ“ مٹی باجی نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں ان کے سامنے ہٹ کر دوسرے کوئے میں بیٹھ گیا۔

”صدو! میں کئی دن سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں تم بار بار مردار کھاتہ کے اس کوئے کی طرف جاتے ہو“ مٹی باجی کی آنکھوں کی پر اسرار چمک کا سامنا نہ کرتے میں نے فوراً اپنی نظریں چمکتے کہا۔

”مٹی باجی دراصل بات یہ ہے کہ رات کو کوئی وہاں بیٹھ کر جادو نوٹہ کرتا ہے۔ میں اس کو پکڑنا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ آپ کے کاروبار کی بندش کیلئے کوئی عمل نہیں کر رہا۔“ میں نے بدستور چھٹی نگاہوں سے اپنے دل کی بات اس پر عیاں کی۔

”دیکھو صدو تم میرے بھائیوں جیسے ہو۔ یہ بات تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ کوئی اور نہیں میں ہوں جو رات کو سب سے چھپ کر ایک چلہ کاٹ رہی ہوں۔“

مجھے مٹی باجی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بُری طرح جھٹکا لگا۔ چند لمحوں خاموشی رہی پھر دہری۔

”صدو بھائی! میرے نصیب شروع دن سے ہی ایسے چلے آرہے ہیں۔ ہوش سے پہلے ہی ماں باپ گزر گئے، ایک بھائی اور ہم دو بیٹیں تھیں۔ بھائی بڑی بہن کی شادی کر کے سرال شفقت ہو گیا۔ حاجی صاحب مجھے

سالی کی بجائے بیٹی کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بھانجے سے شادی کر دادی وہ پرلے درجے کا کھٹو اور نشہ باز نکلا۔ میرے اصرار پر کہ کوئی کام دھندہ کروا لیا اس نے مجھے طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ بعد میرے مراسم شہر کے ایک دوکاندار سے بن گئے جس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے میری داستان سنی اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی جس کا تذکرہ میں نے بڑی آپاسے کیا تو انہوں نے حاجی صاحب سے مشورہ کر کے میرا نکاح شفقت سے پڑھوایا۔ کچھ ماہ تو سب ٹھیک چلا پھر گھر میں جھگڑا اور طعنہ زنی، الزام تراشیاں شروع ہو گئیں۔ ایک دن اس نے بھی طلاق کا اسٹامپ میرے ہاتھ میں دیتے گھر سے نکال دیا کہ تمہارے تعلقات حاجی صاحب سے ہیں۔ میں نے بہت صفائیاں پیش کیں کہ وہ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھتے ہیں مگر اس ظالم نے میری کوئی بات نہ سنی۔“

یہ سب بتاتے ہوئے وہ رو پڑی اور روتے روتے بتایا کہ ”مجھے یہ چلہ گھر میں کام کرنے والی نے اپنے شہر سے جو کالے علم کا ماہر سے لیکر دیا ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر میں کچھ بھی کر سکوں گی۔ میں نے کامیاب ہو کر دونوں سابقہ شوہروں سے انتقام لینا ہے چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی۔

”تو کب تک یہ سلسلہ مکمل ہوگا؟“ میں نے نظریں اوپر اٹھاتے مٹی باجی سے پوچھا۔

”ابھی تو بہت دن پڑے ہیں۔“ وہ بتا کر بولی۔
 بھائی میں نے تمہیں ایک کام کیلئے یہاں بلایا ہے“
 ”ہاں بولیں۔“

”ایک بوتل شراب اور کالے بکرے کا دل جو کانا نہکیا ہو، جس کے اندر خون موجود ہو مجھے چاہئے۔ یہ لو ہزار روپے۔“ مٹی باجی نے ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے کہا۔

”شراب تو مل جائے گی مگر بکرے کا ثابت دل پوچھ کر جواب دوں گا۔“ کہتے میں نے نوٹ پکڑ کر جب میں ڈال لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں“ میں نے اجازت مانگی۔

”ٹھیک ہے۔“ مٹی باجی بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جانے کیلئے میز بیوں کی طرف اور میں واپس گودام کی

جانب چل پڑا۔

ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے مٹی باجی کی آواز آئی، میں رُک گیا وہ قریب آ کر بولی۔
”یہ سامان مل جائے تو ادھر ہی رکھ دینا کوئی میں جہاں کچرا پڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہتے میں آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

شراب کی بوتل تو مجھے کچن کالونی سے مل گئی جبکہ بکرے کے دل کیلے کوئی قصاص ثابت دینے کی حافی نہیں بھر رہا تھا آخر کار ایک ملازم جو مٹن شاپ پر بکرے چھترے ذبح کر کے تیار کرتا تھا اس نے پانچ سو روپے کے عوض بندل دینے کا وعدہ کر لیا جس کو میں نے پانچ سو روپے ادا کر دیے۔ اس نے دوسرے دن لانے کا کہا کہ میں تمہارے گودام آ کر دے جاؤں گا۔ دونوں کام مکمل ہو گئے، اب میں نے دونوں چیزیں وہاں رکھنی تھیں۔

دوسرے دن حسب وعدہ وہ کالے بکرے کا دل مجھے کھانوں والے گودام میں آ کر دے گیا۔ افضل نے پوچھا کیا ہے؟ تو میں نے بہانہ بنادیا کہ بکرے کا گوشت منگوا یا تھا پاؤ بھڑ والدہ کو کھنی بنا کر دینی ہے۔ وہ سر ہلاتا ہوا دوبارہ کام میں لگ گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے چلا گیا تو میں نے شراب کی بوتل اور بکرے کا دل جو شاپر میں بندھا آٹھایا اور مردار کھات کی طرف چل پڑا۔ مٹی باجی کی بتائی جگہ پر دونوں چیزیں چھپا کر واپس گودام میں آ گیا۔

وہ دن گزر گیا دوسرے دن آ کر میں نے سب سے پہلے وہ جگہ دیکھی جہاں بوتل اور کالے بکرے کا دل چھپایا تھا۔ وہاں دونوں چیزیں موجود نہیں تھیں۔ مجھے تسلی ہوئی کہ مٹی باجی نے وہ آٹھائیں ہوں گی اور واپس گودام میں آ کر کام میں آجھ گیا۔

جس دن سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مٹی باجی وہاں کوئی چلے کاٹ رہی تھی دل کو تسلی ہوئی۔ اب میرا دھیان اُدھر کم ہی ہوتا تھا۔ ایک دوبار آنا سامنا ہوا مٹی باجی سے لیکن نہ انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میں نے۔

☆☆☆

ایک دن پھر انہوں نے مجھے اشارہ سے بلا کر اسٹیشن آنے کا کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ میں اسی طرح ان

کے پیچھے چلتا ہوا اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک طرف کھڑی مل گئیں۔ میرے سلام کا جواب دینے انہوں نے بڑے پیار سے میرا شکر یہ ادا کیا اور مجھ سے مخاطب ہوئیں۔
”جی مٹی باجی!“

”صدو بھائی ایک گزارش کرنا تھی آپ سے“
”جی باجی فرمائیں۔“ میں نے انھاری سے جواب دیا۔

”مکمل مشکل ہے اور آپ نے میرے پاس بیٹھنا ہے۔“
”تو میں سن کر پریشان ہو گیا پھر دل بڑا کر کے بولا۔“ مٹی باجی کوئی خطرہ تو نہیں۔ میرا مطلب آپ تو چلے کر رہی ہیں اور میں؟“ میرے لہجہ کا خوف محسوس کرتے وہ جواباً بولی

”صدو بھائی کوئی خطرہ نہیں بس میری مدد کرنی ہے آپ نے۔ وہ جو چیزیں آپ لائے تھے ان کی باری ہے کل۔ میں جب پڑھ رہی ہوں گی تو آپ نے دل کے پانچ ٹکڑے کر کے شراب پیچھے کرانی ہے اور پھر شراب کو آگ لگا کر ایک ایک دل کا ٹکڑا اس آگ پر پھینکنا ہے اور بس۔ میں آپ کو اس کام کے دو ہزار روپے دوں گی یہ رکھو۔“ انہوں نے اپنے پرس سے دو ہزار روپے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیے۔ واپس آ کر میں کام کرنے کے دوران یہ بھی سوچتا رہا کہ وہ عورت ذات ہو کر رات کی تاریکی میں مردار کھات میں بیٹھ کر چلے کھاتی کرتی ہے تو تم خرد ہو کر ڈر رہے ہو۔

رات پھر میں سوچ سوچ کر بلکان ہوتا رہا پھر مشکل کی رات مٹی باجی کے پاس بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

شام کو فارغ ہو کر میں گھر آیا اور آتے وقت بڑی سی ایک چھری بھی گودام سے ساتھ لیتا آیا تھا کسی بُرے لٹھ کیلے۔ جب گھر والے سوئے کیلے اپنی اپنی چار پائی پیچھے گئے تو میں خچے سے اٹھا چھری کو زیر جامہ کرتے اپنی چار پائی چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل آیا۔

جس جگہ کا میں نے سوچا تھا وہ کھیتوں کی جانب والا حصہ تھا۔ گندنا مال کراس کر کے میں پچتا ہوا دیوار تک پہنچ گیا۔ ایک جگہ دیوار کی اونچائی قدرے کم تھی میں اس پر ہاتھ بٹاتے دوسری طرف آ کر گیا۔ دیوار کے سائے کے

ساتھ رہتا ہوا میں اس کوٹے میں پہنچ گیا جہاں مٹی باجی نے اینٹیں جوڑ کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی مگر ابھی تک مٹی باجی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اندھیرے میں مجھے مٹی باجی بڑے مختلط انداز میں مردار کھات کی طرف آتے دکھائی دی۔ میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔

”آجیے صدو بھائی؟“

”جی مٹی باجی۔“ میں نے قریب آتے ہوئے جواب دیا۔

ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپریک تھا جو انہوں نے اس چھوٹے سے چپوترے پر رکھا اور اس میں سے ایک سرخ رنگ کا بڑا سا چوکور کپڑے کا ٹکڑا نکالا جس کی تہہ کھولتے ہی کافور کی بخ بومیرے ناک میں تھی۔ وہ کپڑا اس جگہ ڈال کر مٹی باجی اس پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی چندفٹ دور زمین پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے شاپرے سے میری لائی شراب کی بوتل اور اسی شاپرے میں لیٹا بکرے کا دل بھی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور مخاطب ہوئیں۔

”صدو بھائی آپ کو یاد ہے نا جو آپ نے کرنا ہے؟“

”جی مٹی باجی۔“ میں نے ان کی بتائی ہوئی ترکیب دہرائی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میرے وجود سے خوف نامی احساس سرے سے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مٹی باجی نے چھوٹی سی چھری نکال کر میرے اور اپنے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا اور سفید موم بتیاں ترتیب سے رکھتے ہوئے ان کو جلا دیا۔ اب موم بتیوں کے تھکے تھکے شعلوں کے درمیان مٹی باجی جو خود بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس کوئی عجیب مخلوق دکھائی دے رہی تھی، منہ میں کوئی منتر پڑھنے لگی۔ میں نے ہاتھ لگا کر اپنے ساتھ لائی چھری کو محسوس کیا اور مٹی باجی کے اشارے کا منتظر ہو گیا۔ منہ میں پڑھتے پڑھتے ایک دم وہ بڑبڑانے لگی جیسے کسی کو بلارہی ہو۔ یکدم موم بتیوں کی مدھم ریوشتی کے دائرہ میں ایک خوفناک شکل کا سایا سا ابھرا اور مٹی باجی سے مخاطب ہوا۔

”کیوں پریشان کیا ہے ہمیں؟ کیا چاہتی ہو؟“
مارے خوف کے میں تھر تھرا کر پ رہا تھا مگر وہ دونوں مجھ سے بے نیاز ایک دوسرے سے سوال جواب کر

رہے تھے۔ مٹی باجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنا کام کرنے کا کاشن دیا۔ میں نے فوراً وہ بدبو مارتا بکرے کا دل نکال کر چھری سے پانچ ٹکڑے کیا پھر بوتل سے شراب زمین پر اینڈل کر باجس کی تیلی جلاتے اس پر بیٹھتی۔ شراب تیز اور اچھی تھی فوراً ہی بھڑک اٹھی اور میں نے ایک ایک کر کے دل کے ٹکڑوں کو آگ میں ڈالنا شروع کر دیا۔

گندنی بدبو جو بولتے دل کے گوشت سے اٹھ رہی تھی اور گہرا سیاہ دھواں بھی۔ وہ ہیولا جو موم بتیوں کی لومیں تھرک رہا تھا ایک دم اس دھواں میں آ گیا۔ اب وہ سائے سے بدل کر مکروہ شکل میں سامنے تھا۔ مجھے وہ یا تو دیکھ نہیں رہا تھا یا نظر انداز کر رہا تھا۔ مٹی باجی سے ہی مخاطب تھا۔

”کیا چاہتی ہو مجھ سے؟“ وہ غرا کر بولا۔

”تمہاری حاضری اور اپنے کام۔“
”ایک نوا سیدہ بچے کا دل نکال کر سبھی عمل کرنا ہوگا تمہیں مگر کیلے میں..... کوئی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ یہ کل ہر حال میں وزنہ..... اتنا کہتے ہی وہ دھواں میں غائب ہو گیا۔

”اب تم جاؤ مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھنا ہے یہاں“
مٹی باجی نے چھری کی مدد سے کچھ پڑھا اور میرے گرد کھینچا دائرہ ختم کر دیا۔ میں کوئی جواب سوال کیے بغیر گولی کی طرح وہاں سے اٹھا اور گرتا پڑتا دیوار پھیلا لگ کر کھیتوں اور گندے نالے کو پیچھے چھوڑتا مردار کھات کی حدود سے نکل کر گھر کی طرف ہو دیا۔

گھر پہنچ کر جب میں اپنے بستر پر گر تو ایک ہی بات ذہن میں جو گردش تھی کہ چھوٹے سے بچے کا دل جو اسی طرح جیسے کالے بکرے کا دل شراب کی آگ میں بھنا تھا، اب بچے کا دل بھی نکال کر وہ ایسا ہی کرے گی مگر بچہ لائے کی کہاں سے؟ جب تک مجھے نیند نہ آئی میرے دل اور ذہن میں خوف اور آنے والے حالات گردش کرتے رہے۔

☆☆☆

صبح جب میں گودام آیا تو چھڑا منڈی کی پرانی جھکیوں میں جہاں ”باگے“ کے جو حرام حلال، کتے، بلیے، گیدڑ مردار سب کھا جاتے تھے شور مچا ہوا تھا کہ رات کوئی

آئین پر جنم لینے والی کہانیاں
جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے

حسد کی آگ

ممتاز احمد



ٹرین سے تاغیں کٹ جانے والا وہ فضل آج بھی لوگوں کو پلیٹ فارم پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے

ایک بہت منفرد پراسرار داستان عبرت

مُحِب گیا تھا۔ ٹھیک دو بجے بجلی بند ہوگئی اور ہر طرف ملل اندھیرے کا راج ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم سناں پڑا تھا۔ کیونکہ ج تک کوئی ٹرین نہیں آئی تھی۔ ریلوے کے عملے کے لوگ کروں میں دیکے بیٹھے تھے۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ ہو کا عالم، سردی کا موسم تھا لوگ اپنے اپنے گھروں میں گرم خانوں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور چاندان بادلوں کی اوٹ میں



فاصلہ برائے نام ہی تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا اُس نے چادر کے اندر چھپایا کچ نکالا جو حرکت کر رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ اپنے ساتھ لائی پھری پر مضبوط ہو گئے۔

اس نے موسم تیاں روشن کیں اور کپڑے میں لپٹا کچ نکال کر اس دائرے کے اندر رکھا۔ کچھ شائد بھوکا پیاسا تھا جو صرف برائے نام ہی حرکت کر رہا تھا۔ پھر وہ کچھ بڑھنے لگی اور پھری جو اس کے ہاتھ میں تھی اس نے بلندی اور بچے کے جسم میں اُتارنے ہی والی تھی کہ میں برق رفتاری سے ہڈیوں کے ڈھیر کی اوٹ سے نکلا اور کسی باجی کی طرف چھپنا اس سے پہلے کہ وہ بھٹکتی میرا چھری والا ہاتھ اس کے جسم میں بیوست ہو گیا۔ دوسرا وار اس کے دل والے حصہ پر کیا اور وہ تڑپ تڑپ کر میرے سامنے ٹھنڈی ہو گئی۔

میں بچے کی طرف متوجہ ہوا جس کے منہ پر سختی سے ٹیپ چسپاں تھیں جس کو میں نے ہٹایا تو اس کے منہ سے نحیف سی کراہ اُبھری میں نے اسے جلدی سے اٹھایا اور تقریباً بھاگتا ہوا رہائشی حصہ کی طرف آ گیا اور زور زور سے گیٹ پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ پر حاجی صاحب اور دوسرے لوگ آ گئے۔ میں نے مٹی باجی کو قتل کرنے اور بچے کو بچانے کے بارے میں بتایا۔ حاجی صاحب نے بچہ میرے ہاتھ سے لے کر اندر کسی خاتون کے سپرد کیا اور ایر میس لائیں لیے وہ لوگ مٹی باجی کی لاش کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆☆☆

بس یہ سب کہنے کے بعد صدمہ بابا پر سکون ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کا سکون اُس کے مطمئن ضمیر کا پتا دے رہا تھا۔ میں نے زیادہ کر یہ مناسب نہ سمجھی اور خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔

اس قدر جان لیوا اور سفاک سچائی نے میرے اندر بھی خوف کی ایک لہری جگا دی تھی۔ میں اپنے خوف پر قابو پا تا واپسی کا سفر پر گامزن تھا۔ مٹی کہانی، سچائی کو بے باک کرنے کے لیے میں نے اپنے قدم تیز کر دیے تھے۔

☆☆☆☆☆

نامعلوم بلا تین چار ماہ کا بچہ ماں کے ساتھ لیٹا اٹھائی کر گئی تھی اور اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ سنتے ہی میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی مٹی باجی کی کڑوت کا پتا چل گیا کہ رات کو وہ مُردار کھاتے میں کیوں ڈک گئی تھی۔ جھگیوں پر صرف گھاس پھوس کی چھتیں یا پرانے کپڑے ڈال کر صرف سایہ ہی کیا جاتا تھا ورنہ چاروں جانب سے اوپن۔ بس بد نصیب ماں کے ساتھ لیٹے بچے کو مٹی باجی اُچک کر لے گئی پتا نہیں وہ زندہ تھا یا اسے سفاک عورت نے مار ڈالا تھا۔

میں ڈرتا ہوا اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کر رہا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ رات بھر جادو ٹوٹنے میں شریک رہا۔ بس اب صرف ایک ہی فیصلہ تھا میرے پاس کہ رات کو میں مٹی باجی کو وہ جلتے نہ کرنے دوں جیسا کہ وہ تقریباً سب کچھ حاصل کر چکی تھی۔ سارا دن میرا پریشانی میں گزارا کہ دن ڈھلے اور رات ہواور میں مُردار کھاتے میں پہنچ جاؤں۔

☆☆☆

میں نے جو فیصلہ کیا وہ انتہائی تھا۔ ایسی سفاک اور بد بخت عورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جو ایسی شیطانی قوت کو اپنے قابو میں کر کے چاہے کچھ بھی کر ڈالے۔ اس کے دونوں سابق شوہروں کی موت تو بچی گئی تھی۔

میں نے بڑی پھری کو خوب تیز کر رکھا تھا اور رات کی تاریکی میں گھر سے نکل کر چڑا منڈی کی طرف چل پڑا۔ دیوار پھلانگتے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مٹی باجی کے پاس شیطانی طاقت میں دیکھ چکا تھا اور جس مقصد کو لے کر میں مُردار کھایا تھا اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو میری موت یقینی تھی مگر میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ڈکروں کی ہڈیوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گیا۔ میری نظریں اس راستے پر تھیں جدھر سے مٹی باجی اس روز مُردار کھاتی کی طرف سے اس جگہ آئی تھی، جہاں بیٹھ کر وہ شیطانی چلنے کی کرتی تھی۔

وہ رات کا پچھلا پہر ہو گا بد بو اور پھچروں نے میرا اُحال کر رکھا تھا۔ رہائشی حصہ کی طرف سے سیاہ چادر میں لپٹا انسانی وجود مُردار کھاتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاند کی روشنی گو کہ بڑی کم تھی مگر مٹی باجی کو میں پہچان گیا۔ وہ سیدھی اس چوہرے کی طرف بڑھ رہی تھی اس کا اور میرا

رات کی اس تاریکی میں ایک سایا جس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ وہ تیز قدموں سے بغیر آواز پیدا کیے دایں بائیں دیکھتا اور جنوب کی طرف چلتا جا رہا تھا۔ اب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اتر آیا اور ریلوے لائن کے درمیان چل رہا تھا۔ اُس کا رخ قریبی قبرستان کی طرف تھا۔ چند قدموں کی مسافت کے بعد قبرستان آ گیا تو وہ خاموشی سے قبرستان کی چھوٹی سی چار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہوا اور چند لمبے گھرے رہنے کے بعد سمت کا تعین کر کے لمبے لمبے ڈگ برتا۔ قبریں پھلانگتا ہوا ایک جگہ پر رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی، اُس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور نیچے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

عظیم اور کلیم دونوں سگے بھائی تھے۔ عظیم عمر میں بڑا تھا اور کلیم اُس سے تین سال چھوٹا تھا۔ عظیم اور کلیم کے والد سلیم ایک آڑھتی کے پاس شنی کا کام کرتے تھے وہ صبح سے رات لٹی تک اپنے کام میں مشغول رہتے۔ جس مکان میں اُن کی رہائش تھی وہ اسی آڑھتی کا تین مرلے کا پُرانا مکان تھا۔ جس کے پاس وہ شنی تھے۔

مکان میں دو کمرے جن کے آگے برآمدہ ایک چھوٹا سا پورچی خانہ اور تھوڑا آگے نسل خانہ تھا۔ جس کے سامنے کچن تھا۔ آڑھتی پانچ سو روپے مکان کا کرایہ سلیم صاحب کی تنخواہ میں سے کاٹ لیتا تھا۔ گھر میں کل چار افراد تھے، سستا زمانہ تھا تو ان لوگوں کی گذر بسر آسانی سے ہو رہی تھی۔ عظیم کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بار بار فیل ہونے کی وجہ سے ابھی تک مڈل میں تھا۔ کلیم تین سال چھوٹا ہونے کے باوجود اٹھویں کلاس میں پہنچ گیا۔ عظیم جب مڈل کا امتحان پاس نہ کر سکا تو اُس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور گاڑیوں کا کام سیکھنے کے لیے ایک ورکشاپ میں میکینک کی شاگردی اختیار کر لی۔ جبکہ کلیم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا تو وہ محنت اور لگن سے تمام تعلیمی مراحل کامیابی سے طے کرتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا۔ عظیم بنیادی طور پر ذہین تھا مگر اُس کی توجہ ہرگز پڑھائی کی طرف نہ تھی۔ ورکشاپ میں اُس کو استاد بہت اچھا ملا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چھ سال کے عرصہ

میں سارا کام سیکھ گیا اور گاڑیوں کا بہترین میکینک اور کار گیر بن گیا۔

عظیم نے جب پڑھائی اور اسکول چھوڑا تو اُس کے والد سلیم صاحب پہلے پہل بہت برہم ہوئے مگر اُس کے بار بار فیل ہونے کا نتیجہ اور تعلیم سے عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس لیے خاموش ہو گئے کہ ایک تو عظیم نے بُری صحبت اختیار کرنے کی بجائے ورکشاپ میں کام سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ عظیم کا استاد اُسے روزانہ دس روپے دیتا جو وہ لا کر اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تو اس لیے انھوں نے زیادہ اعتراض اور باز پرس نہ کی۔ عظیم جوں جوں کار گیر بنتا گیا اُس کے معاوضے میں اضافہ ہو گیا گیا اور اُسے ماہوار چھ سو روپے تنخواہ ملنے لگی۔ کلیم رات گئے تک پڑھتا رہتا اور محنت کے بل بوتے پر ہر امتحان میں پہلی پوزیشن لیتا، دونوں بھائیوں میں پیار تھا تو زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔

ایم اے کرنے کے بعد کلیم نے ملازمت کے حصول کے لیے مختلف محکموں میں اپلائی کرنا شروع کر دیا اور جلد ہی شاندار تعلیمی ریکارڈ کے بل بوتے پر اُسے اپنی ہی شہر میں بہت اچھی پوسٹ پر سرکاری ملازمت مل گئی۔ کلیم نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کلیم نے ڈیوٹی جوائن کر لی اور جب اُس نے اپنی پہلی تنخواہ پندرہ سو روپے لا کر اپنی ماں کے ہاتھ میں رکھی تو انھوں نے پیار سے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ ڈھیر ساری دعائیں دیں اور پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔

اب دونوں بیٹے مکاؤ پوت ہو گئے تھے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دونوں اپنی اپنی تنخواہ لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے، ماں بہت خوش ہوتی کہ دونوں بیٹے بہت فرماں بردار ہیں۔ اب ماں کی یہ خواہش بھی کہ وہ جلد از جلد اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں کروے۔ چنانچہ اُس نے اپنے شوہر سلیم سے صلاح مشورہ کیا اور بیویوں ڈھونڈنے لگ گئی۔

جلد ہی اُس کی مراد برآئی اور بیویوں کا انتخاب کر لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گھر بہت چھوٹا تھا، صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، ظاہر ہے دونوں بیویوں

جین بھی لے کر آئیں۔ مگر جگہ بہت تنگ تھی چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ گھر تبدیل کر لیا جائے۔

تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ایک مناسب گھر جو چار کمروں پر مشتمل تھا وہ مل گیا۔ مکان کا کرایہ بارہ سو روپے تھا۔ اور جلد ہی وہ نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ شادیوں کی تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔

اور پھر وہ دن آ گیا۔ آج عظیم اور کلیم کی ماں کا اپنے بیٹوں کے سر پر سرسجائے کا ارمان پورا ہو رہا تھا۔ پہلے دن عظیم کی بارات گئی۔ دوسرے دن کلیم کی اور تیسرے دن دونوں کا مشترکہ ویدک کیا گیا۔

نسرین عظیم کی ذہن تھی اور صبیحہ کلیم کی ذہن تھی۔ نسرین اور صبیحہ کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نسرین بہت تیز طراز اور انتہائی چالاک اور ہوشیار تھی۔ وہ جھوٹ اس خوبصورتی سے بولی کہ سننے والے کو سچ لگتا۔ نسرین صرف آٹھ جماعتیں پاس تھی جبکہ صبیحہ نے بی اے کیا ہوا تھا۔ وہ ایک سنجھی ہوئی طبیعت کی سادہ اور اچھے مزاج کی لڑکی تھی۔ چوں کہ کلیم ایم اے پاس سرکاری افسر تھا تو اُسے بیوی بھی پڑھی لکھی ہی جبکہ عظیم آٹھویں فیل تھا تو اُسے بیوی بھی آٹھ جماعتیں پاس ملی۔ شادی کے پہلے دو مہینے تو کچھ آرام اور سکون سے گزرنے پر دیورانی، جھٹھالی کی روایتی چچکشا آہستہ آہستہ شروع ہوئی۔ چچکشا کی بنیادی وجہ تو کوئی خاص نہیں تھی۔ اصل میں نسرین کا کینہ، بغض اور حسد کی ماری ہوئی تھی۔ کلیم سرکاری افسر تھا تو اُسے محکمہ کی طرف سے بلا سو قرضہ ملا جس سے اُس نے نئی زیر زمین موٹر سائیکل خرید لی۔ وہ صبح آٹھ بجے آفس کے لیے نکل جاتا اور اُسے تین بجے چھٹی ہو جاتی تو وہ ساڑھے تین بجے تک گھر پہنچ جاتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر دونوں میاں بیوی موٹر سائیکل پر نہیں گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے مگر نسرین کے دل پر یہ بات بہت گراں گزرتی کیونکہ عظیم صبح سویرے کام پر نکلتا اور رات گئے ورکشاپ سے واپس لوٹتا۔ اُس کے کپڑوں پر گریس، موبائل آئل اور کالک لگی ہوتی۔ وہ آ کر منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنا اور کام کی وجہ سے تھکا ہوتا تھا تو جلد سو جاتا۔ وہ بہت کم نسرین کو کہیں لے کر جاتا تھا۔

نسرین کو اُس کے ملے کپڑے جن سے گریس، تیل کی بدبو آتی تھی دھونے کا اور گزر تے۔

چونکہ صبیحہ بہت نرم مزاج تھی اور گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کو بہت عزت دیتی تھی تو اب ہر آنے والا مہمان صبیحہ کے کمرے میں بیٹھتا۔ اب یہ بات بھی نسرین کو گوارا نہیں تھی۔ جس محلے میں کلیم نوکری کر رہا تھا وہ براہ راست پبلک ڈیلنگ والا محلہ تھا۔ کلیم بہت ایماندار اور دیاندار تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے بولتا خدق پیشانی سے پیش آتا۔ بغیر رشوت لے کر ہر ایک کا کام فوراً کر دیتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے اور دن بدن اُس کا حلقہ احباب بڑھنے لگا۔ لوگ ملنے کے لیے گھر آتے تو کوئی پھل، کوئی مٹھائی کوئی کیک وغیرہ لے کر آتا تو ظاہری بات ہے کہ مہمان نوازی بھی کی جاتی۔ اس طرح کی بار دودھ وغیرہ ختم ہو جاتا۔ کلیم کو ملنے کوئی بھی نہیں آتا تھا جو بھی آتا وہ کلیم سے ملنے آتا اب اس بات سے نسرین مل بھن جاتی۔ عظیم کو روزانہ رات ایک گلاس دودھ پی کر سونے کی عادت تھی۔ اب نسرین جان بوجھ کر دودھ کو نالی میں بہا دیتی اور عظیم کے آتے ہی شکایتوں کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتی اور عظیم سے شکوہ کرتی کہ سارا دن کلیم کے مہمان آتے رہتے ہیں اور نسرین ان کی خاطر داری کرتی رہتی ہے۔ صبیحہ کچھ نہیں کرتی اور مہمانوں کو آؤ بھگت میں دودھ ختم ہو جاتا ہے بلکہ چینی پتی تک مہمانوں کی نظر ہو جاتی ہے۔ تو اس طرح کی باتوں سے نسرین نے نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مہمانوں کے لیے چائے پانی اور دیگر لوازمات صبیحہ تیار کرتی۔ عظیم کے لیے دودھ پہلے ہی الگ برتن میں ڈال کر فریج میں رکھ دیتی مگر نسرین وہ دودھ جان بوجھ کر ضائع کر دیتی۔ تو اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔

شادی کے دس ماہ بعد صبیحہ نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا جبکہ نسرین کے ماں بننے کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے۔ اب جلن اور حسد کی وجہ سے نسرین کو صبیحہ کا بیٹا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

اب تو لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے تھے۔ عظیم اور کلیم کی والدہ بے چاری ہیں کے رہ گئی تھی۔ وہ بے چاری بیویوں کی روزگار کروائی مگر اگلے روز پھر لڑائی۔

ایک دن عظیم اور کلیم کے والد اپنے کام سے واپس گھر آ رہے تھے کہ ایک گاڑی کی ٹکر لگنے سے شدید زخمی ہو گئے اور ایک گھنٹے کے بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

سلیم صاحب کی تنخواہ دو ہزار روپے تھی، ایک ہزار روپے کلیم کی اور کلیم کی تنخواہ پندرہ سو روپے بھی تھی اس وجہ سے گزر بسر اچھے طریقے سے ہو رہی تھی مگر ان کی موت کے بعد آمدنی گھٹ گئی تھی۔ اب صرف عظیم اور کلیم کی تنخواہیں تھیں۔ بارہ سو روپے مکان کا کرایہ نکل جاتا پھر بجلی، گیس، دودھ والے کابل اور دیگر اخراجات تو کھر میں مانی گئی آگئی جس کی وجہ سے بک بک، حج حج میں اضافہ ہو گیا۔

اگلے سال صبیحہ نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا تو نسرین کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔

اب اس نے خاندان بھر میں مشہور کر دیا کہ صبیحہ نے اس پر جادو کر دیا ہوا ہے کہ نسرین کے ہاں اولاد نہ ہو، عظیم جیسے ہی تھکا ہارا کام سے آتا تو نسرین رونا شروع کر دیتی اور صبیحہ کی جھوٹی شکایتیں لگاتی کہ اُس نے یہ کیا وہ کیا پہلے پہل تو عظیم نے نسرین کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی مگر آہستہ آہستہ وہ سننے لگا مگر ماں سے یا کلیم سے کچھ نہ بولتا۔

ایک دن نسرین کی امی آئی اور نسرین کو اپنے ساتھ لے گئی۔ شادی کو تین سال ہو چکے تھے مگر نسرین کی کوکھ ابھی تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ نسرین کی ماں اُسے ایک عامل کے پاس لے گئی اور اُسے بتایا کہ اس کے ہاں اولاد بھی نہیں ہو رہی۔ دوسرا اس کا خاوند بھی اس پر توجہ نہیں دیتا۔ چنانچہ اُس عامل نے چینی پر کوئی عمل کر کے دیا اور کہا کہ یہ چینی سات دن لگتا رہ جائے یا دودھ میں ڈال کر عظیم کو پلانی ہے۔ پھر ایک نقس و نگار والا کاغذ دیا کہ اسے اپنے سر میں کسی ہینر پن کے ساتھ لگا لے رکھنا ہے۔ اس سے تمہارا خاوند تمہارا طالع اور فرماں بردار ہو جائے گا۔ باقی اولاد کے لیے لبا علاج ہے تو دس بارہ دن کے بعد آنا۔

نسرین کچھ دن میٹے میں رہ کر واپس سرال آ گئی

اور اُس نے آتے ہی عامل کی ہدایت کے مطابق عمل کی ہوئی چینی عظیم کو پلانی شروع کر دی اور وہ کاغذ سر کی پن کے ساتھ لگا لیا۔ اب حیرت انگیز طور پر عظیم میں تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ وہ مکمل طور پر جورو کا غلام بن گیا اور نسرین کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا۔ نسرین اپنی ساس اور صبیحہ کی جھوٹی شکایتیں لگاتی جس سے نسرین عظیم میں آجاتا، پھر خوب گالم گلوچ کرتا اور ماں کی بے عزتی بھی کر دیتا۔ صبیحہ کو ماں بہن کی گالیاں دیتا اور کلیم کا گریبان بھی پکڑ لیتا۔ اگر ماں بچ بچاؤ کرانے درمیان میں آ جاتی تو وہ ماں کو بھی دھکا مارتا اور اُن کو بھی گالیاں دینے لگ جاتا۔

اب تو عظیم کو نسرین کے سوا کچھ نظر نہ آتا وہ اُس کی ہر بات کو بچ بچتا۔ اپنی ماں، بھائی اور بھائی کو ظالم اور نسرین کو غلام سمجھتا۔ دو ہفتے کے بعد نسرین اپنے میٹے کی اور ماں کے ساتھ اُسی عامل کے پاس گئی۔ نسرین کا پہلا کام تو ہو چکا تھا۔ اس کا اعتقاد عامل پر ہو گیا۔ عامل نے نسرین کو بتایا کہ صبیحہ نے اُس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے اُس کے ہاں اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ تو سب سے پہلے اُس جادو کا توڑ کرنا ہوگا۔ پھر ایک لبا لبا ہے۔ جس کے لیے نسرین کو ہر تیسرے دن اکیلے اُس کے پاس آنا ہوگا۔ تو بہت جلد وہ بھی ماں بن جائے گی۔ جادو کا توڑ کرنے کے لیے اُس نے کافی رقم نسرین سے بٹوری جو کہ وہ عظیم کی جیب سے چوری نکال لیا کرتی تھی۔ کچھ پیسے وہ اپنی ساس کے بٹوے سے بھی اڑا لیتی۔ عامل نے نسرین سے کہا کہ وہ ایسا عمل بھی کرے گا جس کے نتیجے میں صبیحہ کے دونوں بیٹے بھی مر جائیں گے اور وہ بھی شدید بیماری میں مبتلا ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ بھی نسرین دل سے چاہتی تھی مگر یہ بات زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ جو کہ عامل نے خود ہی کہہ دی۔ نسرین نے خوش ہو کر عامل کے گندے پاؤں پر سر رکھ کر چوما اور شکریہ ادا کر کے چلی آئی۔

چند دن گزرے تو صبیحہ کے دونوں بیٹے بیمار ہو گئے۔ صبیحہ بھی بیمار ہو گئی۔ تو نسرین خوشی سے نہال ہو گئی اور روزانہ چشم تصور میں صبیحہ کے بیٹوں کو مرنا دیکھتی۔ اب

تو نسرین کا اندھا اعتقاد ہو گیا۔ عامل پر وہ اُسے بہت پہنچا ہوا سمجھنے لگی جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ عامل غیر مسلم تھا اور جادو کرتا تھا۔ کلیم اور صبیحہ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ صبیحہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتی اور یہ نماز، تلاوت اور اللہ کے ذکر کی برکت تھی کہ اُس جادوگر عامل کے جادو کا اثر اُن پر اتنی شدت سے نہیں ہو رہا تھا۔ جتنا سخت عمل اور جادو اُس نے کیا تھا۔ صبیحہ چاروں فل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے، اپنے بچوں اور کلیم پر دم کرتی رہتی تھی۔ ایک دن نسرین کی ایک اُسی عامل کے پاس گئی۔ نسرین بہت خوب صورت تھی اور آج عامل کی ہدایت کے مطابق تنہا آئی تھی۔ عامل نے فوراً اُسے اپنے کمرہ خاص میں بلوایا۔ آج عامل کسی اور نیت اور نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اُس کی آنکھوں اور سر میں شیطانیات تھی۔ اُس نے نسرین کو بہت سبز باغ دکھائے کہ وہ ایسا عمل کرے گا جس کے نتیجے میں وہ ماں بن جائے گی۔ اُس کی دیورانی اور اس کے دونوں بیٹے بھی مر جائیں گے اور ایک سال کے اندر اندر نسرین بہت امیر ہو جائے گی دولت میں کھیلے گی۔ کار ہوگی، کوئی ہوگی۔ یہ سب کچھ نسرین کا خواب تھا اور عامل اسے بہت جلد یہ سب کچھ دینے کی خوش خبری سنارہا تھا۔ نسرین اُس کے پیروں میں بچھ بچھ جا رہی تھی۔ نسرین نے پوچھا کہ یہ سب کچھ پانے کے لیے اُسے کیا کرنا ہوگا؟

تو عامل نے عیاری اور مکاری سے کہا کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا جو کچھ بھی کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ بس وہ تھوڑی سی رقم کا بندوبست کرے اور..... اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تو نسرین نے پوچھا کہ اور کیا کرنا ہوگا تو عامل نے اُسے اپنے قریب کر کے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا کہ ایک دن چھوڑ اُسے اکیلا یا ناٹم آنا ہوگا۔ نسرین کی آنکھوں پر حسد، بغض اور لالچ طبع کی پٹی تو بند چکی تھی اور وہ اندھی ہو چکی تھی تو وہ کٹھ پتلی کی طرح عامل کے اشاروں پر نہانے لگی۔ آج اُس نے اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی عزت جو کہ اُس کے شوہر کی امانت تھی وہ لٹا دی اور وہ بھی ایک غیر مسلم ہمارے ہاتھ۔

نسرین اپنی دیورانی کے حسد اور بغض میں ذلت کی اقتادہ گہرائیوں میں گر گئی۔ پورا ایک مہینہ وہ عامل کے ہاں

مختلف حیلوں بہانوں سے جاتی رہی اور وہ بھینٹ یا اس کو نوچتا رہا۔ عیار عامل نسرین سے اُس کے جسم کے ساتھ ساتھ آدھا زور بھی ہڑپ کر چکا تھا۔

جب عظیم کو علم ہوا کہ نسرین کہیں جاتی ہے تو اُس کا پوچھنے پر نسرین نے اُسے بتایا کہ بہت پیچھے ہوئے عامل بابا کے پاس جاتی ہوں۔ جس کے علاج سے وہ باپ بھی بن جائے گا اور دولت مند بھی۔ کار، کوئی کا مالک ہوگا اُس کے سب دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ اگلے کچھ نسرین کو مٹتی تے شروع ہو گئی تو شام تک لیڈی ڈانسر نے نسرین کو ماں بننے کی خوش خبری سنائی۔

اب تو نسرین کے ساتھ ساتھ عظیم بھی عامل بابا کا قائل ہو گیا۔ اُس عقل کے اندر بے پہلے ہی عمل کا اثر ہو چکا تھا۔ اب دولت مند بننے کے چکر اور لالچ میں اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ عظیم اب نسرین کا بہت خیال رکھتا۔ صبیحہ اور اس کی ساس بھی نسرین کا خیال رکھتے۔ اُسے کوئی کام نہ کرنے دیا جاتا۔ گھر کا سارا کام اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ مل کر کرتی۔ صبیحہ اور اُس کے دونوں بیٹے بیمار رہنے لگے۔ صبیحہ کو جوانی میں جوڑوں کا درد، سر چکرانا اور پیٹ میں شدید مروڑاٹھنا جیسے امراض لگ گئے۔ کئی بار تو صبیحہ کا سانس ایک دم رک جاتا اُسے بہت ٹھن اور گھبراہٹ ہوتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو کر گر جاتی۔ اسی طرح اُس کے دونوں بیٹے بھی دن بدن کمزور اور لاغر ہوتے گئے۔

کلیم ماہر ڈاکٹروں سے اپنے بیوی بچوں کا علاج کروا رہا تھا۔ کئی کئی نمٹ ہوتے اور تمام رپورٹس کلیئر ہوتیں۔ مہنگا علاج ہو رہا تھا۔ صبیحہ خود بھی باقاعدگی سے مہنگی دوا خود بھی کھاتی اور اپنے بیٹوں کو بھی کھلاتی۔ مگر مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی..... بالکل آرام نہیں آ رہا تھا۔ کلیم کی تنخواہ ساری کی ساری علاج پر خرچ ہو رہی تھی۔ اب تو الٹا کافی سارا قرض بھی چڑھ گیا تھا۔ کلیم بہت پریشان رہنے لگا تو ایک دن اُس کو لیگ نے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو کلیم نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کلیم کے کو لیگ نے صلاح دی کہ جسمانی دوا کے علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی

کراؤ تو اُس نے بتایا کہ میرے ایک جاننے والے شاہ صاحب ہیں جو کہ بہت نیک، سچی اور پرہیزگار ہیں۔ اُن کے پاس چلتے ہیں اُن سے دعا کرواتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام کلیم اپنے کو کلیم کے ہمراہ اُن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

شاہ صاحب امام مسجد تھے۔ اُن کا بیشتر وقت عبادت الہی میں گزارتا۔ مسجد سے ملحقہ حجرے میں اُن کی رہائش تھی بہت سارے لوگ اُن کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے اور اُن سے دعا کرواتے۔ شاہ صاحب رات گئے تک خدمت خلق میں مصروف رہتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے اور فی سبیل اللہ سب کی مدد کرتے۔ کبھی پوری زندگی کسی سے ایک روپیہ تک نہیں لیا۔ کلیم کے کوکلیم نے کلیم کا تعارف اُن سے کرایا۔ سلام دعا اور تعارف کے بعد کلیم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ساری بات بتائی تو شاہ صاحب نے کچھ دیر مراقبہ کیا اور کہنے لگے۔

”اللہ مہربانی فرمائے گا۔ آپ کے بیوی بچوں کو کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے۔ کافی بڑے اثرات ہیں مگر انشاء اللہ جلد ہی شفا پائی ہوگی۔“

انھوں نے کلیم اور اُس کی بیوی بچوں کے لیے دعا کی اور تین تعویذ لکھ کر دیے اور ساتھ ہی پانی دم کر کے دیا کہ ایک ایک تعویذ چمڑے میں پیک کر کر کوکلیم کے گلے میں ڈال دو اور یہ پانی بیوی بچوں کو پلاؤ، نماز پنجگانہ کی پابندی رکھیں اور حسب استطاعت صدقہ خیرات بھی کریں۔ چنانچہ اس عمل سے چند ہی دنوں میں صبحہ اور اُس کے دونوں بیٹے صحت یاب ہو گئے تو کلیم نے سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆

نسرین کو جب پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو خوشی سے اُس کو پاؤں زمین پر نہیں نکلتے تھے۔ وہ پورے دو مہینے اپنی خوشی میں مگن رہی جب اُس نے صبحہ اور اُس کے دونوں بیٹوں کو دیکھا کہ یہ تینوں بھلے چنگے ہو گئے ہیں تو اُس کا ہاتھ ٹٹکا اور وہ اگلے ہی روز بہانہ بنا کر اسی جادوگر عامل کے پاس پہنچی اور اُسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے مگر صبحہ اور اس کے دونوں بیٹے تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے ہیں۔ آپ تو کہتے تھے کہ وہ جلد ہی

مر جائیں گے مگر اُن کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔“

جس پر عامل نے ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لائیں لگا کر حساب لگایا اور نسرین کو بتایا کہ اُس کے عمل کا توڑ کروایا گیا ہے۔ مگر اب وہ بہت سخت عمل کرے گا جس کے نتیجے میں وہ تینوں خون تھوکتے جلد ہی مر جائیں گے۔ نسل کے لیے پہلے اُس نے نسرین کے جسم کی رشوت وصول کی پھر نسرین سے کہا کہ صبحہ اور اُس کے دونوں بیٹوں کے استعمال شدہ کپڑے اور صبحہ کے کچھ بال لے کر آؤ، ساتھ ہی ایک ہزار روپے بھی لے کر آنا۔“ نسرین نے کچھ دن بعد آنے کا وعدہ کیا اور گھر چلی آئی۔

اب وہ موقع کی تاک میں رہنے لگی کہ کس طرح ان تینوں کے استعمال شدہ کپڑے لے۔ صبحہ جس میز پرش سے بالوں میں کھی کرتی تھی تو اُس میں کچھ بال رہ جاتے تھے۔ تو نسرین نے کچھ دنوں میں وہ تھوڑے تھوڑے بال میز پرش سے نکال کر اپنے پاس محفوظ کر لیے اور کسی نہ کسی طریقے سے تینوں کے استعمال شدہ کپڑے بھی حاصل کر لیے۔ اب مسئلہ تھا ایک ہزار روپے کا جو کہ فی الوقت اُس کے پاس نہیں تھے۔

اُس نے ایک دن آنکھ میا کر صبحہ کی ایک انگوٹھی جو کہ وہ اپنے ڈرائنگ ٹیبل پر اتار کر بھول گئی تھی۔ وہ چوری کر لی اور اگلے ہی دن اُسے بیچ کر ایک ہزار روپے بھی حاصل کر لیے۔ اور اسی دن مطلوبہ اشیاء کے ساتھ جادوگر عامل کے پاس پہنچ گئی۔ عامل نے اُن کے خون سے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھا پھر بالوں اور کپڑوں پر کندہ عمل کیا اور اُس کاغذ کے ٹکڑے میں صبحہ کے سر کے بال لپیٹ دیے اور ہدایت کی کہ اسے منی میں دبا دو اور یہ کپڑے واپس لے جاؤ۔ جیسے ہی وہ یہ کپڑے پہنیں گے تو بہت جلد تینوں خون تھوکتے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ عامل نے ایک ہزار روپے بعدہ نسرین کے جسم کے ساتھ وصول کیے اور نسرین نے فوراً عامل کی ہدایات پر عمل کر دیا۔

☆☆☆

اگلی رات صبحہ سوئے میں ایک دم چپٹیں مارتے ہوئے بیدار ہوئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کلیم اور اس کے گھر والے گھبرا کر اٹھ گئے۔ صبحہ بہت سخت ڈر گئی تھی

اور کہنے لگی کہ کمرے میں ابھی کوئی تھا جو کہ اُس کا گلا دبا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں لال سرخ تھیں۔“ اُسے سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

کلیم اور اُس کی ماں نے سلی دی کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ یقیناً اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جیسے تیسے رات گزری تو اگلے دن صبحہ کے کمرے میں خون کے چھینٹے کرنے لگے۔ کبھی بھی گندے انڈے بھی کرتے۔ جس سے اُس کے کمرے میں سخت بدبو اور نفرتن اٹھتا۔ اُس کے دونوں بیٹے بھی خوف زدہ ہو کر رونے لگے۔ صبحہ کو ہر وقت اپنے ارد گرد سائے نظر آتے۔ عجیب و غریب مخلوق نظر آتی۔ اچانک کسی نہ کسی چیز کو آگ لگ جاتی۔ پانی پینے کے لیے شیشے کا گلاس جیسے ہی اپنے ہونٹوں سے لگاتی ایک دم خود بخود دھواں نکلتا جاتا اور پانی اُس کے کپڑوں پر گر جاتا۔ اُس پر شدید کھانسی کا دورہ پڑتا اور کھانسی کے ساتھ خون نکلنے لگتا۔ کلیم اس تمام صورت حال سے بہت پریشان ہوا۔ فوراً شاہ صاحب سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ وہ عمرے کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس گئے ہیں اور ایک ہفتے کے بعد آئیں گے۔ اُس کی پریشانی بڑھ گئی۔ پھر اُس نے کسی طرح شاہ صاحب سے ملی فون پر رابطہ کیا اور اپنی چٹانسی تو انھوں نے ہدایت کی کہ فوراً صبحہ اور بچوں کو اُس کے میکے میں چھوڑ دو۔ سختی سے ہدایت کی کہ اگر وہ تعویذ اتار دیتے ہیں تو فوراً تینوں کو پڑنا دو اور ایک وظیفہ پڑھنے کو بتایا۔ سلی دی کہ وہ ایک ہفتے کے بعد آکر اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیں گے۔ حوصلہ رکھیں کچھ نہیں ہوگا۔“

تو کلیم کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ اُس نے اُسی روز صبحہ اور بچوں کو اپنے سرسرا میں چھوڑا۔ ان تینوں کے گلے میں تعویذ ڈال دیے اور شاہ صاحب کے بتائے ہوئے وظیفے کا ورد شروع کر دیا۔ جس کی برکت سے کچھ بہتری آئی۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا کہ ان کے واپس آنے تک صبحہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں ہی رہے۔ اور صبح شام اپنے اور بچوں کے گرد آیت الکرسی کا حصار بھیج لیا کرے۔

☆☆☆

عظیم اُس ڈھونگی عامل کا قاتل تو ہو چکا تھا۔ اب

اُس کی دلی خواہش روز بروز حدت اختیار کر گئی جاری تھی کہ وہ جلد از جلد دولت مند بن جائے۔ کار ہو گئی ہو دنیا کی ہر آسائش ہو۔ اُس کی اس خواہش کے پیچھے نسرین کا ہاتھ تھا۔ نسرین نے امیر بننے کی خواہش کی تکمیل کے سلسلہ میں عظیم کو راضی کیا کہ وہ اولین فرصت میں عامل سے ملاقات کرے۔ چنانچہ اگلے روز عظیم اور نسرین دونوں عامل کے ٹھکانے پر پہنچے۔ عامل نے بغور سر سے پاؤں تک عظیم کا جائزہ لیا اور دونوں کو اپنے سامنے بٹھا کر گفتگو کا آغاز کیا چونکہ عامل نے خود ہی امیر کبیر بننے کی خواہش نسرین کے دل میں دھکی لی تھی۔ مگر اب وہ خود اُن کے منہ سے سننا چاہتا تھا تو اُس نے انجان بننے ہوئے آنے کا مقصد پوچھا تو عظیم اور نسرین نے بڑی عاجزی اور انکساری سے عامل کی تعریف کی۔ اُس کی شان میں فلابے ملائے اور کہا کہ آپ کے عمل کے نتیجے میں نسرین کی گود ہری ہوئے جاری ہے تو اب آپ کچھ ایسا کریں کہ میں اپنی ذاتی ورکشاپ کا مالک بن جاؤں۔ خوب آمدنی ہو اپنی کار اور کوئی ہو تو عامل نے کہا کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔

جس پر وہ اُس کے آگے گڑ گڑانے لگے کہ آپ ہمارے لیے کچھ کریں آپ جیسا بولو گے ہم کرنے کو تیار ہیں۔“ عامل مسلسل انکار کر رہا تھا۔ مگر عظیم اور نسرین اتنا ہی اصرار کر رہے تھے۔ تو عامل ایک دم غصے میں آ گیا اور کہنے لگا کہ تیرے بھائی کا رابطہ اُس شاہ سے ہے اور ہر بار وہ شاہ میرا راستہ کھونا کر دیتا ہے۔ جب تک شاہ راستے سے ہٹ نہیں جاتا تو کچھ نہیں ہو سکتا۔

”اس پر عظیم اور نسرین نے عامل کے کندھے اور بدبو دار پاؤں پکڑ کر کہا کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں تو اُس شاہ کا کاٹنا نکال دیں نا آپ کے لیے کیا مشکل ہے؟“

تو عامل نے کہا کہ شاہ کا پتا صاف کرنے کے لیے اور تمہارے امیر بننے کے لیے مجھے ایک بہت سخت اور کنکھن عمل اور چلہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک شاہ زندہ ہے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

اس پر عظیم اور نسرین نے عامل کی منتیں کیں کہ آپ وہ عمل اور چلہ کریں ہم ہر طرح سے حاضر ہیں تو عامل نے کہا کہ چلے اور عمل کے لیے مجھے کچھ چیزیں درکار ہیں۔ تم جلد

از جلد ان کا بندہ بست کرو تو میں چلہ کر لیتا ہوں۔ عظیم نے دریافت کیا کہ کیا کیا چیزیں جائیں۔ تو عامل نے رازداری سے کہا کہ دس ہزار روپے نقد، کالے بکرے کی کھال اور کسی نوزائیدہ مردہ بچے کا دماغ چاہیے۔ جسے وہ تل کر کھائے گا اور بکرے کی کھال پر بیٹھ کر رات بھر چلے گا۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ خود بندہ بست کر لے گا۔ بس تم کسی مردہ بچے کا دماغ لا دو۔ اور ساتھ ہی دونوں کو یقین دلایا کہ اگر تم یہ کام کرو تو پھر تم راتوں رات امیر بھی ہو جاؤ گے اور شاہ بھی میرے راستے سے ہٹ جائے گا۔ عظیم گہری سوچ میں ڈوب گیا تو عامل نے کہا آپ لوگ اب جاؤ۔ یاد رکھنا ہر معاملے میں رازداری شرط ہے اب تم دوبارہ میرے پاس اُس وقت آنا جب بچے کے دماغ کا بندہ بست کر لو گے۔

☆☆☆

عظیم سارا دن اور رات سوچ میں پڑا اور بالآخر نسرین کے اصرار پر وہ اس کام کے لیے راضی ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مردہ بچے کا دماغ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جائے تو اگلے ہی دن اُس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ہوا یوں کہ جس ورکشاپ میں عظیم کام کرتا تھا تو وہاں اس کا ایک کاریگر ساتھی تھا جس کا چندرہ دن کا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ اور مغرب کے بعد اُس کا جنازہ تھا۔ عظیم کو اپنے مقصد میں کامیابی نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ وہ جنازے کے ساتھ گیا اور بچے کی تدفین تک قبرستان میں موجود رہا۔ اُس نے سارا راستہ اور بچے کی قبر کی ارد گرد کی نشانیوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور گھر واپس آ گیا اور گھر جاتے ہی نسرین کو خوش خبری سنائی۔

دس ہزار کا بندہ بست یوں کیا کہ کچھ رقم ورکشاپ کے مالک سے بطور قرض لی اور پھر رقم اپنے جانے والوں سے اُدھار لی اور اس طرح دس ہزار روپے اکٹھے کر لیے۔ اُس نے ایک گھر چے، چھریے اور ہڈیاں کانٹے والے نوکے کا بندہ بست کیا اور ایک تھیلے میں ڈال کر رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

عظیم اور نسرین جس گھر میں رہتے تھے وہ ریلوے اسٹیشن کی شمال والی جانب تھا۔ اور قبرستان ریلوے اسٹیشن کی جنوب والی جانب تھا۔ آخری ٹرین رات ایک بجے

یہاں سے گزرتی تھی اور جب تک اُس کے بعد کسی ٹرین نے نہیں گزرا تھا۔ رات کے پونے دو بجے عظیم نے گرم کپڑے پہنے اور گرم چادر کی بھل مار کر تھپلا اٹھایا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔ آج عظیم ایک ایسا گھناؤنا کام کرنے جا رہا تھا جس کے آگے انسانیت شرمندہ ہو رہی تھی۔ عظیم اور نسرین دونوں شیطان کے پیروکار بن چکے تھے۔ ٹرین جا چکی تھی۔ اب عظیم کا راستہ صاف تھا اور وہ احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہالہ آخر اپنے مطلوب مقام یعنی اس بچے کی قبر تک پہنچ چکا تھا۔ جسے آج ہی مغرب کے بعد دفن کیا گیا تھا۔ عظیم نے جلدی جلدی کھرچے سے قبر کی مٹی ہٹائی اور سلیب اٹھا کر ایک جانب رکھ دی۔ معصوم بچہ قبر میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ عظیم نے کفن کھول کر نوکے کے ایک ہی وار سے مردہ بچے کا سر تن سے جدا کر دیا اور کاٹا ہوا سر ایک شاپر میں ڈالا اور سلیب واپس رکھ کر دوبارہ مٹی ڈال کر قبر بنادی۔ بچے کا سر، نوکے اور کھر پا تھیلے میں ڈالا اور اُسی راستے سے چلا ہوا رات کے تین بجے واپس گھر پہنچ گیا۔ عظیم کا سانس دھکنی کی طرح چل رہا تھا۔ سارا مرحلہ انتہائی کامیابی سے سرانجام پایا اور کسی نے عظیم کو یہ گھناؤنا اور قبیح فعل کرتے نہیں دیکھا تھا۔ رات کے اندھیرے میں عظیم نے انسانیت پر ایک کاری ضرب لگا کر خدا کے قبر کو آواز دی تھی۔ گھر آ کر عظیم نے اپنی بیوی نسرین جو کہ جاگ رہی تھی اور اُس کا انتظار کر رہی تھی تو دونوں نے مل کر نوکے اور چھریے کی مدد سے بچے کے سر کو کاٹ کر دماغ نکالا اور اُسے ایک جھوٹے سے برتن میں محفوظ کر لیا۔ سر کی باقیات کا قہر بنا کر شاپر میں ڈال دیا کہ صبح کچرے میں پھینک دیں گے۔

جیسے ہی صبح ہوئی تو عظیم اور نسرین اُس شیطان کے چیلے عامل کے ٹھکانے پر پہنچے اور بچے کا دماغ اور دس ہزار روپے اُس کو دے دیے۔ عامل نے کہا کہ وہ آج رات جنگل میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر مل اور چلے گا۔ تو تم لوگوں کے سب دل در در ہو جائیں گے۔ تمہاری مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ چنانچہ وہ خوش خوشی واپس گھر لوٹ آئے۔ اپنے اس گھناؤنے فعل پر بجائے شرمندگی محسوس

کرنے کے وہ آنے والی خوشحالی کے تصور میں بیٹھے تھے۔

☆☆☆

شاہ صاحب عمرہ کی ادائیگی کا مقدس فریضہ سرانجام دینے کے بعد واپس تشریف لائے تھے۔ حکیم اُن کی خدمت میں حاضر تھا۔ بہت سادے لوگ شاہ صاحب کو ملنے کے لیے آ جا رہے تھے۔ شاہ صاحب آنے والے تمام مہمانوں کی تواضع مدینے شریف سے لائی گئی کھجوروں اور آب زم زم سے کر رہے تھے۔ آنے والوں کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔

نماز عشاء کے بعد انھوں نے حکیم سے تفصیلاً ملاقات کی اور مراقبہ کیا تو شاہ صاحب بہت متفکر مضطرب اور پریشان ہو گئے تو حکیم نے پوچھا مہترم خیریت تو ہے؟ تو شاہ صاحب نے کہا کہ خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ آج کی رات بہت اہم اور بھاری ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پھر ایک طویل مراقبہ کیا اور فرمایا کہ آج کی رات فیصلہ کن رات ہے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ رب کریم کی مدد سے ہمیں کامیابی ملے گی۔

در اصل شاہ صاحب کے پاس نوری علم تھا۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ اللہ کے محبوب بندے تھے۔ انسانیت کی خدمت عبادت کچھ کر کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آج رات اپنے رب سے مدد مانگیں گے۔ انھیں مراقبے میں سب کچھ نظر آ گیا تھا۔ انھیں ادراک ہو گیا کہ شیطان عامل آج رات اپنے جادو سے چار جانوں کا قتل کرنے جا رہا ہے تو اُسے ہر حال میں روکنا تھا۔ لہذا شاہ صاحب نے میدانِ عمل میں آنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم کو تو کچھ نہیں بتایا اُسے کچھ تعویذ لکھ کر اور پانی دم کر کے دیا کہ گھر جا کر بیوی بچوں کے گلے میں تعویذ ڈال دو اور دم کیا ہوا پانی جسے میں آب زم زم کم کر کے دیا کہ اُن کو پلاؤ۔ تجوہ کھجوریں دیں کہ خود بھی کھاؤ اور بیوی کو بھی کھلاؤ اور تسلی دلا دے کہ حکیم کو کھر بیچ دیا۔ شاہ صاحب نے غسل فرمایا اور مسجد میں جا کر نوافل ادا کیے۔ پھر سوئے جسے رب کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور دعا مانگی۔

آج کی رات خیر اور شر کے ٹکرانے کی رات تھی۔

نوری علم اور جادو کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف شیطان جادوگر عامل چار جیتے جاگتے انسانوں کا قتل کرنے جا رہا تھا تو دوسری طرف اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ اپنے رب کی مدد سے انسانیت کو بچانے جا رہا تھا۔ آج کی رات بہت اہم اور فیصلہ کن تھی۔ کیونکہ جیت کس کی ہوتی ہے یہ صرف رب کو معلوم تھا۔ عامل جو عمل آج کرنے جا رہا تھا وہ بہت سخت اور کاریگر عمل تھا۔ اُس کا توڑ بہت مشکل تھا کیونکہ جو بھی اُس کے جادوئی عمل کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ ناکامی کی صورت میں اُس کی موت یقینی تھی اور اگر جادو کے عمل کو توڑنے والا کامیاب ہو جاتا تو جادوگر کی دردناک اور عبرت انگیز موت یقینی تھی۔

آج کی رات سردھڑکی بازی لگانے کی رات تھی۔ شیطان عامل کو اپنی جادوئی طاقت اور شیطانی علم کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ شاہ صاحب اس کے مقابلے پر آ چکے ہیں تو وہ کلیل کانٹے سے لیس ہو کر مقابلے کی تیاری کے لیے میدان میں آ آیا۔

اُس نے مردہ بچے کے دماغ میں کچھ اور حرام اور بلید اشیاء شامل کر کے اُسے سُر کی چر پی میں بھون کر کھایا۔ پھر آبادی سے دور کھلے آسمان کے نیچے ایک آگ کا بہت بڑا الاؤ جلا یا اور آگ کے قریب کالے بکرے کی کھال بچھا کر آتش پانی مار کر بیٹھ گیا۔ اور اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ خشک لکڑیوں کا ڈھیر اُس کے قریب رکھا تھا۔ جسے وہ ساتھ ساتھ آگ میں ڈال رہا تھا۔ جس سے آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ اُس کی مدد کے لیے شر بیچانے والے بہوت اور جن موجود تھے۔ جنھیں وہ ہدایات دے رہا تھا۔ اور اپنے مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ عامل وقفے وقفے سے مٹی بھرو کی چیز آگ پر پھینکتا جس سے آگ کے شعلے اور تیز ہو جاتے ساتھ ساتھ وہ تیز تیز اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ ماحول پر ایک ہیبت طاری تھی۔

عامل نے عظیم کو بھی بلایا ہوا تھا۔ وہ اُس کے سامنے بیٹھا خاموشی سے عامل کا عمل دیکھ رہا تھا۔ وہ دولت کے حصول کے شوق میں آنکھیں بند کیے عامل کی ہر بات مان رہا تھا اور شیطانی اور کفر کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اب آگ کو بھڑکانے کے لیے اُس میں لکڑیاں ڈالنے کی ڈیوٹی عظیم کی لگادی کہ آگ کے شعلے کم نہ ہوں

اس لیے وہ ساتھ ساتھ لکڑیاں ڈالتا جائے۔ ہڈیوں کا گودا جمادینے والی سخت سردی کی رات تھی۔ عامل اور عظیم دونوں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر آگ کی حرارت اتنی تیز تھی کہ عظیم کو پسینہ آ رہا تھا۔ عامل نے اب آنکھیں بند کر لیں اور اشلوک پڑھنے میں مگن ہو گیا۔

☆☆☆

شاہ صاحب نے نوافل کی ادائیگی کے بعد مسجد میں ہی اپنے گرد کلام پاک سے مضبوط حصار کھینچا اور بیٹھ گئے۔ اپنے سامنے قرآن پاک رکھا اور تلاوت فرمائی پھر قرآن پاک بند کر کے جادو کے توڑ کا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ عامل کی بھیجی ہوئی مخلوق شاہ صاحب کو ختم کرنے کے لیے اُن ہی کے قریب آنے کی کوشش کرتی مگر حصار کی وجہ سے نہیں پہنچ پاری تھی۔ شاہ صاحب خشوع و خضوع سے وظیفہ کا ورد جاری رکھے ہوئے تھے۔

جب شریعت بھوت شاہ صاحب تک نہ پہنچ جائے تو عامل کو غصہ آ گیا۔ اُس نے کوئی اور سخت اشلوک پڑھنے شروع کر دیے اور شاہ صاحب کے حصار کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگا۔ جن بھوت دوبارہ شاہ صاحب پر حملہ آور ہوئے۔ اب حصار کا کئی کمزور پوچکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ شیطانی مخلوق شاہ صاحب تک پہنچ پاتی شاہ صاحب نے فوراً ایک جلائی وظیفہ اور عمل کا ورد شروع کر دیا اور اس وظیفے میں قرآن پاک پر ایک مچھری رکھ دی جاتی ہے۔ یہ آخری عمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد خیر اور شر کی طاقتوں کے درمیان فوری اور فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس عمل اور وظیفے کے نتیجے میں دونوں میں سے ایک کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔ چونکہ شیطان کا عامل اب بھاری پڑ رہا تھا تو شاہ صاحب نے مجبوراً قرآن پاک پر مچھری رکھ کر جلائی وظیفہ شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد شیطان عامل پر غالب آ گئے اور عامل ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس کی زبان ایک دم گنگ ہو گئی۔ اشلوک پڑھنا بند ہو گیا تو جو جن بھوت اُس نے اپنی مدد کے لیے بلائے تھے وہ ایک دم غصے میں آ گئے اور پھر گئے اور پوری طاقت سے عامل پر حملہ آور ہوئے اور اُسے اٹھا کر اسی آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ عامل کو آگ لگ گئی اس کی دردناک چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

یہ ماجرا دیکھ کر عظیم حواس باختہ ہو گیا اور گھبراہٹ میں ایک طرف اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا اور بھاگتے بھاگتے ریلوے لائن پر آ گیا۔ عظیم سخت گھبراہٹ میں ریلوے لائن کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا مگر خوفناک آوازیں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ایک لخت اُسے شوکر لگی اور وہ ریلوے لائن پر گر گیا۔

اب اتفاق ہوا کہ رات ایک بجے والی ٹرین آ رہی تھی۔ انجن کے ڈرائیور لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ کوئی انسان لائن پر گرا ہوا ہے کیونکہ خوف، دہشت اور تیز بھاگنے کی وجہ سے عظیم گر اٹھا۔ اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ریلوے لائن پر اس طرح گر اٹھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں لائن کے اوپر تھیں اور دھڑ ایک طرف تھا۔ انجن کے ڈرائیور نے فوراً ایمر جنسی بریک لگائی مگر گاڑی رکتے رکتے عظیم کے اوپر سے گزر گئی اور اُس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ اور وہ درد اور تکلیف کی شدت سے تر سنے لگا۔ ٹرین رک چکی تھی۔ ٹرین کا عملہ فوراً نچے اتر آ۔ عظیم کی سانسیں چل رہی تھیں۔ عملے نے فوراً عظیم کو اسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسپتال کے عمل نے اُسے طبی امداد دینا شروع کر دی۔ عظیم کا بہت سارا خون بہہ چکا تھا۔ فوری طور پر اُسے خون کی بوتلیں لگا دی گئیں اور کئی ہوئی ٹانگوں پر بیٹیاں باندھ دی گئیں۔ عظیم پر بے ہوش غاری تھی۔

☆☆☆

شاہ صاحب نے وظیفہ مکمل کیا۔ اب ہر طرف سکون تھا۔ اُن کو اشارے مل چکے تھے کہ ڈھونگ شیطان عامل واصل جہنم ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب نے فوراً شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ مگر گڑا کے رونے لگے اللہ سے معافی اور توبہ استغفار کے بعد اُس پاک ذات کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ آج دھرتی ایک خبیث، شیطان جادوگر عامل کے وجود سے پاک ہو گئی تھی۔ اس جادوگر عامل کے شر سے خدا کی مخلوق بچ گئی تھی اُس نے بہت شر پھیلایا ہوا تھا۔ اُس کے جادو سے بہت سے لوگ پریشان تھے۔ کئی گھرانے تباہ و برباد ہوئے تھے تو آج وہ عامل اپنے بدترین انجام سے دوچار ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لیے واصل جہنم ہو چکا تھا۔ شاہ صاحب نے نماز تہجد ادا کی پھر

قرآن پاک کی تلاوت اور درود پاک کی کثرت سے تلاوت کی۔ نماز فجر کے لیے امامت کی اور نماز کے بعد پوری مخلوق کے لیے دعا خیر کی۔

☆☆☆

نسرین ساری رات جاگتی رہی اور پریشانی سے کمرے میں بھٹکتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ عظیم کا دور دور تک کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ چونکہ عظیم کی جیب میں اُس کی شناخت کی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی اور وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اور یہ پولیس کیس تھا تو پولیس نے شہر کی تمام مساجد میں عظیم کا حلیہ بتا کر اعلانات کرائے تو نسرین دوڑتی ہوئی ہسپتال پہنچی اور عظیم کی حالت کئی بوٹی ٹانگیں دیکھ کر اُسے غشی کا دورہ پڑ گیا۔ جس جگہ ریلوے لائن پر عظیم کی ٹانگیں کٹی تھیں وہاں پر پولیس نے معائنہ کیا اور ارد گرد کے علاقے میں گشت کی تو بہت جلد انھیں قریب ہی جادوگر عامل کی جلی ہوئی مسخ شدہ لاش مل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹروں کی کوشش سے نسرین کو ہوش آ گیا تھا تو پولیس نے اُس سے پوچھ گچھ کی تو اُس نے سارا ماجرا بیان کر دیا تو اس طرح اُس کے بیان کی روشنی میں تفتیش کی اور سارے معاملے کی تہمت پہنچ گئی۔

اگلے روز قومی اخبارات کے پہلے صفحے پر جادوگر عامل کے کاٹے کٹے توڑے اور اُس کے اندھ بھنگ انجام بد کی پوری تفصیل جلی حرف میں شائع ہوئی۔ معصوم بچے کی تبری بے حرمتی اور لاش کا سر کاٹ کر گھر لاکر دماغ دکھانے کے جرم میں عظیم اور نسرین کے خلاف پرجوش کر لیا گیا۔ نسرین کی نشاندہی پر بچے کے سر کی باقیات بھی برآمد ہو گئیں تو پولیس نے نسرین کو حراست میں لے لیا گیا۔

بھی دوڑا دوڑا ہسپتال پہنچا اور جب اُسے ساری صورت حال کا علم ہوا تو وہ ششدر اور حیران رہ گیا۔ تین دن کے بعد عظیم کو ہوش تو آ گیا مگر وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ پورا ایک ماہ ہسپتال میں رہا اس کا علاج ہوتا رہا اور علاج کا سارا خرچہ کلیم نے ادا کیا۔ کیونکہ آخر وہ اس کا ماں جابا بھائی تھا۔ عظیم اور کلیم کی والدہ بھی پورا ایک مہینہ ہسپتال میں رہیں اور عظیم کی تیمارداری کرتی رہیں۔ انہیں تمام واقعات جان کر بہت دکھ ہوا۔ وہ ہر وقت روتی رہتیں ایک تو بیٹے کی ٹانگیں

کٹ گئیں۔ دوسرا اُس کے اور نسرین کے کروت جان کر وہ لرز گئیں۔ جسے ہی عظیم کے زخم ٹھیک ہوئے پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا اور مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا۔ عظیم اور نسرین کو گھناؤنے جرم کی پاداش میں پانچ پانچ سال کی جیل ہوئی۔ صبحہ اور اُس کے دونوں بچے مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے تھے۔ کلیم کو اُس کے چھکے کی سرکاری کالونی میں بہترین مکان الاٹ ہو گیا اور وہ اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا۔

نسرین نے جیل میں ایک انتہائی بد صورت اور کربہ بچے کو جنم دیا۔ بچے کی شکل اتنی خوفناک تھی کہ اُسے دیکھ کر خوف آتا۔ نسرین کو وہ بچہ خود بھی بوجھ محسوس ہوتا اور وہ اُسے شدید نفرت سے دیکھتی۔ کوئی دو ماہ کے قریب وہ بچہ زندہ رہا پھر ایک دن مر گیا۔

سزا کی مدت پوری ہونے کے بعد عظیم اور نسرین کو رہا کر دیا گیا۔ نسرین تو اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی اور عظیم سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ عظیم اور نسرین کے جیل جانے کے بعد کلیم نے نسرین کے جہیز کا سارا سامان اُس کے میکے بھیج دیا تھا۔ عظیم کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ گوکہ رہائی کے بعد کلیم اُسے اپنے گھر لے آیا مگر وہ اب کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ بھی بھی وہ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے تو بہت روتا ہے اپنی ماں سے کلیم سے اور صبح سے بہت معافیاں مانگتا ہے۔ بھی بھی اُس کا ذہنی توازن گبڑ جاتا ہے اور بالگوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ وہ حسرت واپس کی ایک چٹنی پھرتی تصویر ہے۔ وہ اکثر اپنی کئی ہوئی ٹانگیں گھٹینا ہوا ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چلا جاتا ہے اور سارا دن آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر شام کو کلیم اُسے اپنی سرکاری گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آتا ہے۔ کلیم کی ترقی ہوئی وہ اب بڑا افسر بن گیا ہے اور اُسے سرکاری گاڑی بھی مل گئی ہے۔ نسرین کے اندر جلنے والی حد کی آگ نے اُسے اور عظیم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

نسرین آج بھی اپنے میکے میں بیٹھی ہے۔ وہ اپنے بھائیوں اور بھائیوں کی نوکرائیوں کی طرح خدمت کرتی ہے۔ صبح سے رات تک گھر کے کام کرتی ہے۔ اُس کی دوبارہ شادی نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ اپنی حد کی آگ میں جل رہی ہے۔

☆☆☆

زہر عشق

خوف اور رگوں میں لہو بھادینے والے مناظر سے بھر پور، عشق کی ایک ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 13

کون ہے کی آواز نگران کے حلق سے نکلی۔ وہ نیند میں تھا مگر اسے پھر بھی ڈر محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ مگر اسے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر کمرے کی لائٹ چلا دی۔ اور اسے کمرے میں موجود چیزیں صاف دکھائی دینے لگیں لیکن اس کے بعد بھی کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق اسے نظر نہیں آئی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی بلی وغیرہ اندر گھس آئی ہو۔ اس خیال کو بھی اس کے ذہن نے فوراً ہی رد کر دیا کیونکہ اس کے کمرے میں کسی بھی ایسی چیز کا داخل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ کھڑکیاں اور دروازے بہت اچھی طرح بند کر کے ہی سویا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی کھڑکی کسی بھول کی وجہ سے کھلی رہ گئی ہو۔ اس نے سوچا اور آہستہ روی سے چلتا ہوا وہ ایک ایک کمرے کے کمرے کی سب ہی کھڑکیوں کے پاس گیا اور انھیں ہاتھ سے دھکیل کر یہ دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی تو نہیں ہے۔ اسے کوئی بھی کھڑکی کھلی ہوئی نہیں ملی۔ اس نے اچھی طرح سب کھڑکیوں کی کنڈی وغیرہ چیک کی اور ایسا کرنے کے بعد اسے ایک اطمینان تو ضرور ہوا کہ کوئی کھڑکی کھلی ہوئی نہیں تھی۔ پھر وہ دروازے کی طرف گیا اور اسے بھی اچھی طرح چیک کرنے لگا دروازہ بھی اسی طرح بند تھا جیسے ہمیشہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کھٹکا کس چیز کا تھا۔ اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ہوا سے ہونے والی کسی آواز کو تو باہر سے آنا چاہیے تھا اور اس نے آواز کمرے کے اندر سے سنی تھی۔ اس بات کا اسے یقین تھا لیکن حالات و واقعات نے اس کے یقین کو متزلزل کر دیا اور اسے یہ ماننا ہی پڑا کہ یہ سب اس کا وہم تھا یا پھر اس نے کوئی ایسا خواب دیکھا تھا جو اب اسے ذرا سا بھی یاد نہیں تھا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خواب یاد نہیں رہتے۔ سب طرح کے اطمینان کے بعد وہ پھر سے اپنے بستر پر آکر بیٹھ گیا اور دوبارہ سے لیٹنے کا سوچنے لگا۔ ابھی وہ لیٹنے کے لیے پاؤں پھیلانے والا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں ایک کھٹکا ہوا۔ اس نے کمرے کے اندر ایک اور چھوٹے سے کمرے کے بارے میں سوچا جس میں مدرسے کے ریکارڈ اور حساب کتاب کی ضروری چیزیں حفاظت سے رکھی جاتی تھیں۔ اس کمرے کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا اگر کوئی یہ جانتا بھی تھا کہ اس کے کمرے میں ایک اور ریکارڈ روم کے طور پر استعمال ہونے والا خفیہ کمرہ ہے تو یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس ریکارڈ روم میں کیا کچھ رکھا ہوا تھا اور کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی تھی۔ یہ

صرف نگران ہی جانتا تھا اور وہ ہی اس کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ البتہ اس کمرے کی ایک چابی بورڈ کے ہاتھ
ایگزیکٹو کے پاس بھی تھی اور یہ اس احتیاط کے طور پر کیا جاتا تھا کہ اچانک نگران کا انتقال ہو جائے اور نگران کے
پاس موجود چابی بورڈ کو نہ ملے تو اس اسپتیر چابی سے ریکارڈ روم کو کھولا جاسکتا ہوتا کہ مدرسے کا نظام ٹھیک طرح
چلتا رہے اور اس میں کوئی تاخیر نہ ہو سکے۔ بصورت دیگر نگران کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی
تھی کہ اس کمرے میں کسی کو جانے کی ضرورت پڑتی ہو۔ جس بھی فائل کی ضرورت پڑتی تو نگران خود لا کر دے دیا
کرتا تھا یوں بھی بورڈ کی میٹنگ مدرسے میں شاذ ہی ہوتی تھی۔ یہ میٹنگ شہر کے کسی بڑے اور مشہور ہوٹل میں ہوا
کرتی تھی جہاں نگران اپنے ساتھ ایجنڈے کے مطابق ضروری فائلیں لے کر جایا کرتا تھا۔ موجودہ نگران کوئی پچھلے
بارہ سال سے موجود تھا اور اس کی کارکردگی سے بورڈ کوئی شکایت بھی نہیں کی ان کی متفرد رائے میں وہ جو کچھ بھی
کر رہا تھا وہ ہی ٹھیک تھا۔ اس لیے بڑھتے بڑھتے نگران کی خود اعتمادی ایک قسم کے تکبر میں داخل ہوئی۔ اس کا نام
اکرام اللہ تھا۔ پہلے پہل وہ ایسا نہیں تھا قدرے معقول انسان تھا اور طالب علموں کے معاملے میں بھی اس کا رویہ
مشفقانہ نہیں تو اتنا سخت گریہ بھی نہیں تھا لیکن جیسے جیسے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے اس پر ایک قسم کی
انانیت بھی طاری ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کوئی بھی چیز چاہے وہ کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو اس کا کوئی نہ کوئی تنفی پہلو بھی
ضرور ہوتا ہے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا معاملہ بھی یہی ہے اگر اس کا جائزہ نہ لیا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ کب تکبر
اور غرور کی سرحدوں میں داخل ہو گئی۔ خود اعتمادی انسان کی اگر کبھی کسی معاملے میں سبکی ہو جائے تو اسے انتقامی غصہ
نہیں آتا وہ اپنے کیے ہوئے فعل کا جائزہ لیتا ہے کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اسے سبکی کا سامنا کرنا
پڑا ہے۔ زیادہ حساس ہوتا ہے سانسے جیتنے والے کو مبارک باد دے کر اپنی سبکی کو برتری میں بدلنے اور زیادہ اچھا
انسان بننے کی جستجو کرتا ہے لیکن اگر خود اعتمادی کا جائزہ بروقت نہ لیا جائے تو وہ ایک قسم کے انتقامی جذبے میں تبدیل
ہوتی رہتی ہے ایسا آدمی اپنی بار کو کبھی تسلیم نہیں کرتا اور انتقامی انداز میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور اس قسم کے
انسان کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ اصرار ضرور کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا انسان اپنی شان اور خود کے اختیارات کو ثابت
کرنے کے لیے چھوٹی موٹی زیادتی بھی محض دکھاوے اور اپنی طاقت کی نمائش کی خاطر کرتا ہے تاکہ لوگ بھول نہ
جائیں کہ وہ کس قدر با اختیار ہے۔ داخلی طور پر ایسے انسان کی اپنی انا کو کبھی ایسا کر کے سکون ملتا ہے۔ اس وقت
اکرام اللہ کی حالت بھی یہی ہوئی تھی اسے سلمان کے معاملے میں جو شکست ہوئی تھی۔ سلمان کے جس طرح اس کا
بچھایا ہوا جال جس میں اس سے مشکل مشکل اور ایسے سوالات کیے تھے جن کا جواب اس درجے کا کوئی بھی طالب علم
دے ہی نہیں سکتا تھا مگر سلمان نے وہ سارے جواب بڑی سہولت سے دے دیے تھے۔ نگران کو پورا یقین تھا کہ اس
امتحان کے بعد سلمان کو مدرسے سے بے دخل کرنا بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا اور سلمان کے سب سے بڑے حمایتی ابو
ریحان بھی خاموش ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس سلمان کے جوابات نے نگران کے سارے منصوبوں پر
پانی پھیر دیا اور اسے لگا کہ اتنے سارے اہم لوگوں کے سامنے اس معمولی لڑکے نے اسے نچا دکھا دیا ہے۔ اب وہ
اپنے ہی اس امتحان میں پھنس گیا سلمان کو مدرسے سے نکالنے کا جواز ختم ہو گیا۔ تو اس نے سلمان کے خلاف نئی
سازش کا حال بنا اور اس بار سلمان کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا نہ ہی اسے کسی میٹ یا کسی
امتحان سے گزارا گیا کیونکہ اس بار نگران کسی بھی طرح شکست کھانا نہیں چاہتا تھا وہ ویک جنس قلم سلمان کو مدرسے
سے نکالنا چاہتا تھا چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ ابو ریحان چونکہ سلمان کے سب سے قریب
سمجھے جاتے تھے اور وہ وقت بے وقت سلمان کی طرف داری کیا کرتے تھے تو انھیں یقین تھا کہ اس طرح اگر سلمان
چلا گیا تو انھیں بھی اس مدرسے میں چین سے جینے نہیں دیا جائے گا کیونکہ نگران اکرام اللہ کی کینا پروری سے وہ اچھی
طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے خود ہی مدرسے سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

نگران دوسرے خفیہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کر خیال میں نہیں حقیقت میں

اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اس کی خفیہ ریکارڈ والی تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے
سارے ضروری کاغذات غائب تھے۔ وہ ایک دم سے جیسے پٹا گیا اس نے جلدی جلدی سارے کمرے کو الٹ
پلٹ کر دیکھا لیکن وہ سارے کاغذات جو ٹھیکہ داروں سے اس کے کشین کھانے کا ثبوت فراہم کرتے تھے وہ سب
کے سب غائب تھے اس کا سیدھا مطلب تھا کہ اب اس کی مدرسے سے صرف ملازمت ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ اسے
لاپل کر کے اس طرح نکالا جائے گا کہ دوسروں کو بھی اس کی سزا سے عبرت ہو اور بھاری جرمانہ بھی کیا جائے گا جو وہ
کسی بھی طرح ادا نہیں کر سکے گا اور اس کے بعد اسے شہر کی اور مدرسے میں بھی ملازمت نہیں ملے گی سمجھو تو اس کی
موت واقع ہو چکی تھی۔ اس کی پریشانی چھت کو لگ رہی تھی اور وہ بار بار اپنی دائرہ اور سر کے بال نوچ رہا تھا لیکن
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیسے ہو گیا اور اب اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے سارے گھر میں اور دونوں کمروں
میں بار بار گھوم پھر کر دیکھا لیکن گھر کی بھی جگہ سے چور کے داخل ہونے کے کوئی نشانات نہیں مل رہے تھے۔ تمام داخلی
دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں تو پھر چور یا کس راستے سے تھا۔ وہ بار بار سوچتا اور بار بار اسے اپنی سوچ کی دوران
گنبد میں گھوم کر واپس آتی ہوئی سنا دیتی۔ عجب نہیں تھا کہ وہ زور زور سے سر پٹک کر بین کارنا شروع کر دے مگر
اس سے حاصل تو کچھ نہیں ہونے والا تھا اگر وہ ایسا کرتا بھی اور مدرسے کی جملہ انتظامیہ کو یہ یقین بھی دلاتا کہ اس کے
حجرے میں چوری ہو گئی اور اس کا سارا ریکارڈ چوری ہو گیا ہے تب بھی سزا تو اسی صورت میں ہی سکتا تھا جب
اسے یہ یقین بھی ہوتا کہ چور ان کاغذات کو بورڈ کے ممبران کے سامنے پیش نہیں کرے گا ورنہ پیسے کی چوری ہوتی تو
وہ خود کو یقین دلاتا کہ چور جو کچھ لے گیا اس کے بعد اب بھی یہاں واپس نہیں آئے گا لیکن یہ تو اس کے ضروری
اور خفیہ کاغذات کی چوری تھی اور انھیں چرانے کا بس ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اسے ذلیل کر کے مدرسے سے
بے دخل کروانا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ سارا وقت یہ سوچنے میں گزار دیتا کہ چور اس کے حجرے میں داخل کیسے ہوا
کیونکہ یہ بہت بڑا اچھا تھا کہ چور کے داخل ہونے کا کوئی نشان کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اور چوری بھی سب کچھ
ہو چکا تھا نہ حتیٰ کہ اس کی تجوری کا تالا ٹک ٹوڑا نہیں گیا تھا بلکہ وہ کسی ایسی تالے کی چابی سے کھولا تھا جس سے وہ کھلا
کرتا تھا۔ لیکن اس کی بروقتی ہوئی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ چابی اس کی جس جیب میں رکھی ہوئی وہیں
رکھی ہوئی تھی۔ پھر یہ تالا کیسے کھلا اس کا مطلب ہے چور کے پاس اس تجوری کے تالے کی کوئی اور چابی بھی تھی جو
ناممکن بات تھی لیکن اس وقت اس بات پر یقین کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”یہ تو واقعی ناقابل یقین ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نگران اتنا بڑا ایمان، بدنیت اور بددیانت انسان
ہے۔ اس نے سلاٹز سے کس قدر کشین کھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مدرسے کی آمدنی کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے وہ اس
بدعنوانی کا بھی مرتکب ہوا ہے کہ اس نے طالب علموں کے والدین سے عذر بہانوں سے روپا اٹھا ہے اس نے مدرسے کو
ملنے والے چندے اور کھالوں میں بھی خرد برد کی ہے میں تو حیران ہوں۔ مجھے اس کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے کہ
میں کیا کہوں کیسے اتنے عرصے سے اتنا گرا ہوا آدمی اس پاکیزہ جگہ کا نگران بنا ہوا سب ہی کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا
تھا اور اپنے کیے پر پشیمان ہونے کے بجائے چھانی چوڑی کیسے وہ اسے دندنا تا اور غراتا پھرتا تھا جیسے نعوذ باللہ وہی اللہ
تا تعالیٰ کا سب سے نیک بندہ ہے۔ تف ہے اس کی انسانیت اور مسلمان ہونے پر۔ میرا بس چلے تو ایسے انسان کو میں سر
عام کوڑے لگوؤں اور سوئی پر ٹانگ کر اس کی لاش کو درس عبرت بنا دوں۔“ غصے سے چھنکارتے ہوئے ابو ریحان جانے
کیا کیا کہتے رہے اور سلمان ان کی باتیں اطمینان سے سننے کے بعد بولا۔

”تو آپ کو کس نے روکا ہے کچھ وہ سب جو آپ کرنا چاہتے ہیں“

”کیا مطلب..... میں کچھ سمجھا نہیں؟“ انھوں نے گہری آنکھوں سے حیران ہو کر سلمان کی طرف دیکھا۔

”یہ سب کچھ بورڈ کے ممبران کے سامنے آپ ہی پیش کریں گے۔ جب آپ یہ ثبوت فراہم کر دیں گے تو پھر

سزا بھی آپ ہی تجویز کیجئے گا۔“ سلمان نے اسی اطمینان سے کہا۔ اور یحسان چونکتے ہوئے بولے۔

”میں... میں کیسے کر سکتا ہوں۔ وہ پوچھیں گے کہ مجھے یہ ثبوت کہاں سے اور کیسے ملے تو میں کیا جواب دوں گا؟“

”جواب سارے میں آپ سمجھا دوں گا آپ فکر مت کیجیے۔“

سلمان کی بات سن کر انھیں جیسے کوئی اور بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی انھیں صاف محسوس ہوا کہ یہ لڑکا لمبے معمولی طاقتوں کا حامل انسان ہے اور یہ وہ سب بھی جانتا ہے جو کوئی نہیں جانتا۔ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ اذان کا وقت ہو گیا اور دونوں خاموشی سے مسجد کی طرف چل دیے۔ دونوں وضو کر کے مسجد میں پہنچے تو اذان کا دھماکا علموں کے علاوہ نگران بھی وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ٹھیک سے جم نہیں رہے تھے وہ کچھ نوافل کے لیے کھڑا ہوا تھا اور جب وہ کھڑا ہو کر رکوع اور سجود میں جاتا تو صاف ہٹا چلتا تھا کہ اس کے پیروں میں کچھ طاری تھی وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور جرائم کی معافی مانگنے کو نماز پڑھ رہا تھا۔ سلمان اور ابوریحان نے معنی تیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور جائے نماز پر کھڑے ہو کر نماز کی نیت باندھ لی۔

نماز ختم ہونے کے بعد بھی نگران ہمیشہ کی طرح مسجد سے باہر نہیں آیا۔ بلکہ اسی جگہ بیٹھا آہ و زاری کرتا رہا۔ اب ابوریحان کے باہر کی طرف جاتے ہوئے قدم ختم گئے اور وہ واپس پلٹے۔ محل سے چلتے ہوئے نگران سے پاس پہنچے اور بولے۔

”اب کوئی فائدہ نہیں ہے اکرام اللہ! اتنا سننا تھا کہ اکرام اللہ ایسے چونکا جیسے اسے کسی سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے خوف سے پھٹکنی ہوئی آنکھوں سے ابوریحان کی طرف دیکھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ابوریحان کو اس لب و لہجے پر بات کرنے سے ابھی خاصی سخت سنا تا لیکن اس وقت وہ کلی آنکھوں سے بس دیکھتا رہا۔

”تمہارے گناہوں اور جرائم کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ اب مدرسے سے میں اور سلمان نہیں تمہیں جانا ہوگا۔“

نگران کی آنکھیں مزید پھیل گئیں اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ ابوریحان کو اس کے کالے کوتوتوں کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔

”کہا تھا نا اس لڑکے سلمان کو تنگ مت کرو۔ لیکن تم طاقت کے نشے میں چور تھے تم نے میری ایک نہیں سنی اب وقت آ گیا ہے کہ تمہاری طاقت کا سوسنا مسامحہ کر دیا جائے۔“

”کون کرے گا؟“ بڑی عجلت اور غیر ارادی طور پر نگران کے منہ سے اتنی دیر میں بس یہی ایک جملہ نکلا۔

”وہ ہی کرے گا جس نے تمہارے راز کو طشت از با م کیا ہے۔“ ابوریحان نے کہا۔

”تو کیا میرے حجرے سے چوری تم نے کروائی ہے؟“ ابھی جیسے گرتی ہوئی دیوار میں کچھ دھمک باقی تھی۔

”میں کیا جانوں کہ تم نے کیسے کیسے جرائم کا پہاڑ اپنے حجرے کے خفیہ خانوں میں چھپا رکھا ہے یہ تو وہی جانتا ہے جو تمہارے ایسے سوالوں کے جواب بھی دے سکتا ہے جن کا جواب اس کے درجے کے کسی طالب علم کو نہیں آتے۔“

”سلمان“ اس کے منہ سے ایسے نکلا جیسے کسی بھوت کا نام ہو۔

”ہاں سلمان... میں نے کہا تھا اس لڑکے کو پریشان مت کرو۔ وہ مدرسے کا سب سے ذہین طالب علم ہے وہ ایسا کچھ بھی جانتا ہے جو میں اور تم بھی نہیں جانتے۔ لیکن تم اپنی طاقت اور اختیارات کے نشے میں چور یہ سمجھتے تھے کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اب اس کے سامنے بارہا ٹھیک کر آہ و زاری کرتے ہو جو سب کا سب کچھ بگاڑ بھی سکتا ہے اور سنوار بھی سکتا ہے۔“ اتنا کہہ کر ابوریحان تیزی سے وہاں سے اٹھ آئے۔ اسی تیزی سے نگران بھی ان کے پیچھے لپکا۔ اب منظر یہ تھا کہ ابوریحان آگے آگے جا رہے تھے اور نگران ان کے پیچھے پیچھے جلدی جلدی ایسے چل رہا تھا جیسے اس کے دل و دماغ میں ابوریحان کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ منظر نگران کی حیثیت سے اس کے لیے ایک قسم کی بے عزتی پر محمول کرتا تھا۔ اگر رات والا واقعہ نہ ہوتا تو نگران ایسے ابوریحان کے پیچھے جانے کے

ہماتے انھیں اسے آفس میں بلواتا۔ ابوریحان کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ اس طرح نگران کو اپنے پیچھے کسی سوالی کی طرح آتا دیکھ کر قہقہی اسے نظر انداز کرتے ہوئے چلتے چلے جاتے۔ مسجد سے نکلنے والے سب ہی لوگوں نے یہ عجوبہ نظر دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن ابوریحان جانتے تھے کہ کل تک فرعون کی طرح اپنے احکامات منوانے والا نگران اب کسی معمولی کڑے کا ڈرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ وہ اس کا کچھ چٹھا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے ذہن میں سلمان کی غیر معمولی طاقتوں کے بارے میں بھی بہت سوالات تھے لیکن اس وقت وہ صرف نگران کی کمزور ہوئی ہوئی طاقت کا حوالہ رہے تھے اور اس کے علاوہ کچھ اور سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ رات کے اندھیرے دامن کو صبح کی گہلی ہوئی روشنی نے تار تار کرنا شروع کر دیا تھا۔ موسم قدرے خشک تھا۔ اسی لیے نگران کو اپنا منہ ایک چادر میں چھپانے کا آسرا مل گیا تھا۔ ابوریحان طویل غلام گردنوں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور چاہتے تھے کہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیں لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ نگران ان سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں نگران ان کے دروازے پر پہنچ گیا اور دروازے کو کھلا دیکھ کر بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ بنا دستک کے اندر داخل ہو سکتا۔ دستک کی آواز سن کر ابوریحان نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ نگران پہلے تو ان کے سامنے خاموش کھڑا رہا پھر نہایت عاجزی سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں آپ میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہیں اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ فرشتے میرے خلاف ہو چکے ہیں ورنہ جس طرح میرے حجرے میں چوری ہوئی ہے یہ کسی انسان کے بس کا کام نہیں تھا۔“

”جب جان ہی چکے ہو تو میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“ ابوریحان نے کسی کی ہلنی کے بغیر ساٹ لہجے میں کہا۔

”کیا آپ میری مدد کرتے ہوئے مجھے اس مصیبت سے بچانے کی ہلنی سی کوشش بھی نہیں کریں گے؟“ وہ گھٹکیا۔

”نہیں“ ابوریحان نے کہا۔

”آپ تو بڑے نرم اور کشادہ دل ہیں ابوریحان۔ مجھے آپ سے ایسی گریز پائی کی امید نہیں ہے۔“ وہ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

”ابھی تم نے خود ہی کہا کہ یہ فرشتوں کا کام ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ تمہاری بدعنوانیوں کا پردہ چاک کر سکتا۔ جب اتنا جان چکے ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو کہ فرشتے اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے یہ اللہ کا حکم ہے اور میں اللہ کے حکم کے راستے میں آنے یا اسے تبدیل کرنے کی نہ ہی طاقت رکھتا ہوں اور نہ ارادہ۔“ ابوریحان نے جیسے دو ٹوک اسے بتا دیا کہ اب جو کچھ بھی ہونے والا ہے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

”ٹھیک کہتے ہیں آپ میں اللہ کے عتاب میں ہوں اور اللہ سے ہی مجھے معافی مانگنا چاہیے لیکن اللہ بھی تو رحم اپنے بندوں کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ آپ اس کے نیک صفت بندے ہیں آپ چاہیں تو مجھے اس مشکل گھڑی میں ملنے والی بے عزتی سے بچا سکتے ہیں۔“ وہ خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اکرام اللہ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جاسکتا ہو۔ تمہیں سزا سے گزرنا ہی ہوگا۔ اور اب جب کہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اللہ کی مرضی ہے کہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا ملے تو پھر میں سچ آنے والا کون ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا ہے تمہیں اس کی سزا اچھلتا ہوگی۔“ ابوریحان کی بات سننے کے بعد جیسے اکرام اللہ کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش ختم ہو چکی تھی لیکن وہ پھر بھی کمرے میں رکا رہا تو ابوریحان کو اسے مزاج کے برعکس اس سے یہ کہنا ہی پڑا کہ اب تم جاسکتے ہو۔ وہ پھر بھی کس سے مس نہ ہوا۔ ”میں نے کہا اب تم جاسکتے ہو۔“ ابوریحان نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”کیا میں سلمان سے مل سکتا ہوں؟“ کمرے میں دیر تک ایک کشش کا ساما حول رہا۔ جسے اکرام اللہ کے اس

سچے کہانیان

سچے کہانیان

سوال نے درہم برہم کیا۔

”سلمان سے ملنے کے لیے تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے“ ابوریحان جانتے تھے سلمان سے اس مسئلہ میں ملنا بے سود ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ تو شاید کچھ نری اور رحم وغیرہ سے کام لے لیتے لیکن سلمان نے انھیں سختی سے منکر کر دیا تھا کہ وہ کسی قسم کی نری اور ہمدردی سے کام نہ لیں یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید بھی اس آدمی کو دوبارہ اس طرح ہلا نہیں جاسکے گا۔ اس لیے صاف صاف اس سے کہہ دیجئے کہ اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔

”اچھا میں سلمان سے مل لیتا ہوں“ یہ کہہ کر وہ سر جھکائے آہستگی سے چلتا ہوا۔ جیسے ہر قدم اٹھاتے ہوئے یہ سوچ رہا ہو کہ شاید کوئی ایسا لمحہ ہو جب ابوریحان کے دل میں رحم کا جذبہ سر اٹھائے اور وہ اسے روک کر اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر ان وہاں سے تو ایسے نکلا جیسے اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہو لیکن ابوریحان کے کمرے کے دروازے سے نکلتے ہی اس کے پیروں میں پیسے لگ گئے اور وہ اپنی پوری تیزی کے ساتھ سلمان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

شرجیل نے اپنے والد سرفراز ملک سے اپنے دل کی بات کہہ کر تو دی لیکن کیا اس کے لیے کورٹ میرج کرنا ممکن ہوگا۔ یہ سوچ اسے سارا وقت ستاتی رہی کیونکہ اس طبقے میں اس قسم کی رومانوی جبارت کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا یہاں سب کچھ پیسوں اور حیثیتوں کے ترازو میں تولتا جاتا ہے اور غرض اور مطلب کے آئینے میں اسے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی شادی کا تصور بھی موجود نہیں تھا کیونکہ اس کا مطلب ہے باپ کی طرف سے ہر قسم کی جائداد اور پانی پیسے سے عاق کر دیا جانا اور اپنے بل بوتے پر زندگی شروع کرنا۔ اس بات کی اجازت خود صنوبر کے گھر والے بھی اسے کسی قیمت پر نہیں دیں گے اور گھر والوں کی مرضی کے بغیر ان کے لیے اتنا بڑا اقدام اٹھانا کوئی خالد جی کا گھر نہیں تھا۔ لیکن وہ اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ اس کا باپ فاروق رحمان کے باپ کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا وہ کسی بھی قیمت پر اپنی محبت کی یہ بازی جیت نہیں سکے گا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کمرے میں اسی ادھیڑ بن میں رہا پھر اسے اپنے دروازے پر دستک سنا دی وہ سمجھا اس کا نوکر ہے اور کھانے کا پوچھنے آیا ہے لیکن یہ دیکھ کر اسے کافی حیرانی ہوئی کہ وہ اس کے والد سرفراز ملک تھے۔

”میں سمجھتا ہوں تم ایک بار اور خنڈے دل سے سوچ لو۔ یہ بات کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ رحمان ہمیں برباد کر دے گا اگر ہم نے اس کے بیٹے کی خوشیوں کو اس سے چھین لینے کی کوشش کی تو“ سرفراز ملک خاموشی سے کونے میں بڑی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے سے لگتا تھا کہ بیٹے کے ارادے کے سامنے جم کے کھڑے رہنے کے بجائے بیٹے کو اس بات کا احساس دلانے آئے تھے کہ جو وہ کرنا چاہتا ہے اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں اور ان نتائج کے بدلے میں اس کے خاندان کو کیا قیمت چکانی پڑ سکتی ہے۔

”اسی لیے کہتا ہوں آپ مجھے کورٹ میرج کرنے دیجئے۔ اس طرح آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا آپ کہہ دیجئے گا کہ میں نا فرمان ہو چکا ہوں اور آپ کی بات بھی نہیں مان رہا۔“ شرجیل کو بھی باپ کے رویے کی وجہ سے یہ ہمت ہوئی کہ وہ انھیں اس طرح کی بات کہہ سکے جو کسی قدر دوستانہ راستا نکلنے کی کوشش تھی۔

”تم رحمان کو اور اس کے بیٹے فاروق کو نہیں جانتے۔ میں اگر تمہیں عاق کرنے کا ڈراما کروں اور در پردہ تمہاری مدد کرتا رہوں۔ تمہاری کورٹ میرج کے بعد تب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ تمہیں آسانی سے جینے کی اجازت دیں گے وہ تمہارا جینا حرام کر دیں گے۔ اور کاروبار کو تو تمام صورتوں میں نقصان پہنچ کر رہے گا اس باپ بیٹے کو اس بات کا یقین کبھی نہیں آئے گا کہ میں نے تمہیں اپنے کاروبار اور زندگی سے الگ کر دیا ہے۔“ سرفراز ملک بیٹے سے اس کی مرضی کا حل معلوم کرنے نہیں بلکہ اسے اپنی مرضی پر راضی کرنے آئے تھے۔

”جب تو اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ لیکن جو بھی ہو میں صنوبر کو چھوڑ نہیں سکتا اگر میں نے ایسا کیا تو سمجھ

لے میں جی نہیں سکوں گا۔ کیا آپ کو یہ منظور ہوگا؟“ شرجیل کو خود نہیں پتا تھا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی وہ اپنے باپ کے سامنے زندگی میں پہلی بار اس طرح اپنے دل کی بات کھول کھول کر بیان کر رہا تھا۔

”ایسا کیا ہے اس لڑکی میں جو تم جینے مرنے کی بات کر رہے ہو ہماری کلاس میں اس قسم کی باتوں کو حماقت سمجھا جاتا ہے۔“ سرفراز ملک نے ایک بار اور بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اب آپ اس قسم کی باتیں مت کہئے ڈیڈی جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“ شرجیل کو فوری طور پر جیسے غصہ آنے لگا۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟“ سرفراز ملک نے بیٹے کے بگڑتے ہوئے تیوروں کو غور سے دیکھا۔

شرجیل نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ صنوبر سے محبت کرنا اتنا بڑا اور لائیکل امتحان بن جائے گا۔ جس میں ہر طرف سے راہیں مسدود ہو جائیں گی اور اس کے خاندان کی تباہی کے علاوہ اور کوئی چارہ باقی نہیں رہے گا۔ اس کے پاس باپ کے سوال کا اس وقت کوئی جواب نہیں تھا اور جب جواب تھا ہی نہیں تو وہ کیا جواب دیتا اس لیے بس چپ رہا۔ دل کی دھڑکن مسلسل یہ دوہرائی رہی کہ صنوبر سے کہ صنوبر سے بے وفائی کر کے وہ بھی خوش اور زندہ نہیں رہ سکے گا یہ تصور ہی جان لیوا تھا کہ صنوبر کسی اور کی ہو جائے اور بس دیکھتا رہے۔ طویل خاموشی کے بعد سرفراز ملک نے اندازہ لگا لیا کہ بیٹے کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اس لیے وہ خاموشی سے اٹھے اور کمرے سے چلے گئے۔ اسی وقت صنوبر کی موبائل پر کال فلیش ہونے لگی وہ چاہتے ہوئے بھی یہ کال نہیں لے سکا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت جب وہ ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے صنوبر سے کیا کہے گا۔ اس لیے اپنا دل مسوس کے رہ گیا اور فون بج بج کے بند ہو گیا۔

☆☆☆

صنوبر کے لیے یہ بات کسی بڑے صدمے اور پریشانی سے کم نہیں تھی کہ شرجیل اس کی کال ریسپونڈ کرے۔ وہ دیر تک اس بارے میں سوچتی رہی کہ ایسا کیا ہوا ہے یہ تو شرجیل کے سونے یا کسی بھی مصروفیت کا کوئی موقع نہیں ہے پھر کیوں اس نے اس کی کال ریسپونڈ نہیں کی۔ مگر اسے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اسی وقت درشہوار اسے آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن صنوبر اپنی پریشانی میں اس قدر غرق تھی کہ اسے اپنی ماں کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ درشہوار سمجھتی کہ وہ ضرور کسی بڑی پریشانی کا شکار ہے۔

”کیا بات ہے بیٹے تم کچھ پریشان ہو؟“ درشہوار سے رہا نہیں گیا۔

”نہیں کوئی بات نہیں ہے“ صنوبر نے جیسے انھیں نالٹا جانا۔

”کوئی تو بات ہے جو تم اپنی ماما کو بتانا نہیں چاہتیں“ درشہوار کی تشویش بڑھنے لگی۔

ماں کی بات سن کر صنوبر ایک دم چٹک پڑی اور اس کے آنسوؤں نے درشہوار کو اتنا تو سمجھا دیا کہ بیٹی کسی معمولی نہیں کسی زیادہ ہی بڑی پریشانی کا شکار ہے۔

”پلیز صنوبر اس طرح روؤ تو موت مجھے بتاؤ کیا بات ہے میں تمہاری ماں ہوں اور تمہاری مدد مجھ سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ درشہوار نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا صنوبر ماں کے سینے لگ کر پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگی۔ اور پھر کتنی ہی دیر وہ اسی طرح روتی رہی۔ درشہوار اس کے دل ہلکا ہونے پر اسے منہ دھوئے اور فریٹش ہونے کا کہہ کر اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ درشہوار کو چائے کی طلب ہی صنوبر کے کمرے تک پہنچ کر لائی تھی وہ پوچھی صنوبر سے پوچھنے چلی آئی کہ وہ لڑکا حماد کب تک وہاں آئے گا وہ اگر کچھ جانتی ہے تو اسے ضرور بتائے اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی بیٹی کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ چائے بناتے ہوئے بھی وہ سارا وقت بس یہی ایک بات سوچتی رہی اور کہ آخر کیا کیا بات ہے جس نے صنوبر کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ وہ چائے لے کر صنوبر کے پاس پہنچی تو وہ فریٹش ہو چکی تھی لیکن اس کے سنے ہوئے چہرے سے صاف لگ رہا

تھا کہ وہ کتنا روتی رہی ہے۔

”لو چائے پیو۔ اس لڑکے حماد کی جیسی تو نہیں ہے مگر میں نے کوشش کی ہے کہ بہت اچھی چائے بنا کے اپنی بیٹی پلاؤں جس سے اس کا موڈ ایک دم ٹھیک ہو جائے۔“ درشہوار نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”کیوں آپ نے کیوں بنائی چائے۔ سہلی کہاں ہے آپ اس سے کہہ دیتیں۔“ صنوبر نے کہا۔
”سہلی کی چائے تو بہتر ہے انسان خود ہی چائے بنائے۔ دنیا کی بری سے بری چائے بھی سہلی کی چائے سے ضرور اچھی ہوگی۔“ درشہوار نے اس طرح کہا کہ صنوبر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

”افس قد رحیمین گنتی ہو تم مسکراتے ہوئے بالکل اپنے پاپا کی طرح۔“ درشہوار نے بہت عرصے بعد آج اس طرح اپنے شوہر آصف کا ذکر کیا تھا۔

”پاپا کہاں ہیں کیا ہوا گئے ہیں؟“ صنوبر نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ تو آٹس میں ہی ہیں۔“ درشہوار نے چائے کا سب لیا۔

”اچھا کیا اب میری صنوبر مجھے نہیں بتائے گی کہ کیا بات تھی جس نے تمہیں اس طرح رلا دیا تھا؟“ صنوبر نے ایک گہری نظر ماں کے چہرے پر ڈالی اور پھر آہستہ آہستہ ساری بات درشہوار کو بات دی۔ پوری بات سننے کے بعد درشہوار نے ایک گہرا سانس لیا مگر بولی کچھ نہیں۔

”آپ کچھ کہیں گی نہیں؟“ صنوبر کو ماں کا اس طرح چپ ہو جانا اور بھی زیادہ فکر مندی میں لے گیا۔ ”سوچ رہی ہوں کہ کیا کہوں۔ یہ لڑکا پہلے بھی تمہیں..... ابھی درشہوار کی بات ادھوری ہی تھی کہ صنوبر درمیان سے بول پڑی۔

”میں آپ کو بتا چکی ہوں ماں ماہ اور بات تھی اب ایسا نہیں ہے وہ میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر.....“ صنوبر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی اس کے ہنسنے پھولنے چکنے لگے۔

”اگر ایسا ہی تو وہ تمہاری کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا؟“ درشہوار پھر سے دلیلوں پر اتر آئی۔

”وہ مجھے کسی مشکل میں لگتا ہے۔“ صنوبر نے دھیرے سے کہا۔

”مصیبت کیسی ہی کیوں نہ ہو اگر وہ تمہیں ساتھ لے کر نہیں چلے گا تو.....“ وہ آگے کچھ اور ایسا کہنے والی تھی جس سے صنوبر کے دل دکھنے کا اندیشہ تھا اس لیے چپ ہو گئی اور بات بدلنے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں یقین دلاتی ہوں وہ اگر ہمارے اسٹیشن سے نیچے بھی ہوا تو میں تمہاری شادی اس سے کرانے میں تمہاری پوری مدد کروں گی اس سے کہو وہ مجھ سے آکر ملے بلکہ ایسا کرو اسے تم آج شام ہی بلوا لو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ درشہوار کو لگا کہ اس وقت اپنی بیٹی کو دکھ سے نجات دلانے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

صنوبر ماں کی بات سن کر جیسے خوش تو ہوئی مگر اسے لگا خوشی نے اس نے اندر سے پھوٹ نکلنے کی ہلکی سی بھی کوشش نہیں کی اور وہ کوشش کے باوجود یہ نہیں جان سکی کہ ایسا کیوں ہو۔

☆☆☆

فارس رحمان بڑی سرگرمی سے اس لڑکے کو تلاش کر رہا تھا جو اس کے اور صنوبر کے راستے میں دیوار بن کے کھڑا ہوا تھا۔ یہ تو اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہونہ ہو وہ لڑکا صنوبر کے آرٹ اسکول میں اس کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ کافی سوچنے کے بعد اسے یاد آئی گیا کہ اس کا ایک ہیلو ہائے جیسا دوست اس اسکول میں پڑھتا ہے۔ ذرا سی بھی دیر کیے بغیر وہ اس سے ملنے اسکول جا پہنچا اس لڑکے کا نام ایشان تھا۔ اور اس وقت وہ ایشان کے ساتھ اسکول کے ایک ویران گوشے میں ملاقات کرتے ہوئے جوں کا گلاس ہاتھ میں پکڑے باتوں میں مشغول تھا۔ لڑکا فارس کے لائف اسٹائل سے پہلے ہی مرعوب تھا اس لیے اس وقت فارس کا یوں اس سے ملنے چلے آنا اسے بہت ہی مزاد رہا تھا۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ تم میرے اسکول میں مجھ سے ملنے آئے ہو۔ ہماری بس ایک دوسرے کی سی

ملاقاتیں ملی کلب کے جم اور انڈورنگز میں کھیلتے ہوئے ہوتی تھیں۔“ ایشان نے پر جوش ہو کر کہا۔
”اصل میں ایشان میں میں تمہیں اپنے دوستوں کے گروپ میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“ فارس نے اس کی طرف وہ ہی بڑی پھینکی جس کے لیے وہ کب سے بے چین تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں۔ شکر یہ تو مجھے ادا کرنا ہی ہے مگر یہ ایک دم سے میرے ستارے اس طرح کیسے چمکنے لگے کہ تم مجھے خود اپنے گروپ میں شامل کرنے میرے پاس آئے ہو۔ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ تمہارا گروپ جو ان کروں مگر کبھی تم سے یا تمہارے گروپ کے کسی ممبر سیکے کی ہمت نہیں ہوتی۔“ خوشی ایشان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ موٹے نقوش اور پھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک براؤن رنگ کا نوجوان تھا۔ اس عمر میں ہر نوجوان ویسے ہی اچھا نظر آتا ہے اسی لیے ایشان بھی ایک نظر دیکھنے میں اچھا ہی معلوم ہوتا تھا۔ قد بھی اس کا چھوٹا تھا اور جسم پر چڑھا ہوا گوشت بتا رہا تھا کہ اسے کھانے پینے کا شوق بھی بہت ہے۔

”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ ایک سائٹ منٹ سے بولا۔ ”میرا مطلب ہے کیا مجھے ہر روز تم لوگوں کے ساتھ رہنا ہوگا؟“

”ارے نہیں بار بار ایسا بھی نہیں ہے۔ ہم کوئی اتنے فارغ بھی نہیں ہوتے جو بلاوجہ سارا وقت گھومتے رہیں البتہ ایک اینڈر پر ہمیشہ ہم کوئی نہ کوئی پروگرام بننا ہی لیتے ہیں۔“ فارس کو لگا کہ یہ تو کافی چپکوسم کا لڑکا ہے اور اسے چپکوتا پ لڑکوں سے ہمیشہ بڑی چڑھوتی تھی۔ ایشان کو اس کے جواب سے زیادہ مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک قسم کا اطمینان ہی ہوا تھا کیونکہ اس کا باپ ایک سخت مزاج انسان تھا اور وہ روز روز کی آوارہ گروی کو شاید پسند بھی نہ کرے۔ لیکن ہفتے میں ایک دن گھر سے باہر رہنے پر اسے یقین تھا اس کے باپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس کے باپ کو اپنے کاموں سے فرصت کم ہی ملتی تھی اس کی بچوں کے لیے اس کی معلومات کا ذریعہ اس کی ماں ہی تھی جو اسے ہفتے میں ایک بار باہر جانے کی اجازت بخوشی دے دیں گی۔

”چلو اچھی بات ہے۔ مجھے تو ویسے روزانہ باہر جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔“ اس نے قدرے سکون سے کہا۔

”ایشان کیا تم صنوبر کو جانتے ہو وہ اسی اسکول میں پڑھتی ہے؟“ فارس اپنے مطلب پر آئی گیا۔
”ارے یار یہ کیا بات کی تم نے۔“ صنوبر کو کون نہیں جانتا۔ اس کے اور شریل کے عشق کے قصے تو یہاں ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ دونوں میں بہت پیار ہے ایک دوسرے کے بغیر دونوں جیسے رہ ہی نہیں سکتے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہی اسکول آتے ہیں۔ ویسے تو پڑھنے اور اسائنمنٹ کرنے میں بھی ان کا ہمیشہ اچھا ہی ریکارڈ ہے۔“ ایشان کہتا رہا جیسے اسے اس موضوع پر بات کرنے کا بہانہ ہی تو چاہے تھا اور فارس کا خون کھولتا رہا اس کی باتیں سن کر وہ رکاوٹ فارس نے کہا۔ ”اچھا اتنی محبت ہے دونوں میں۔ تو کیا اسکول والے انہیں کچھ نہیں کہتے یہ سلی مجنوں کا کھیل کھیلتے پر؟“ فارس نے غصہ اپنے اندر ہی دبایا تھا ورنہ اس وقت اس کا دل چار رہا تھا وہ ابھی کے ابھی شریل کو چاکے اتنا کوٹنے کہ اس کی شکل پہچانی نہ جائے۔

”میں نے کہا نا ان دونوں کا پڑھانی کا ریکارڈ بھی بہت اچھا ہے اور ویسے بھی وہ اسکول کے اچھے اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتے ہیں اسکول کے ڈسپلن کو انھوں نے بھی بھی نظر انداز نہیں کیا تو اسکول کی انتظامیہ کو اس سے کیا کون کس سے محبت کرتا ہے۔“ ایشان نے جوں کا گلاس ختم کر کے اسے ہاتھوں سے توڑ مروڑ کر پھینکتے ہوئے کہا۔
”کیا تم مجھے شریل سے ملا سکتے ہو ابھی؟“ فارس نے کہا تو ایشان چونکا اسے لگا کہ جیسے فارس اسی کام سے اس کے اسکول آیا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ اب سمجھا تم اصل میں شریل سے ملنے آئے ہو!“ اس کی آواز میں اب وہ پہلے جیسا جوش خروش دم توڑ رہا تھا۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پہلہ سری سفید داغ قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملتی ایوارڈ ہولڈر اجمل زیدی کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

مکان نمبر 62، اسٹریٹ نمبر 20، بلاک G-8/1
سرگرم چوک (قلمی چوک) اسلام آباد
فون: 2255880-051
موبائل: 0300-8566188

9- اپریل تا 30 مئی
9- اگست تا 30 ستمبر
9- دسمبر تا 30 جنوری



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

کیم فروری تا 11 فروری
کیم جون تا 11 جون
کیم اکتوبر تا 11 اکتوبر

ملتان

کراچی

28- مارچ تا 6 اپریل
28- جولائی تا 6 اگست
28- نومبر تا 7 دسمبر

13- مارچ تا 27 مارچ
13- جولائی تا 27 جولائی
13- نومبر تا 27 نومبر

E-Mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.com.uk

”ارے نہیں یار میں تم سے ہی ملنے آیا تھا یہ تو بس ذکر نکل آیا تو میں نے پوچھ لیا۔ کیا تم سلمان کو جانتے ہو؟“
فارس نے فوراً ہی دوسرا پتہ چھکا۔

”سلمان کون سلمان اس نام کے تو بہت سے لڑکے یہاں اس اسکول میں پڑھتے ہیں۔“ ایشان نے کہا۔

”نہیں... نہیں... وہ یہاں پڑھتا نہیں ہے وہ صنوبر کا بھائی ہے۔“

”اوہ ہاں... میں نے اسے کئی بار صنوبر کو اسکول ڈراپ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“ ایشان نے تجسس سے کہا۔

”بس اب تم ساری بات سمجھ جاؤ گے۔ سلمان صنوبر کا بھائی ہے اور وہ ہمارے گروپ کا ممبر ہے وہ بھی بہت خاص اسے کسی نے بتایا ہے کہ کوئی لڑکا یہی شریل جو تم نے ابھی بتایا اس کی بہن کو پھانسیں رہا ہے اپنی چکنی چڑی باتوں سے تم تو جانتے ہو ہمارے گروپ کے کسی بھی ممبر کی پریشانی دراصل گروپ کی پریشانی بن جاتی ہے اسی لیے مجھے اس شریل کا داغ ٹھیک کرنا ہے۔ تاکہ وہ صنوبر کا پیچھا چھوڑ دے۔“ فارس کی بات سن کر ایشان کو اس کی بات اجنبی لگی کیونکہ جتنا وہ جانتا تھا یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ گہرائی لیے ہوئے تھا یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ ایک لڑکا کسی لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے اور اسے دھما کر اس کا داغ درست کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو باقاعدہ عشق ہے جو دونوں طرف سے چل رہا ہے یعنی دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔ ایشان چپ رہا اسے لگا کہ اب اس کی کوئی بھی بات بے سود ہوگی فارس کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ مانا کہ صنوبر ایک بے انتہا حسین لڑکی تھی اور کوئی بھی لڑکا اس کے چکر میں پڑسکتا تھا لیکن شریل سے اس کی والہانہ محبت دیکھ کر کسی کو بھی صنوبر کی بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

”اب تم بھی ہمارے گروپ کے ممبر بن چکے ہو اس لیے تمہارا بھی فرض ہے کہ گروپ کے دوستوں کا ساتھ دو۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ فارس نے اس کا کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے ہلایا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ایشان کی دہی دہی اور مشکوک سی آواز نکلی۔

”تمہیں مجھے ایک پل کی رپورٹ دینا ہوگی کہ وہ کیا کرتے ہیں کہاں جاتے ہیں اور کتنی دیر ایک دوسرے سے ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ...“

”اچھا... یہ تو بڑا مشکل کام ہے یار فارس... تم تو مجھے ان کی جاسوسی پر لگا رہے ہو؟“ ایشان کو لگا کہ گروپ جو اس کرنے کا اس کا جو مقصد تھا کہ خوب موج متی کرنے ملے گی یہ بات تو اس کے پاس سے بھی نہیں گزر رہی۔

”تم بس مجھے شریل سے ملا دو۔ پھر تمہارا کام ختم سمجھو میں اسے ایک بار ہی مل کر ٹائیڈ کر دوں گا پھر وہ صنوبر کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔“ فارس نے بات بنائی کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا یہ فضول لڑکا اس کے کسی کام کا نہیں ہے۔ یہ یہ سالہ تو کسی اور ہی چکر میں ہے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ تم کل آنا میں تمہیں شریل سے ملا دوں گا۔“ ایشان نے کہا۔

”کل کیوں آج کیوں نہیں؟“ فارس جتنی جلدی میں رہتا تھا اس کے لیے کسی بھی کام کو فٹ کرنا ہی ہوتا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ فوراً سے پیشتر شریل سے ملنا اور اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

”اس لیے کہ آج وہ آنا نہیں ہے۔“ ایشان نے مختصر جواب دیا۔

”تب تو صنوبر بھی نہیں آئی ہوگی؟“ فارس نے ایک خاص اسٹائل سے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے وہ آئی ہے۔ مگر سارا وقت پریشان دکھائی دیتی رہی۔ ایسا لگتا ہے دونوں کے بیچ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔“ ایشان نے مذہبی معلومات بہم پہنچائی تو فارس جیسے ایک دم ہی قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

”ارے واہ تم نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ یعنی ہمارے کچھ بھی کرنے سے پہلے ہی ہمارا کام خود بخود دور ہا ہے۔“

جواب میں ایشان نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور یوں یہ ملاقات ختم ہوئی۔ راستے بھر فارس دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ شریل اور صنوبر میں کوئی جھگڑا ہوا ہے اور اس جھگڑے سے اس وقت وہ کیسے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ صنوبر تو اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی اور جب سے سلمان نے اس سے رشتے کی

”میں سمجھ گیا میری تباہی اب کسی صورت نہیں مانی جاسکتی لیکن کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دینا پسند کرو گے۔ بس ایک سوال؟“ کروفر اور تکبر سے اکرے لہجے میں بات کرنے والے نگران کے لہجے میں اس وقت کافی گراؤٹ تھی۔ اسے یقین آچکا تھا کہ اب اسے ذلت اور بدنامی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اس کے نصیب کی روشنی چھینی جا چکی تھی۔

”پوچھیں کیا پوچھنا ہے؟“ سلمان جانتا تھا وہ کیا پوچھے گا۔
”بس اتنا بتا دو تم نے یہ کام کیا کیسے جب؟“

”آپ شاید بھول گئے۔“ نگران کی بات کو درمیان سے ہی سلمان نے اچک لیا۔ ”آپ پہلے بھی اسی طرح حیران ہو چکے ہیں۔ اگر اس وقت آپ کی سمجھ میں وہ حیرانی آ جاتی تو آج تباہی آپ کا مقدر نہیں بنتی۔ یاد نہیں تو میں یاد دلادیتا ہوں“ سلمان نے اس کے چہرے پر کھینچتی پریشانی اور گومگو کی لہروں کو دیکھ لیا تھا۔ صبح کا اجالا اتنا پھیل چکا تھا کہ کمرے کی ہر چیز اس اجالے میں واضح اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔

”آپ نے مجھ سے ایسے سوالات کیے جن کے جواب کوئی بھی میرے درجے کا طالب علم دے ہی نہیں سکتا تھا اور اس وقت آپ کو جو حیرانی ہوئی تھی اسے آپ کا غصہ اور انتقام نگل گیا تھا۔ اس لیے آپ سمجھ ہی نہیں سکے کہ میں کون ہوں اور میرے پاس کیسی ماورائی طاقتیں ہیں۔ میں کہیں سے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کیونکہ..... (وہ ان کے قریب آیا) کیونکہ میں انسان نہیں جن ہوں.....“ اتنا کہہ کر سلمان زور زور سے ہنسنے لگا اور نگران کا بس پیشاب خطا ہونے ہی کو تھا۔ وہ کچھ دیر تو جیسے فریاد ہو گیا۔ لیکن پھر جیسے ہی اسے ہوش آیا وہ ہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے کمرے کے حجرے کے غسل خانے میں آکر ہی پناہ لی۔

☆☆☆

”ارے تم.... تم کب واپس آئے؟“ حماد کو اپنے کمرے کے پاس کھڑے دیکھ کر صنوبر کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے جلدی سے اسے اپنے کمرے میں پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

”ماما سے ملے؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں ابھی نہیں“ حماد نے جواب دیا۔

”اچھا۔ بتاؤ دروازے سے آئے ہونا۔ اس دن کی طرح دیوار کو دکھ کر تو نہیں آئے جیسے تم اس رات کو گئے تھے۔“ صنوبر کو معلوم تھا کہ اب اس کا اس گھر میں پھر سے ملازمت پر رکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا اس طرح دیوار پھاند کر یہاں سے جانا ناقابل معافی جرم تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بی بی صاحبہ میں تو اس رات بھی دروازے سے ہی گیا تھا دیوار پھاند کر تو نہیں گیا تھا۔“ حماد کو یاد آگیا اس رات کا یہاں سے چلے جانا۔

”ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔“ چوکیدار تو کہہ رہا تھا کہ تم دروازے سے نکلے ہی نہیں۔ مجھے بھی تم نظر نہیں آئے تھے میں تو بالکونی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔“ صنوبر کو اس کے بیان پر شدید حیرت ہوئی۔

”آپ نے نہیں دیکھا اس کی تو ایک وجہ ہے اس رات آپ پریشان تھیں آپ کی نظر چوک گئی ہوگی۔ لیکن چوکیدار کو تو سو یا پڑا تھا۔ میں نے اسے آوازیں بھی دیں مگر وہ جاگا ہی نہیں تو میں نے گیٹ کھولا اور میں چلا گیا۔ لیکن میں نے گیٹ کو پچھر سے بند کر دیا تھا۔ اس طرح کھانا نہیں چھوڑا تھا کہ کوئی چور وغیرہ داخل ہو سکے۔“ حماد کی بات سن کر صنوبر کی پریشانی دو چند ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر یہ اس طرح گیا جیسے بتا رہا ہے تو بات تو یہ بھی پکڑ میں آنے والی ہے۔ اسے اس طرح گیٹ کھول کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اور دیوار سے کود کر جانا بھی قابل سزا و اعتراض تھا تو اور دونوں ہی صورتوں میں اس کی نوکری نہیں رہے گی۔

”میں سمجھ گئی چوکیدار نے اس ڈر سے نہیں بتایا کہ اس طرح اس کی اپنی کمزوری پکڑی جائے گی کہ وہ رات کو

بات کی تھی اسے یقین تھا کہ اب وہ اور بھی محتاط ہو چکی ہوگی۔ پھر بھی خرابی کرنے میں کیا حرج ہے..... یہ سوچ کر اس نے گاڑی پھر سے اسکول کی طرف موڑ لی کہ صنوبر سے بات کر کے دیکھے کہ کیا ہوا ہے اگر تو اس جلتی برآمدی تیل ڈال کر اسے بڑکایا جاسکتا ہے تو اس موقع کو بائیسوں سے جانے نہ دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ایک ترکیب بھی سوچھی اس نے سلمان کو کون کیا اور اس سے ایک ایسی بات کی جسے مانتے ہوئے سلمان کو کافی تشویش ہوئی مگر وہ فارس کی دی ہوئی تسلیوں پر بادل خواست مان گیا۔

☆☆☆

سلمان کے کمرے میں پہنچ کر نگران کو لگا کہ اس نے یہاں آکر زیادہ اچھا نہیں کیا یہ اس کی غلطی تھی اسے سلمان کو تو کم سے کم اپنے کمرے میں بلالینا چاہیے تھا وہ بھی سمجھتی تھی وہ ایک طالب علم ہی تو تھا۔ کیا وہ اس کے بلانے پر آنے سے انکار کر دیتا۔ اس بات کا احساس اسے اس وقت زیادہ شدت سے ہوا جب سلمان کے کمرے میں ایک اور طالب علم عمران کو بھی اس نے موجود پایا۔ سلمان نگران کو دیکھ کر کچھ زیادہ حیران نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہو گا نگران ابوریحان مایوس ہونے کے بعد سیدھا سی کے پاس آئے گا۔

کمرے میں موجود دوسرے طالب علم عمران کو ایک زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ نگران کبھی کسی طالب علم کے کمرے میں اس طرح سے آیا ہو۔ وہ ڈر گیا شاید کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ نگران کے بولنے سے پہلے تک اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کہ غلطی کس سے ہوئی ہے اس سے یا سلمان سے۔ جب نگران نے کہا۔

”تم جاؤ عمران مجھے سلمان سے اکیلے میں بات کرنا ہے“ تو عمران کی جان میں جان آنی کہ غلطی کا تعلق اس سے نہیں بلکہ سلمان سے تھا۔ پھر بھی اس کی تشویش باقی رہی کہ آخر بات کیا ہے۔ وہ اور سلمان ایک ہی کمرہ اشیر کرتے ہیں کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جس کا تعلق ان دونوں سے ہو۔ اگر ہم دونوں سے تعلق ہوتا تو وہ مجھے کمرے سے باہر جانے کا کیوں کہتے۔ راہداری میں بے چینی سے ٹہکتے ہوئے عمران نے خود کو تسلی دی۔
”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ سلمان نے کہا تو نگران کا جیسے پتہ پانی ہو گیا ایک کل کا لونڈ اس سے اس لہجے میں بات کر سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟ اور کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ اس بدتمیزی پر میں تمہیں.....“
”آپ کچھ نہیں کر سکتے میں یہ بھی جانتا ہوں۔ آپ کے کمرے سے وہ سارے راز جن میں آپ کے گناہوں کے ثبوت چھپے ہوئے ہیں میں نے ہی چرائے ہیں۔“ سلمان نے نگران کے اس تجسس کو بھی بھک سے اڑا دیا جس نے اس کی سوچوں میں آگ لگا رکھی تھی کہ اتنے سخت انتظام کے باوجود اس کے کمرے سے کاغذات چوری کیسے ہو گئے۔

”تم نے.....“ حیرت کا ایک ہم تھا جو نگران کی سماعت پر پھٹا۔

”مگر..... یہ ہوا کیسے سب کچھ تو.....؟“ نگران کو جو تجسس بے چین کیے ہوئے تھا وہ اس کے لبوں پر آ رہی گیا۔
”سب کچھ تو تالے میں تھا تا تو ڈاڑھی نہیں گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے بھی اسی طرح بند تھے جیسے انھیں آپ نے بند کیا تھا تو پھر میں نے وہ کاغذات کیسے چوری کیے..... یہی جانا چاہتے ہیں آپ؟“ سلمان کی بات سن کر نگران نے اسی کیفیت میں گردن ہلائی۔

”لیکن میں آپ کو یہ نہیں بتانا چاہتا اور اب آپ مجھ سے پوچھنے کی طاقت اور اختیارات کھو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت نگران ہوتے ہوئے بھی نگران نہیں ہیں۔ اگر میں نہیں جانتا تو آپ سے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔“ سلمان کے لہجے میں جو جو قطعیت تھی اسے نگران نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

جاگ کے نگرانی کرنے کے بجائے سویا رہتا ہے۔ لیکن تمہارا اس طرح گھٹ کھول کر جانا بھی تو مناسب نہیں ہے اب کیا کیا جائے تمہیں پھر سے ملازمت پر رکھنا ناممکن ہے۔“ صنوبر کے لہجے میں اس کے لیے جو تشریح ملی وہ اسے اچھی لگی وہ اس کی فکر کر رہی تھی۔ لیکن بات اس کی ٹھیک تھی اب اس کی ملازمت کا کیا ہوگا۔

”تم بھی سوچو میں بھی سوچتی ہوں کہ تمہیں کس طرح پھر سے ملازمت پر رکھایا جاسکتا ہے؟“ صنوبر نے کہا اور پھر سے بولی۔

”تم اس وقت بھی میرے کمرے تک آگئے اور تمہیں کسی نے نہیں دیکھا کیا چھلاؤ ہو یا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھومتے ہو۔“

”یہ تو عام بات ہے۔ صنوبر بی بی آپ کی ماما پر اپنے کمرے میں ہیں۔ سلمان صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ سلیکی بچن میں کام کر رہی ہے۔ اور آپ کے پاپا“ اس نے وضاحت کی۔ ”میں نے سوچا پہلے آپ سے مل لوں کیونکہ میں آپ سے ہی چھٹی لے کر گیا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب یہ تو سوچو تمہیں معافی کیسے ملے گی۔ تمہارا جرم کوئی چھوٹی بات نہیں ہے اگر تمہارے جانے کے بعد گھر میں خدا نخواستہ چوری ہو جاتی تو کیا ہوتا۔“ صنوبر نے فکر مندی سے کہا۔

”وہ تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں....“ ایک دم ہی اسے خیال آیا کہ اس کے منہ سے اس کا راز فاش ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً ہی بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”اصل میں میں نے آیت الکرسی پڑھ کر دروازے کا حصار کھینچ دیا تھا۔ ایسا کرنے سے چور یا غلط ارادے یا نیت سے گھنے والا کوئی بھی آدمی داخل نہیں ہو سکتا۔“ اس کی بات سن کر صنوبر کو اس کی مصیبت پر جیسے ایک دم ہی ڈھروں پیر آ گیا۔

”کیا واقعی ایسا ہے؟ تمہیں یہ بات کس نے سکھائی؟“ صنوبر کو اس کی باتوں میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”میری ماں نے ہم تو ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ وہ سانسیت سے بولا۔

”پھر تو تمہارے پاس ایسی کوئی آیت بھی ضرور ہوگی جو غلطی کی معافی دلا سکتی ہو؟“ صنوبر نے پتائیں کیوں مگر اسی لمحے یہ سوچ لیا کہ اس کے یقین کا امتحان لینا چاہیے اگر تو وہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو اسے آزمانا چاہیے اس میں اسے خود بھی کافی فائدہ نظر آیا۔ اس طرح خود اس کے پاس بھی وہ ایسے قرآنی نسخے جمع ہو سکتے تھے جو وقت پڑنے پر شاید کبھی کام آسکیں۔

”جی ہے ایسی بھی ایک آیت ہے“ وہ جانتا تھا کہ اسے کس عقیقت سے کام لینا ہے۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں تھا کہ قرآنی نسخوں میں بھی ایسی بہت سی تاثیریں چھپی ہوئی ہیں جو زندگی کے کئی مسائل کا حل ہیں۔

”بس تو پھر سمجھو کام بن گیا۔ ماما کے پاس چلتے ہیں تم ان پر وہ آیت پڑھ کے پھونک دینا جس سے وہ تمہیں معاف کر دیں اور یوں تمہاری جاب پھر سے بحال ہو جائے گی۔“ وہ بولی اور ساتھ ہی اسے ایک اور بات یاد آئی۔

لیکن ایک شرط پر تم مجھے یہی دونوں آیتیں سکھاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟“

”جی منظور ہے۔ ویسے آپ کو تو میں بنا شرط کے بھی سکھا سکتا ہوں“ حماد نے ایسی اپنایت سے کہا کہ صنوبر نے اس کا گال چپو کر اسے پیار کیا اور حماد جو دراصل مسلمان تھا نئے میں جھوم ہی گیا۔

”اب چلو کھڑے کیوں ہو؟“ صنوبر نے کہا تو وہ ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آ گیا۔

”جی.....!!!!“ وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہلایا۔

☆☆☆

فارس اس دن کی بات سوچ کر غصے سے اب تک پھٹک رہا تھا۔ اس دن اس نے سلمان سے تو صنوبر کو ڈراپ کرنے کی اجازت لے لی تھی لیکن صنوبر کسی بھی قیمت پر اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے لاکھ کہا کہ میں سلمان کا دوست ہوں اور مجھے آپ کو پک کرنے کے لیے سلمان نے ہی بھیجا ہے۔ مگر وہ نہیں مانی اور اپنی ایک

دوست کے ساتھ جو اسکول فیلو بھی تھی بیٹھ کر چلی گئی۔ یہ ذلت ایسی تھی جس نے اس کی راتوں کی نیندیں چھین لی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ڈھیر ساری شراب پینے سے بھی اسے سکون نہیں ملا۔ صنوبر جتنا اس کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی تھی اتنا ہی اس کے دل میں اسے پانے کی آرزو اور شدت سے چل چل اٹھتی۔ جو کچھ بھی صنوبر کو اس کی ہوتا ہی ہوگا۔ یہ خیال اسے لچائی تسکین تو دیتا تھا لیکن ایسا کب ہوگا اور کس طرح ہوگا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

اس رات وہ اسی بے چینی سے کبھی ٹھٹھٹھ لگتا بھی بستر پر آ کر کر ویش بدلتے لگتا نرم گرم بستر اسے آگ کی طرح جلاتا اور اس کا سارا جسم جیسے جھلنے لگتا۔ وہ بالکونی میں جا کے کھڑا ہو جاتا اور دور تک ٹھہری ہوئی رات کو بے دھیانی سے دیکھنے لگتا اسے گھور اندھیرے میں بھی صنوبر کا روشن اور چمکتا ہوا چہرہ دکھائی پڑتا اس کی بے چینی سوا ہو جاتی۔ تب اس نے اپنے پیچھے ہونے جذبات کی تسلی کے لیے ایک ارادہ باندھا اور اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ صنوبر اسے ملے یا نہ ملے مگر وہ صنوبر کو کسی اور کا ہونے نہیں دے گا چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

رات اپنے ہی سروں میں بہتی رہی بے پروا اور ہر بات سے بے نیاز وقت ہوتا ہی ایسا ہے جو کسی کی پروا نہیں کرتا وہ چاہے فارس رحمان ہو چاہے شریل سب کے اوپر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

یہ بھی اسی دن کا ذکر ہے جب شریل اسکول نہیں آیا تو صنوبر کو اس کی بڑی بھاری فکر لاحق ہوئی۔ رات بھر وہ اسے فون کرتی رہی تھی اور یہ سوچ کر اسکول آئی تھی کہ یہاں تو اس کی ملاقات شریل سے ضرور ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا اور اس کا دل انجان دکھوں سے لبالب بھر گیا کہ شریل تو کبھی چھٹی کرتا ہی نہیں تھا۔ کرتا بھی تھا تو اسے ایک دن یا اس سے بھی پہلے بتا دیا کرتا تھا۔ پھر اب شریل کو کیا ہوا۔ کہیں وہ پھر سے بدلنے والا تو نہیں۔ اس خیال کو صنوبر نے فوراً ہی رد کر دیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا اسے یقین تھا شریل اسے نہ ہی بھی دھوکا دے گا اور نہ ہی چھوڑے گا۔ لیکن اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ وہ کسی ایسی مشکل میں ہے جس نے اسے اتنا پریشان کر دیا ہے۔ اس کی ماں در شہوار پہلے ہی شریل کے بارے میں عجیب بہت توڑنے والے خیالات کا اظہار کر چکی تھی صنوبر جانتی تھی اس کی ماما اس کی دشمن نہیں ہیں مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں جو انھیں ہر محبت کرنے والا بے اعتبار اور خود غرض نظر آتا ہے ایسا اس لیے تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو کبھی اتنی بھی محبت نہیں دی تھی جو اسے محبت پر اعتبار کرنا سکھا سکتی۔ لیکن اسے دوسروں کی زندگیوں پر اختیار نہیں تھا مگر اسے کم اپنے ماں باپ کی زندگیوں پر تو بالکل سے نہیں تھا وہ جو چاہتی تھی اس پر عمل ہوتا دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا پھر بھی اس نے اپنی حد سے زیادہ کڑوی اور تکلیف دہ بھری ہوئی ماں کو صبر کرنا اور ماں ہونا سکھا دیا تھا اسی لیے اب در شہوار پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھے رویوں کے ساتھ جی رہی تھی۔ در شہوار کے ان رویوں کی تبدیلی کو اس کے باپ آصف کریم نے بھی محسوس کر لیا تھا اسی لیے ان کا رویہ بھی اس کی ماں سے اوپر کی طور پر کسی قدر پہلے کے مقابلے میں نرم اور اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ صنوبر یہ سب محسوس کر کے خوش ہونا چاہتی تھی کہ اس کے گھر میں تبدیلی آرہی تھی یہاں اس گھر میں رہنے والے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے تھے لیکن زندگی پر بھی انسان کا بس کہاں چلتا ہے پتائیں کہاں سے مہینتیں اور انہونی باتیں در آتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

سلمان کی اس دن کی رات کو ہونے والی لہو لعب کی اس تقریب نے بہت کچھ پھر سے تبدیل کر دیا تھا۔ سلمان جو دھیرے دھیرے گھر میں آنے والی تبدیلیوں کے اثر میں آنے لگا تھا اس رات کے بعد سے وہ پھر پہلے جیسے رویوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اس رات کی ٹی کا اثر وقت کے ساتھ کم ہونے کی توقع بھی اس وقت جاتی رہی جب سلمان نے صنوبر سے اپنے دوست فارس سے شادی کرنے کی بات کی۔ صنوبر سمجھ گئی کہ اس کا بیٹا کن کن لوگوں کے ہاتھوں کا کھلوتا ہے۔

انسان چاہے کتنا ہی دیا لو کیوں نہ ہو کوئی تو ایسی چیز ہوتی ہی ہے جسے وہ چاہے بھی تو کسی کو نہیں دے سکتا اور

صنوبر بھی اپنی محبت اور اپنا شریل کسی کو نہیں دے سکتی تھی حتیٰ کہ اپنے بھائی کو بھی نہیں۔ اس نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کی کلاس میں کس قدر مد مفادات سے تھڑی ہوئی زندگیوں کا چلن ہے یہاں اپنے مفادات کے لیے کچھ بھی چھوڑا اور جوڑا سکتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے شادیاں اور رشتے داریاں سب کا رو باری بنادوں پر ہوتی ہیں اسی لیے زیادہ تر گھر ایسے تھے جہاں رشتوں کے وہ معنی ہی نہیں تھے جو ہونے چاہیں۔ آدمی چھپ چھپ کے اغیر چلاتے تو عورتیں بھی اسی قسم کی سرکرمیوں میں مصروف رہتیں اس کا صاف مطلب تھا کہ آدمی اور عورت دونوں اپنے رشتوں سے مطمئن اور خوش نہیں تھے ایسے ہی دو کردار خود اس کے گھر میں بھی تھے۔ وہ اسکول سے گھر پہنچی تو اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ شریل اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر آیا ہوا تھا۔ بے پناہ مسرت ہوئی۔ اس کی ماں در شہواران سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آ رہی تھی۔ صنوبر کو دیکھ کر در شہوار نے ایسے ری ایکٹ کیا جیسے وہ اس کی بیٹی نہیں اس کی دوست ہو۔

شاید در شہوار کے بے ہوش ہونے سے روئیوں نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ خود کو محبت نہ ملے تو اس کا بدلہ دوسروں سے لینے کے بجائے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ کوئی دوسرا محبت سے محروم نہ رہے اور صنوبر تو کوئی دوسری نہیں بلکہ اس کی اپنی بیٹی تھی جس کی خوشیوں کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی وہ چاہتی تھی کہ جو زندگی اس نے گزاری ہے محبت اور توجہ سے خالی ایسی زندگی اس کی بیٹی کو نہیں گزارنی چاہیے اس لیے وہ شریل کا رشتا آنے پر ایسی خوشی میں مبتلا ہو چکی تھی جس کا وہ اظہار نہ بھی کرے تب بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہے۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے بچوں کی شادی کے بارے میں اور سوسائٹی کے بارے میں طولانی گفتگو میں بڑی ہو گئیں تو شریل اٹھ کر صنوبر کے پاس چلا آیا۔ صنوبر اس سے ناراض ہونا چاہتی تھی لیکن اس طرح بواچانک ملنے والی اس خوشی سے اسے ضرور ہاتھ دھونا پڑتے۔ اس لیے وہ ناراضگی کو ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

”یہ کیا حرکت ہے۔ سر پر اتر دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے کل سے اب تک تم نے میری جان ہی تو نکال دی تھی اور اب یوں.....“ وہ بولی۔

”تم نہیں جانتیں میں کتنی بیشن سے گزرا ہوں۔ لیکن اب اس گزرے وقت کو جانے دو اور اپنے آنے والے نکل کے بارے میں سوچو۔ آج ملنے والی خوشیوں کے بارے میں سوچو۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ شاید تمہاری ماما ہم سے اچھی طرح پیش نہیں آئیں گی اور شاید انہیں اس رشتے پر بھی کچھ تحفظات ہوں مگر انہوں نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔“ شریل نے بکھرے ہوئے انداز سے کہا تو صنوبر کو لگا جیسے شریل کہنا کچھ چاہتا ہے اور خیالات بھٹک کر نہیں سے نہیں اسے لگتے ہیں اور وہ بھی کچھ اور بھی کچھ کہنے والی کیفیت کا شکار ہے۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ابھی ماما کی رائے کو سب کچھ نہیں سمجھا جاسکتا۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے انھوں نے طے کر لیا ہے کہ میں جو بھی کہوں گی جو بھی چاہوں گی وہ اسی کے ساتھ ہوں گی۔ مگر.....“ صنوبر نے ایک ہی بات میں خوشی اور ہی دونوں کو سودیا۔

”مگر کیا.....؟“ شریل نے دھیرے سے دریافت کیا۔

”فائل فیصلہ تو پاپائی کو کرنا ہے۔ بس یہ اطمینان ہے کہ ماما کی رائے ہمارے حق میں ہونی چاہیے وہ پاپا کو منانے میں اپنا پورا زور لگا دیں گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی مشکل تو سلمان ہے جو اس رشتے سے کبھی خوش نہیں ہوگا اور کوشش کرے گا کہ پاپا بھی اسی کا ساتھ دیں۔“

شریل نے سن کر ایک دم ہی اداس ہو گیا۔ صنوبر نے اس کی آنکھوں میں وہ اداسی اور مایوسی دیکھ لی تھی۔ ”لیکن تم فکر مت کرو پاپا میری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ سلمان نے ان سے پہلے بھی بات کی تھی اپنے دوست کی دلچسپی اور اس کی حیثیت کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بتایا تھا لیکن پاپا نے کہہ دیا تھا جو بھی ہو آخری فیصلہ تو صنوبر کو ہی کرنا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے صنوبر پھر بھی مجھے ایک انجان سا ڈر لگ رہا ہے جیسے ہم.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو۔ رک کیوں گئے اپنی بات پوری کرو شریل نہیں تو میں پریشان ہوتی رہوں گی پلیر“ صنوبر ایک دم سے فکروں میں گھر گئی۔

تب پھر بڑی مشکلوں سے شریل نے فارس اور اپنے باپ کے بارے میں وہ سب کچھ اسے بتا دیا جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا اور جو کچھ اس نے پچھلے دنوں میں سہا تھا۔

”اوہ..... تو بڑی پریشانی والی بات ہے... تب تو تمہارے ڈیڈی... اس رشتے پر آسانی سے راضی نہیں ہوں گے“ صنوبر نے سوچ کی لہروں میں تیرتے خوف کے سایوں کے درمیان سے کہا۔

”ہاں وہ شاید میری اس سوچ کو سپورٹ کرنا پسند کریں گے کورٹ میرن والی... تاکہ انھیں فارس کے والد کو یہ کہنے میں آسانی رہے کہ میں نے ان کی بات نہیں مانی اور نافرمانی کرتے ہوئے تم سے رشتا جوڑ لیا ہے۔“ شریل نے دھیمے لہجے میں دکھ سے کہا۔

صنوبر چپ ہو گئی اور اسے لگا یہ بات تو اس کے باپ کے رضامند ہونے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور کٹھن ہے۔ کورٹ میرن کے بارے میں اس کے ماں باپ کیسے راضی ہوں گے۔ ان کا موقف ہوگا کہ جب ہم راضی ہیں تو تمہیں کورٹ میرن کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی ماں جو ابھی بہت خوش ہیں ان کے شریل کے بارے میں پہلے سے جو شکوک و شبہات ہیں وہ پھر سے اٹھانے لگیں گے یہ لڑکا جو تمہیں پہلے بھی چھوڑ کے جا چکا ہے کورٹ میرن کے بعد تو تم اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤ گی۔ وہ کیسے ماں باپ کو اس کورٹ میرن کے بارے میں بتا کر راضی کر سکے گی۔ اپنے عین قریب کھڑا ہوا شریل اچانک سے اسے بہت دور نظر آنے لگا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو گلابا گل رہے تھے ایک ہی تیز جھونکے سے لرز کر مر جھانے لگے۔ شریل بھی سوچوں کی آتھہ میں جا چکا تھا۔ دونوں دیر تک خاموشی سے یونہی کھڑے رہے اور در شہوار انھیں بچ کے لیے بلانے آئی۔ دوران بچ سلمان بھی آ گیا اور اس سے ان لوگوں کا تعارف کرا گیا تو اس کے چہرے کا رنگ جیسے یکسر تبدیل ہو گیا۔ ناپسندیدگی اس کے رویے سے عیاں ہونے لگی اور وہ کھانے پر بھی نہیں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور شریل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے کمرے میں یا میز پر یہ صنوبر نہیں جان سکی کیوں کہ اس وقت وہ اٹھ کر پکین میں آئی تھی۔ واپس آئی تو شریل غائب تھا اسے در شہوار نے بتایا کہ سلمان اور شریل آپس میں کوئی بات کر رہے ہیں۔ در شہوار کو اس وقت اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ سلمان شریل سے کیا کہنے والا ہے لیکن صنوبر کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ سلمان کیا کرنے والا ہے۔

واپس صرف شریل آیا اور اپنے رویے سے کچھ دیر پہلے ہونے والی کجی کو ظاہر ہونے دینے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ صنوبر کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اس کے بھائی نے اس سے کیا کہا ہے۔ پھر وہ وہاں زیادہ دیر کا نہیں اور اپنی ماں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

صنوبر سارا وقت پریشان رہی اور اس وقت بھی وہ پریشانیوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی جب حماد نے آکر اسے چونکا دیا۔ وہ لمبے بھر کو اپنا سارا دکھ بھول گئی اور حماد کو پھر سے ملازمت پر رکھوانے کے بارے میں مشغول ہو گئی۔

در شہوار نے حماد کو دیکھا تو ایک دم سے زور سے چلائی۔

”یہ چور یہاں کیا کر رہا ہے؟“ حماد اور صنوبر دونوں ٹھٹھک کر سیڑھیوں کے آخری اسٹیپ پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے
سطر سطر ہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ اپریل میں پڑھیے)

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد ہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ذاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طو ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمانوں و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ذاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =300 روپے کا مٹی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی خواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ مٹی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجیے کے علاوہ خط میں مٹی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات نوکٹن مٹی =300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے مٹی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجیے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

=====

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خطا فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے چھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... مٹی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں غلطی کے ایک طرف تحریر کریں۔

=====

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ زندگی بہت تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ ایسے میں جب موقع ملے نیکی کمائی چاہیے۔ دنیا میں نیکی اور آخرت میں بھی نیکی عمل فائدہ دے گا۔ شکوے شکایات، نفرتیں صرف وقت کا زیاں ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے یہ خوشیوں کے لیے ہی کم ہے پھر نفرتوں کے لیے وقت نکالنا تو سراسر زیادتی ہے۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے رشتے خراب کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا۔ میں اپنے تمام بڑے والوں سے درخواست کروں گا کہ ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ رکھیں۔ جب فاصلے بڑھتے ہیں تب شیطان درمیان میں آ جاتا ہے۔ لہذا دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خلوص اور اعتماد رکھنا ہی بہتر ہے۔ نماز کی پابندی دلوں کو سختی سے بچاتی ہے۔ صدقہ خیرات جہنم کی آگ سے بچاتا ہے۔ بس فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سورۃ الم نشرح سورۃ واقعہ سورۃ رحمن کو اپنی زندگی کے شب و روز میں شامل کرنے والوں کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ برکت ہی برکت ہے۔

□ مائدہ کوئٹہ

○ محترم بابا جی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور سلامت رکھے۔ آج میں آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ مجھے اس کا جواب مارچ کے شمارے میں ضرور دیں گے۔ بابا جی میری عمر 30 سال ہے لیکن ابھی تک کافی کوشش کے باوجود میرا رشتہ کہیں ٹکے نہیں ہو پا رہا ہے۔ بابا جی آپ مجھے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری شادی کسی اچھے گھرانے میں ہو جائے۔ بابا جی آپ مجھے وظیفہ ضرور

بتائے گا اور میں آپ سے تعویذ نہیں منگو سکتی۔ بابا جی آپ مجھے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرا مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے۔

☆ بیٹی مائدہ! بعد نماز فجر ایک بار سورۃ احزاب پڑھو اور دعا کرو نماز کی پابندی وظیفہ کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جس قدر ممکن ہو درود شریف پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ کرن شبیر۔ کراچی

○ بابا جی امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ بابا مجھے اپنے گھر کے حوالے سے استخارہ کروانا تھا۔ بہت سے مسئلے ہیں۔ میرے ابو سعودی عرب میں اچھا کماتے ہیں بران پر سفلی علم کروا دیا ہے کسی نے، ان کا بس یہی کہنا ہے کہ کراچی چھوڑ کر گاؤں جاؤں۔ ہم بہن بھائی یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ساتھ ہی جاب، کیونکہ وہ گھر کو سپورٹ نہیں کرتے، امی نیشن لے لے کر دل کی مرلیض بن گئی ہیں۔ ہم ان سے پیسے بھی نہیں مانگتے۔ اپنا کماتے ہیں پر وقتی سکون نہیں، دوسرے میں جہاں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ پٹھان ہے مگر میرے گھر والے نہیں مان رہے۔ وہ باعزت طریقے سے رشتہ لانا چاہتا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟ کوئی ایسا عمل بتائیں یا تو میرے ابو ٹھیک ہو جائیں یا وہ میرے دل سے نکل جائے۔ میں اپنے والدین کے خلاف کبھی نہیں جاسکتی، امی بہت ساتھ دیتی ہیں مگر ابو جب بھی بات کریں گے امی کو طلاق دینے کی، ہر عمل کرا کے دیکھ لیا وظائف کیے مگر ان پر کالا جادو ہے۔ اب آپ ہی کوئی وظیفہ بتائیں جس سے گھر میں سکون ہو اور برکت ہو، ایک بات اور اگر آپ سے ملنا ہو

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے - 35893122 - 021-35893121

ذمے داریاں پوری کرو یہ بھی جہاد ہے۔

□ نورین۔ فیصل آباد۔

o باباجی! میں بہت ڈھکی عورت ہوں۔ بیوہ ہوں! تین بچے ہیں شوہر کی ساری جائیداد پر پہلی بیوی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میں سارے خاندان میں دھکے کھاتی پھرتی ہوں۔ باباجی! خود سوچئے، تین بچوں کے ساتھ مجھے کون برداشت کرے گا؟ پھر سچ بھی ہے، مہنگائی نے سب کو تنگ کر دیا ہے۔ میرے رشتے کے بہنوئی ہیں وہ خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں مگر وہاں بھی لوگ عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ ڈرتی ہوں کسی دن انہیں پتا چل گیا تو یہ آسرا بھی جائے گا۔ باباجی! آپ کے بڑھنے والے باہر ملکوں میں بھی رہتے ہیں کیا ان کے دل میں بھی اتنی جگہ نہیں کہ وہ ہم جیصوں کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بھجوا دیا کریں۔ کم از کم آپ سے مدد مل سکے تو لوگ انگلیاں تو نہیں اٹھائیں گے۔ کچھ عرصہ ایک خاتون میری مدد کرتی رہیں مگر جب ڈاک خانے والوں کے انداز مجھے بدلے بدلے لگے تو میں نے بھائی کو بھیجا شروع کیا! بس وہ دن ہے اور آج کا دن! مجھے کچھ نہیں ملا۔ باباجی! آپ تو اللہ کے نیک بندے ہیں لوگ آپ کی بات مانتے بھی ہیں ان سے کہیں کہ پاکستان میں بہت غربت ہے اور مجھے جیسی عورتیں تو اپنے بچوں کے ساتھ خود بھی کھیں گی تو بتائیں اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اتنی بڑی دنیا میں باباجی! ہم چار لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں اور لوگ کتنے خوش رہتے ہیں۔ باباجی! مجھے معاف کر دیں میں آج اتنا روٹی ہوں۔ پچھلے سال تک فکری نہیں تھی کہ بچے عید کیسے منائیں گے مگر اب دل پیٹ رہا ہے۔ باباجی! کچھ مت بتائیے صرف صبر کی دعا بتائیے تاکہ ہم دنیا کی ضروریات سے آشنائی ہی چھوڑ دیں۔

☆ بی بی نورین! تمہارا خط پڑھ کر بہت ڈھک ہوا۔ تمہارے سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک میرے بچے بہت خیال کرتے تھے۔ رمضان اور پھر عید کے بعد نیم بچوں کی شادی کا مگر شاید اب وہ بھی زندگی میں بہت مشغول ہو گئے ہیں یہ بھول گئے ہیں ساتھ صرف اعمال جاتے ہیں۔ ایک تکلیف دہ صورت حال اور بھی ہے ڈاک خانے والے لفافے کھول

تو رابطہ نمبر ہو تو طریقہ کار بتا دیجیے میری والدہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ ہر مل ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خداوند تعالیٰ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے، دعا میں اس بیٹی کو یاد رکھئے گا۔

☆ بی بی کرن! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ موجودہ صورتحال دیکھتے ہوئے میں تمہیں نصیحت کروں گا مجھ سے دو عدد تعویذ منگوا لو ایک اپنے لیے اور ایک اپنے والد کے لیے..... طریقہ کار بہت سہل ہے۔ جی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو یا پھر مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو میں تفصیل سے جواب دے دوں گا۔

□ ثانیہ۔ حیدر آباد

o باباجی! یہاں میری ایک بہت اچھی دوست ہیں وہ آپ کو بڑی پابندی سے خط لکھتی ہیں۔ ان کے ذریعے آپ کا پتا چلا۔ باباجی! میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ شادی کو 13 سال ہو چکے ہیں۔ اب تو خود بھی کبھی کبھی امید جواب دے جاتی ہے مگر پھر ایک آس سی بندھ جاتی ہے۔ باباجی! آپ کو اپنے رب کا واسطہ میری مدد کریں اور مجھے ایسا جلائی تعویذ دیں جس کی بدولت میں اولاد کی نعمت پالوں اور لوگوں کی نظر اور ترحم بھری نظروں سے بچ سکوں۔ اصل میں میرے میاں بھی اکلوتے ہیں اور میں بھی ایک ہی اولاد ہوں۔ باباجی! پلیز مجھے تعویذ بھجوا دیں یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

☆ بی بی ثانیہ! اللہ تمہاری دعا قبول فرمائے۔ بی بی! میں کلام الہی دیتا ہوں مگر کامیابی صرف انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں اور خوشی اور غم دونوں میں اس کے حکم گزار رہتے ہیں۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو اور تعویذ کی تفصیل بھی ارسال کرو۔ اپنی عمر اپنے شوہر کی عمر مکمل نام اور والدین کے مکمل نام۔ اللہ پر مکمل اعتقاد رکھو و ضرور کرم کرے گا۔

□ شاہد سعید۔ کراچی۔

☆ بی بی شاہد..... نہ تو ملتا ہوں اور نہ ہی کوئی آستانہ رکھتا ہوں۔ عام سا انسان ہوں بس قرآن مجید سے کتنا فائدہ اٹھا یا جاسکتا ہے لوگ بھول گئے ہیں۔ میں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میری خدمت کی بجائے اپنے والدین اور گھر والوں کی خدمت کرو اور ان کی

کر خط پھاڑ دیتے تھے اس لیے میں سب کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ لفافے میں صرف خط اور جوابی لفافہ رکھیں۔ بی بی! تم اللہ سے صبر مانگ رہی ہو وہ تمہیں صبر ضرور دے گا۔ سورۃ البقرۃ آیت 39 بکثرت بڑھا کرو اور بی بی! ایک بات پھر کہوں گا کہ دنیا میں اتنے لوگ ہیں شاید اسی لیے دنیا چل رہی ہے۔ ہمت رکھو اور صبر رکھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ نظیر احمد۔ حضرو۔

o باباجی! میرا تعلق ایک حساس ادارے سے ہے۔ نوکری کے سلسلے میں اکثر گھر سے دور رہتا ہوں۔ ایک عجیب سے احساس نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے لکھتے ہوئے ڈھک ہو رہا ہے اور شرم بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اپنی بیوی پر شک ہے۔ اس کا رویہ بھی عام عورتوں جیسا نہیں ہے۔ لکھتا چاہوں تو شاید صغے بھر جائیں۔ آپ کچھ جائیں کہ میں شوہر ہو کر سمجھتا ہوں کہ وہ میری موجودگی سے خوش نہیں رہتی۔ بس میرے کم لکھے کو بہت جائیں اور میری مدد کریں۔

☆ بی بی نظیر! شک کا علاج ممکن نہیں۔ تم اگر اپنی بیوی سے کھل کر اس مسئلے پر بات کر لو تو بہتر ہے۔ ایسے مسائل بہت بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ بات کر لو اور اپنا رویہ بھی درست کر لو۔

□ صائمہ۔ UK۔

o باباجی! اس سے پہلے بھی آپ سے رابطہ کیا تھا اب پھر آپ کو انشورڈ لیٹر بھیجا مگر جواب نہ دار..... میرا مسئلہ بہت سنگین ہے بتائیے کیا کروں؟

☆ بی بی صائمہ.....! تمہارا یہ پہلا خط ہے جو مجھے ملا اور یہ دوسریں بھی اس لیے پڑھ پایا کہ یہ تم نے لفافے کے اندر لکھی تھیں۔ تم نے یقیناً ہدیہ لفافے میں رکھا جو یہاں نکال لیا گیا اور تمہارا خط پھاڑ دیا گیا۔ بتاؤ! اب میں مسئلہ جانے بغیر کیا جواب دوں؟ جانتا ہوں تم لوگ اتنی دور سے خط لکھتے ہو یقیناً جواب نہ ملنے پر کوفت ہوتی ہوگی۔

□ رحمان۔ ایبٹ آباد۔

o باباجی! اچھا ماہ کراچی آنا ہوا تھا مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ روزگار کے سلسلے میں آپ سے

وہ طیفہ لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے اب روزگار سے ہوں۔ بیٹی تنخواہ پاتے ہی رب کے بعد آپ کا شکر یہ ادا کیا۔ اللہ آپ کو اسی طرح ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی توفیق دیتا رہے۔

☆ بی بی رحمان.....! اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اور اس کے بندوں کا بہت خیال رکھنا۔ اللہ اپنے ان بندوں سے بہت محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھنا اور صدقہ خیرات بہت دینا۔

□ فریدہ۔ منڈی بہاؤ الدین

o باباجی! میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے مگر میرے گھر والے اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ باباجی! وہ لوگ پنجابی ہیں اور ہم پنجابن۔ ہم ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ ہمیں تعویذ تیار کر دیں۔ جتنا ہدیہ کہیں گے میں دوں گی۔ بس میرا کام کر دیں۔

☆ بی بی فریدہ.....! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ میرے لیے بہت سہل ہے کہ تمہارے لیے تعویذ تیار کر دوں مگر جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ بی بی جو بچے والدین کی مرضی کے خلاف جاتے ہیں ان کو قسمت میں سوائے پیچھا توڑے کے اور کچھ نہیں ملتا۔ تمہیں بھی نصیحت کروں گا کہ بکثرت استغفار پڑھو تاکہ شیطان حاوی نہ ہو سکی کو پسند کرنا جرم نہیں مگر والدین کی نافرمانی گناہ ہے۔ والدین کا تجربہ اولاد سے بہت زیادہ ہوتا ہے پھر وہ محبت بھی کرتے ہیں۔ ایسے میں ان سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ کوئی جذباتی قدم مت اٹھانا والدہ سے بات کرو اپنی پسند سے آگاہ کرو اور ان کی پابندی کی یا اعتراض کی وجہ مجھے تحریر کر دو میں تمہیں بتاؤں گا کہ درست قدم کیا ہوگا۔

□ عمرین لندن

o باباجی! میں شادی کے بعد پہلی بار یہاں آئی ہوں۔ گھر والوں سے دور ہونے کی وجہ سے دیے ہی آپ سیٹ رہتی ہوں مگر میرے سسرال والوں کا رویہ بھی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے ناصرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کماسکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دُکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دُکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا

قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

سامنے اتنی ذلت ہوتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر بچوں کا سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں۔ آپ لوگوں کو وظائف بتاتے ہیں۔ مجھے بھی بتائیں تاکہ میری زندگی میں بھی سکون آ سکے۔

☆ بی بی نجمہ! سورۃ البقرۃ کی ابتدائی 3 آیات ہر نماز کے بعد پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ کنول۔ موسیٰ خیل۔

○ باباجی! میری بڑی بہن کے ساتھ ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ جب سے اُس کی شادی ہوئی ہے تب سے وہ بہت پریشان ہے۔ مزید یہ کہ اُس کی شادی ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں اور وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اُس کے سُسرال والے پہلے ہی اُس کے خلاف تھے اب تو اور بھی زیادہ ناراض اور خلاف رہتے ہیں۔ میری بہن کا شوہر شراب پیتا ہے اور جو اچھی کھیتا ہے اور شراب پی کر گندی حرکتیں کرتا ہے اور بہن پر دوسرے ظلم بھی کرتا ہے۔ اُس نے عیاشی کے لیے دو عورتیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ وہ میری بہن کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا، لیکن چھوڑتا بھی نہیں ہے اور اُس نے زبردستی اپنی بہن سے میرے بھائی کی شادی بھی کر دے دی ہے۔ پہلے تو میرا بھائی اس شادی پر خوش تھا، لیکن اب جبکہ اُس کے گھر اولاد بھی ہونے والی ہے وہ کہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ نجائے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ برائے کرم ہماری کچھ مدد کریں اس کا حل بتائیں اور میں ہمیشہ آپ کے لیے دُعا گورہوں گی۔

☆ بی بی کنول! اللہ تمہاری بہن کو اپنی آمان میں رکھے۔ ایسے شیطان صفت آدمی کے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ نے عورت کو اختیار دیا ہے لہذا اپنا اختیار استعمال کرے اور علیحدگی اختیار کر لے یہی مناسب ہے۔

□ سندس۔ یزبان۔

○ قابل احترام باباجی! السلام علیک! باباجی! میں اس سے پہلے بھی دیگر مسائل کے سلسلے میں آپ سے رابطے میں رہ چکی ہوں مگر باباجی! اس بار میں بہت مشکل اور دُکھ سے بھرے ہوئے دل سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔

بہت عجیب ہے۔ میرے شوہر چاہے سے واپسی کے بعد کمپیوٹر پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے تعلقات بھی واجبی سے ہیں۔ باباجی! میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ میں واپس اپنے گھر آنا چاہتی ہوں۔ پلیز! میری مدد کریں۔

☆ بی بی مخمرین.....! تم نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟ ابتداء میں مشکلات آتی ہیں لوگ ایک دوسرے کو سمجھ ہی رہے ہوتے ہیں۔ صبر سے کام لو اپنے شوہر سے اس مسئلے پر بات کرو۔ بی بی! یاد رکھو تمیز اور طریقے کے دائرے میں کی گئی ہر بات اثر رکھتی ہے۔ اپنے گھر والوں کو پریشان مت کرو اور خود بھی مت ہو۔ حالات کا مقابلہ کرو اور انہیں اپنے حق میں کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار پڑھو سورۃ البقرۃ آخری رکوع پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ساجدہ۔ بھیر کنڈ مانسہرہ۔

○ باباجی! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس نے پسند کی شادی کے لیے آپ سے تعویذ مانگا تھا، لیکن آپ کے انکار پر 3 ماہ پہلے ہم دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ کچھ عرصہ تو بات چیتی رہی مگر اب کھل گئی ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ یاسر کو تو انہوں نے غائب ہی کر دیا ہے اور وہ مجھ سے بھی رابطے میں نہیں مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اپنے والدین سے رابطے میں ہے۔ باباجی! خدا کے لیے رُخ کریں۔ میں امید سے بچی ہوں۔ دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ میرے لیے کچھ کریں۔

☆ بی بی ساجدہ.....! جب تم نے خود اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ جلد بازی نقصان دہ ہوتی ہے۔ بس اپنے لیے دُعا کرو اپنے والدین سے معافی مانگو اور ہر نماز کے بعد بکثرت توبہ استغفار پڑھو یہی بس آپ حل ہے.....

□ نجمہ۔ خان پور۔

○ باباجی! میں بہت پریشان ہوں میری شادی کو 16 سال ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا مگر میں نے ایک دن بھی سکھ کا نہیں دیکھا۔ شوہر ذلیل کرتے ہیں، کوئی بات نہیں سنتے ساس بات بے بات منہ پر تھپڑ مارتی ہیں۔ باباجی! بچے بڑے ہو گئے ہیں ان کے

باباجی! میری بہن جس کا نام حشر تھا، اُس کا آٹھ مہینہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ ماشاء اللہ سے قرآن پاک پڑھتی ہوئی تھی اور دین سے بھی اُس کو بہت محبت تھی اور نعمتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ باباجی! میں جس مسئلے کی وجہ سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں وہ میرے لیے بہت مشکل اور ذہنی پریشانی کا باعث بن ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ عید کے بعد جو مہینہ آتا ہے خالی کے چاند کا اُسی مہینے میں نے تقریباً صبح کے وقت ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا، تاریخ مجھے یاد نہیں، میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں وہ ہماری بلڈنگ کے سامنے موجود ہیں اور لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہیں۔ میں اور میری امی کہتے ہیں کہ آؤ چلو دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ہم سامنے جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ بزرگ کے پاس ایک لڑکا لیٹا ہوا ہے اور وہ بزرگ اُس کی کھال اتار رہے ہیں مگر اُس لڑکے کو بالکل بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے اور پھر وہ لڑکا دیکھتے دیکھتے ہی قرآن شریف بن گیا اور قرآن شریف ایسا چمک رہا تھا جیسے چاند تو یہ دیکھ کر میں اور میری امی ہتی ہیں کہ..... ”یہ کیسے ہوا؟“ تو وہ بزرگ پیچھے مڑ کر سکرارتے ہیں اور میری امی سے کہتے ہیں کہ..... ”تو اپنی بیٹی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکے گی اور یہی مجھے بھی محرم تو آنے ہی والے ہیں۔“ اُس کے بعد فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ بابا جی! اُس دن کے بعد سے مجھے بہت ڈر لگنے لگا تھا مگر پھر میں نے سوچا شاید یہ میرا وہم ہے مگر باباجی! یہ میرا خواب بالکل سچا تھا۔ آٹھ مہینہ صبح کو میری بہن امی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی منہ ہاتھ دھویا بال بنائے ناشتا کیا، بس دس بجے اچانک اُس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ باباجی! اُس کو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی اور یہ ایسی گھبراہٹ تھی کہ میں شاید بھی بیان نہ کر سکوں۔ ہم فوراً اُسے اسپتال لے کر گئے وہیں پر اُس کا انتقال ہو گیا۔ باباجی! اس سے پہلے بھی میرے والد کو خواب میں محرم کے جلوس نظر آتے رہے ہیں۔ مجھے بھی بہن کے انتقال سے پہلے مامی جلوس نظر آتا تھا۔ کیا یہ خواب اسی حادثے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ باباجی! آپ مجھے یہ ضرور بتائیں کہ اس خواب کا اس حادثے سے کیا تعلق ہے؟ ورنہ بابا جی! مجھے لگتا ہے کہ سوچ سوچ کر میں مر جاؤں گی یا پاگل

ہو جاؤں گی۔ باباجی! میرا خدا کے بعد آپ کے سوا کوئی آسرا بھی نہیں ہے جس سے میں اپنے دل کا حال بتاؤں۔ باباجی! خدا گواہ ہے، بہن کے انتقال کے بعد لگتا کہ جیسے زندگی ختم ہو گئی ہے، صرف سانس چل رہی ہے۔ باباجی! مجھے بالکل بھی صبر نہیں آتا ہے۔ اتنا ایصالِ ثواب کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ صبر کی مگر صبر نہیں آتا، صبر کی بھی کوئی دُعا بتائیں اور باباجی! آپ اجتماعی دُعا میں میری بہن حشر جس کا انتقال ہوا ہے اُس کے لیے اور ہمارے لیے ضرور دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں صبر عطا ہو۔ میرے اس خط کا جواب اپریل کے شمارے میں ضرور شائع کیجیے گا۔ میں ایک ایک دن کن کر گزاروں گی۔ باباجی! خط لکھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔

☆ بیٹی سندس! جو دنیا میں آیا ہے اُس کو واپس بھی جانا ہے۔ بعض اوقات خوابوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کو آنے والے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ تم پریشان ہونے کی بجائے اپنی بہن کے لیے قرآن مجید پڑھ کر بخشا کرو۔ یقین کرؤ بہت سکون ملے گا۔

□ آسیہ۔ اسلام گڑھ۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی! آپ نے ہزاروں لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ باباجی! میرا مسئلہ شاید آپ کو اتنا بڑا نہ لگے مگر باباجی! میرے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے اس میں میرے ہزاروں آنسو شامل ہیں۔ برائے کرم مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے میری والدہ کا مسئلہ ہو جائے۔ باباجی! ہم نے اپنی والدہ کا بہت علاج کروایا مگر میری والدہ کو آج بھی معدے اور ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ میری والدہ کے معدے میں دُخم ہیں جو کبھی کبھی شدید درد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدہ بھی کبھی گھریلو مسائل کی وجہ سے اپنی ٹینشن لے لیتی ہیں کہ اُن کے دماغ کی کیسین پھٹنے لگی ہیں۔ پلزز! باباجی! مجھے میری والدہ کے اس مرض کا علاج بتادیں۔

☆ بیٹی آسیہ! شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اپنی والدہ سے کہو غذا میں احتیاط کریں۔ دوپہر میں دہی میں

اسپتال ملا کر ضرور رکھائیں۔ پریشان ہونے سے مسائل ختم نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھتے ہیں۔ اللہ پر اگر کامل یقین ہو تو انسان مطمئن رہتا ہے کہ دنیا میں بھیجا ہی گیا آزماتش کے لیے ہے لہذا خوشی پر خوش اور دکھ پر صبر کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی والدہ سے کہو نماز کی پابندی کریں۔ بکثرت یا ضابطی کا ورد کریں اور ہر وقت با وضو رہیں۔ کرم ہوگا۔

□ فہمیدہ حسن کھروڑکا

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میری شادی کو سات سال ہو چکے ہیں، پچھ سال کا ایک بیٹا ہے مگر اس کے بعد اولاد نہ ہوئی۔ متواتر دو بار Miscarriages جو کہ دوسرے اور تیسرے مہینوں میں ہوئے۔ اس کے بعد سات مہینے میں بیٹے کی پیدائش مگر دو دن کے بعد ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد pregnancy کے تیسرے مہینے میں پھر Miscarriage بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا مگر سارے ٹیسٹ clear ہیں۔ ڈاکٹر ز کوئی بھی وجہ بتانے سے قاصر ہیں۔ میں اپنے حالات سے بہت پریشان ہوں سوچتی ہوں کہ کہیں کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا ہے اسی لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ایک اور بات یہ کہ میرے سسرال میں بچے بہت کم ہیں بہت چاہنے کے باوجود جی مندا اور جیشانی کو ایک ایک اور بڑی نند کو دو بچے ہیں۔ اب تو سب بڑے ہو چکے ہیں۔ باباجی! آپ میری مدد فرمائیں۔ اگر کوئی اثر ہے تو کیا آپ کوئی اشارہ دے سکتے ہیں؟ اپنے علم کی رہنمائی میں کیا مجھے بتا سکتے ہیں کہ میرے یہاں اور اولاد ہوگی یا نہیں؟ مہربانی فرما کر مجھے دُعا میں اور وظائف بھیجیں۔ میں اپنا اور والدہ کا نام تو بھیج رہی ہوں اور ساتھ ہی شوہر اور اُن کی والدہ کا نام بھی بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر جلد از جلد میری مدد فرمائیں۔ میں بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆ بیٹی فہمیدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ مناسب ہوگا مجھ سے اس سلسلے میں تعویذ منگوا لو۔

□ رحیمہ۔ KPK

○ باباجی! السلام علیکم! اسلام کے بعد عرض ہے کہ بہت امید لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں کہ ہمارے گھر زیادہ لڑکیوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ہم سات

بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہم نے بھائی کی بہت کم عمری میں شادی کی ہے۔ بھائی کی بھی لڑکیاں ہیں اور ایک پانچ سال کا بیٹا ہے اور میری ایک بیٹی ہے۔ اس کی شادی کی ہے۔ ابھی بیٹے کی دولڑکیاں ہوئی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آگے کتنی لڑکیاں ہوں گی؟ باباجی! اب اللہ کے بعد آپ کا آسرا ہے کہ آپ ہمیں ایسا وظیفہ یا تعویذ دیں کہ ہمارے خاندان میں لڑکوں کی پیدائش ہو۔ پتا نہیں کہ ہم سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے کہ خدا نے ہمارا گھر لڑکیوں سے بھر دیا ہے اور ہم صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں جس میں قبائلی رواج کے مطابق خاندان میں مرد کم ہوں تو رشتے دار خالم بن جاتے ہیں اور ہر طرح کا ظلم کرتے ہیں۔ نہ لڑکیوں کا رشتہ اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں اور نہ جائداد وغیرہ بچ سکتے ہیں۔ خدارا! باباجی! ہمیں کوئی وظیفہ جلد از جلد بتائیں۔

☆ بیٹی رحیمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ اولاد میں لڑکا ہو یا لڑکی یہ تو اللہ کی رضا ہے۔ بندہ تو صرف دُعا ہی کر سکتا ہے۔ تمہیں نصیحت کروں گا، مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل تعویذ کے ساتھ ارسال کی جائے گی۔

□ صمد۔ راولپنڈی۔

○ باباجی! آج بہت بہت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نبرد آزما ہوں مگر اب بیٹی کی بیماری نے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ باباجی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے اب سے چھ ماہ پہلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک رات اچانک درواٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے ٹیسٹ ہوئے جن سے پتا چلا کہ گردے صحت کا ٹیس کر رہے لہذا Dialysis ضروری ہے۔ ہفتے میں 3 دن بیٹی کے ساتھ اسپتال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو باباجی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، پھر اب ڈاکٹر Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ اُن کے مطابق گردے آہستہ آہستہ ناکارہ ہو رہے ہیں اور اب تک جو بھی علاج ہوا ہے اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا لہذا گردے کی پیوند کاری ضروری ہے۔ باباجی! اس بات نے ہمارے ہوش اُڑا دیے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اس منجگہ ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ضمانت

ذُعا کرو۔ اللہ بہتر اسباب پیدا کرے گا۔

□ فیصل - پاک پن

○ بابا جان! بہت پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہیں! جھوٹے کس میں مجھے پھنسا دیا تھا۔ غریب آدمی ہوں پولیس اٹھا کر لے گئی اور ابھی تک عدالت میں بھی پیش نہیں کیا۔ خدا کے لیے مجھے پر رحم کریں۔ یہ لوگ مجھ سے پیسا مانگتے ہیں! کہاں سے لاؤں؟ بیوی کو بھی تھانے آنے سے منع کر دیا ہے۔ بابا جان! ذُعا کریں کہ میری پریشانی ختم ہوں۔

☆ بیٹی فیصل! تم بھی جانتے ہو کہ تم اپنی غلطی کی وجہ سے مشکل میں ہو۔ کسی پر اتنا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ آج کل کا دور ایسا نہیں۔ لوگ مدد کرنے والے کو ہی زیادہ دکھ دیتے ہیں۔ بہر حال میں تمہارے لیے خصوصی ذُعا کروں گا۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ بس نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یسین ضرور پڑھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔ (آمین!)

□ اب - کراچی

○ بزرگ! میں نہیں جانتی کہ آپ میرے خط کا جواب بھی دیں گے یا نہیں؟ میں غیر مذہب سے ہوں جیسا میرے نام سے ظاہر ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔ تھوڑا سا یقین ہے کہ آپ مجھے اچھوت نہیں سمجھیں گے۔ مجھے آپ کی تیار کردہ دوا چاہیے۔ میرا چہرہ دانوں کی وجہ سے بہت خراب ہو گیا ہے۔ اگر دوا ارسال کرنے کا طریقہ کار بتا دیں تو بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆ بیٹی!..... اسب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ دوا میں تیار کردہ دواں گھر میں مجھے جوانی لفافہ ضرور ارسال کرو۔ دوا مستقل مزاجی سے استعمال کرنی ہوگی۔ ہمیشہ اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا کرو۔ بے شک وہ بہت مہربان ہے۔

□ قرأت - حویلیاں

☆ بیٹی قرأت! تمہارا مسئلہ اتنی شدید نوعیت کا نہیں ہے۔ تم نے سوچ سوچ کر اپنے آپ کو بیمار کر لیا ہے۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو ہمراہ دو کھجور ضرور کھاؤ۔ بکثرت یا شافعی پڑھا کرو۔ انشاء

نہیں۔ بابا جان! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے مجرہ ہو جائے اور میری بیٹی پہلے جیسی صحت مند ہو جائے۔ بابا جان! اس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں مجھ سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اس ملک ماں کو کیسے سمجھاؤں؟ رحم کیجیے اور اس مشکل وقت میں مدد بھی۔

☆ بیٹی! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا مگر بیٹے! ہمت سے اس آزمائش کا سامنا کرو۔ تمہیں اپنے اندر ہمت پیدا کرنی ہوگی ورنہ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بیٹے! بے شک میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ان رپورٹوں کو حرف آخر سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بے نیاز ہے وہ جب چاہے جسے چاہے نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو بچی کا علاج کرواؤ۔ اس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ ذُعا اور دوا دونوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اسباب بھی پیدا کرے گا۔ بس اپنا یقین پختہ رکھو۔ بعد نماز فجر اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دم کرو اور یہ پانی دو دو گھونٹ بیٹی کو پلاؤ۔ میں بھی خصوصی ذُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں! انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ روشنائے - پٹنڈی

○ بابا جان! آپ کے بارے میں ”بچی کہانیاں“ میں پڑھا دل چاہا! اپنا مسئلہ آپ کو بیان کروں۔ والد کچھ کرتے نہیں! میں نے DSC کیا ہے اور مزید آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ ہم پر قرضہ بھی بہت ہے۔ بھائی کوئی ہے نہیں لہذا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔ آپ مدد کریں اللہ کے نیک بندے ہیں اللہ آپ کی ضرورت ہے۔

☆ بیٹی روشنائے! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ کیا جن کے بھائی نہیں ہوتے، ان کا مستقبل نہیں ہوتا؟ بیٹی!..... اللہ نے عورت کو بہت طاقت و رہنمائی دی ہے۔ وہ بیک وقت گھر بھی سنبھالتی ہے اور باہر کے معاملات بھی دیکھتی ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 تنبیح یا تحفۃ القانم کی پڑھو اور

اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اللہ ضرور مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

□ بشری - کوہاٹ

☆ بیٹی بشری! مسلمان ہونے کے ناطے تمہیں قرآن پاک پڑھنا ضرور آنا چاہیے اور اس کے لیے کوئی خاص عمر نہیں ہوتی۔ بہر حال تم تعویذ چاہ رہی ہو اس کے لیے مجھے براہ راست خط لکھو۔

□ شمرین - کراچی

☆ بیٹی شمرین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور روزہ شریف بہت پڑھو۔ معاملات میں خاموشی رکھو اور ہر نماز کے بعد یا خافط یا خفیط کا بکثرت ورد کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ بیٹی! ابھی بہت کم وقت گزرا ہے لہذا صبر اور مستقل مزاجی سے معاملات کو سنبھالو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ حدیقہ - شادی وال

☆ بیٹی حدیقہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور روزہ شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد ایک

بار سورۃ رحمن پڑھو اور ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھ چہرے پر پھیر لو۔ مٹی سوئیں انسان کو کہیں کائیں چھوڑیں۔ تکلیف بے شک تمہیں ہے مگر اس کا علاج کرو اور لوگوں سے ڈر کی تو جیو گی کیسے؟ ہمارے چاروں طرف لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔ بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو اور دل لگا کر عبادت کرو اور صابروں کا رہو۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ نگہت خان - مانسہرہ

☆ بیٹی نگہت! نماز کی پابندی رکھو۔ انشاء اللہ خالی خود بخود تمہاری غیبی امداد کرے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔ مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو وہ مہربان آقا ہے۔

□ حیرا - سکھر

☆ بیٹی حیرا! تمہارا خط ملا پڑھ کر اچھا لگا کہ تم دلوں کی لکھنؤ پر عمل کرتی ہو۔ تمہیں حسبنا اللہ ونعم الوکیل والا وظیفہ کرنا ہے۔ کوشش کرو کہ وظیفہ نامکمل نہ رہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر شروع کرو اور بہر حال میں مکمل کرو۔

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ اسب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خور سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکلیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوانی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ہائپر پارک

ذی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

قدرت کے رنگ

کچھ لوگوں کا صبر قدرت کو اس قدر پسند آ جاتا ہے کہ وہ انہیں اپنی آزمائشوں کے لیے چن لیتی ہے اور آزمائش ان کا مقدر ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ صابرین میں سے ہیں اور قدرت کو بھی مایوس نہیں کرتے۔

☆ ذات باری تعالیٰ بیکراں ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میں نے انسان کو محبت سے تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ اسے اپنے لیے بندوں سے محبت کرنے والے پسند ہیں۔

☆ شاہراہ حیات One way ہے۔ اس پر ہم صرف آگے جاسکتے ہیں واپس نہیں مڑ سکتے۔ اس شاہراہ پر بہت ایکسپڈنٹ ہوتے ہیں۔ بڑی جوش گئی ہیں اور جب ان حادثات سے ہم زندگی کو سمجھنے لگتے ہیں تو ہمیں بوڑھا بنا کر ریاز کر دیا جاتا ہے۔

☆ کنواں بھی لٹایاں بھر بھر کر ڈالنے سے نہیں بھرتا بالکل اسی طرح تم کسی انسان کے دل میں کوئی خوب صورت جذبہ بھی نہیں چگا سکتے جب تک اس جذبے کی کوپیل اس کے اندر پہلے سے موجود نہ ہو۔

☆ حسن انتخاب: ریاض حسین تبسم۔ فیصل آباد

ایٹمی دھماکے

☆ 16 جنوری 1945ء کو امریکہ نے پہلا ایٹمی دھماکا صحرائے میکسیکو میں کیا۔

☆ 14 جولائی 1949ء کو روس نے پہلا ایٹمی دھماکا ساہیر یاشین کیا۔

انمول موتی

اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے۔ ”اے انسان! مجھ سے سوال کر کے تو دیکھ، بخشش کی حد نہ کر دوں تو کہنا۔ میرے لیے بے قرار ہو کر تو دیکھ قرار کی حد نہ کر دوں تو کہنا۔ مجھے رب مان کے تو دیکھ سب سے زیادہ بے نیاز نہ کر دوں تو کہنا۔ میرے خوف سے آنسو بہا کر تو دیکھ مغفرت کا دریائے بہاؤں تو کہنا۔ صرف میرا ہو کر تو دیکھ ہر کسی کو تیرا نہ کر دوں تو کہنا۔

مرسلہ: خضر حیات۔ روڈہ قفل

خوب صورت باتیں

☆ تمام دنیا محوم کر دیکھ لومفلس کے لیے کوئی بھی دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

☆ خاموشی دانشمندی کی علامت ہے تو سہی لیکن کبھی کبھی اس سے حماقت کا ثبوت ملتا ہے۔

☆ کسی سے کتاب مستعار لینے کے بعد مشکل سے واپس ملتی ہے۔

☆ اپنے متعلق آپ کچھ بھی نہ کہیے یہ کام آپ کے جانے کے بعد خود ہی ہو جائے گا۔

☆ عیاری چھوٹے کمل کی مانند ہے کہ سر چھپاؤ تو پیر بنے ہو جائیں گے۔

☆ محبت کے نشے میں ”مرد“ اور ”عورت“ ایک دوسرے کے کردار کا جائزہ نہیں لے سکتے۔

☆ حسن انتخاب: سمرقہت غفار۔ کراچی

☆ 13 اکتوبر 1952ء کو فرانس نے پہلا ایٹمی دھماکا صحرائے افریقہ میں کیا۔

☆ 16 اگست 1952ء کو ہیروشیما پر صبح 8 بجے 3 ہزار فٹ کی بلندی سے امریکی طیارے نے بم گرایا۔

☆ 19 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر 11 بج کر 2 منٹ پر امریکہ نے دوسرا ایٹم بم گرایا۔

☆ 28 مئی 1998ء کو پاکستان نے سہ پہر 3 بج کر 16 منٹ پر 15 ایٹمی دھماکے صوبہ بلوچستان میں چاغی کے مقام پر کیے۔

مرسلہ: نور العین۔ اسلام آباد

غزل

سہارے ڈھونڈنے نکلا سہارے کھو گئے میرے لب ساحل جو پہنچا تو کنارے کھو گئے میرے سنبھالے تو بڑے آئے چلے بھی ساتھ میرے جو مجھے بھی آرزو جن کی وہ پیارے کھو گئے میرے گیا تھا آسمان پر بھی مقدر ڈھونڈنے لیکن چھپا کر چاند منہ روپا ستارے کھو گئے میرے چہن اب خوب صورت بھی مرے کس کام آئے گا تمہی چاہت جن کی آنکھوں کو نظارے کھو گئے میرے کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ میری گزری جوانی کو جوان جذبے جوانی میں ہی سارے کھو گئے میرے غموں نے چھین کر قاسم میرا بچپن مٹا ڈالا ابھی تھے کھیلنے کے دن غبارے کھو گئے میرے شاعر: محمد قاسم خان بلوچ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

افسانچے

☆ میں اسے آج تک نہیں بھولی، بہت یاد آتا ہے میرے ہی ہاتھوں میں تو اس نے جان دی تھی۔ کیسے تڑپی تھی میں، جب وہ آخری سانسوں میں تھا، کس قدر بے بسی تھی، میری اس کو پہچانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی اور میں روئے چلی جا رہی تھی۔ آنسو تھے، کہہ سکتا تھا کہ نام نہ لیتے تھے بھگی بندھ گئی تھی روتے روتے۔

☆ میں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا کہ شاید چند سانسیں اسے جینے کو اور مل جائیں وہ لاچار میری طرف تک رہا تھا۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ جس نے

☆ تمہیں مجھ سے الگ کر دیا۔ تم بہت دور چلے گئے۔ مجھ سے کہہ سکتے ہو گیا تھا۔ میں اسے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی کہ جس سے تم پھسلے پھسلے زمین پہ ایک بے جان وجود کی طرح گر گئے تھے۔ میں تمہیں یوں گھور رہی تھی کہ جیسے میری نظروں کی تیش سے تم جاگ جاؤ گے مگر نہیں شاید یہ میری خام خیالی تھی۔ موت نے تمہارے وجود کو برف کر دیا تھا۔ اور میں تمہارے قریب زمین پہ بیٹھی کانپ رہی تھی۔ میرے آنسو تمہیں بھگور رہے تھے۔ مگر تم بے حس و حرکت پڑے تھے۔ موت اتنی کر ہناک ہوئی ہے تمہیں دیکھ کر احساس ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ تمہاری موت کے بعد میں نے دوسرا ”طوطا“ خرید لیا۔ مگر وہ تم تو نہیں ہو سکتے نا، وہ بھی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا میرے چارے طوطے۔

☆ زور قلم۔ عظمیٰ گھور۔ اسلام آباد

ایک لمحہ

☆ ایک لمحہ ہوتا ہے احساس کو جگانے کے لیے۔ ایک لمحہ ہی بعض دفعہ کافی ہوتا ہے سنبھلنے کے لیے اور ایک لمحہ ہی جہت ہے۔ باتال میں لے جانے کے لیے۔ بے شمار لمحوں میں سے ایک لمحے کا غور رہی اللہ کے ہاں آپ کی پکڑ کر سکتا ہے اور بے شمار لمحوں میں سے ایک لمحے کی توبہ آپ کو رب کی بارگاہ میں معتبر کر سکتی ہے۔

☆ از قلم: فرح انیس۔ کراچی

اچھی باتیں

☆ محبت سب سے کرومگر اعتماد چند لوگوں پر کیا جائے۔

☆ کسی کو اس کی ذات پر پرانے لباس کی وجہ سے حقیر مت سمجھو اس لیے کہ تیرا رب اور اس کا رب ایک ہے۔

☆ جب تیرا دل گناہوں کے کاموں میں لگنا شروع ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیرا رب تم سے ناراض ہے۔

☆ انسان کا نقصان مال اور جان کا چلا جانا نہیں بلکہ انسان کا سب سے بڑا نقصان کسی نظروں سے گر جانا ہے۔

☆ مہمان کے آگے کھانا رکھنا ہے مروتی ہے اور
حد سے زیادہ کھانا رکھنا تکبر ہے۔
کنول جی تھا۔ مگھو منڈی، پورے والا

غزل

اک عجب سا اضطراب مجھ پہ طاری ہے
سانس لینا بھی لگتا اب تو بھاری ہے
یہ محبت تو گزرے دنوں کی بات ٹھہری
تماشا بنی زندگی ساری کی ساری ہے
آج وہ ملتا ہے اک اجنبی کی طرح
جس کے وصل میں یہ عمر گزاری ہے
کہاں کا عشق یہ پیار محبت پیارے
اک فسانہ بنی اب تو یہ دلداری ہے
عجب یہ بات ٹھہری بھول نہ پائے اُسے
ناجانے یہ عشق کی کسی خماری ہے
بھول جانے میں مجھے شاید اسی کی مرضی تھی
پر کیا کروں گئی ہر اک ادا اس کی پیاری ہے
پچھتا اے صاحب اہل حسن کی مگر سے
تابش کی تم سے یہ عرض گزاری ہے
شاعر: ڈاکٹر علی حسین دالش۔ چشتیان

پہلیاں

پہلیاں ریشہ پر دشمن جانتا ہیں اور معدنی نمکیات کا بہترین
ذریعہ ہوتی ہیں۔ ان میں اگر ریشہ بہت ہوتا ہے تو پختائی بھی
بہت کم ہوتی ہے۔ زیادہ ریشہ اور کم پختائی والی پہلیاں خاص طور
پر مقعد کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان میں موجود ریشہ
آنکھوں سے رسولیوں کا سبب بننے والے ذہریلے مادوں کو سیٹ
کر جسم سے خارج کر دیتا ہے۔ اس ریشہ کا کل تیز ہوتا ہے اس
طرح جسم بھی ان مادوں سے جلد نجات پا کر سرطان سے محفوظ ہو
جاتا ہے۔ دنیا بھر میں پھلیوں کی کئی اقسام پیدا ہوتی ہیں۔
ہمارے ملک میں سبز لوبیا، پنے، گوار، چلی، فرنیج، بین (فراس بین)
کی کوئی کمی نہیں انہیں ضرور کھانا چاہیے۔

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

مزاحمت

دیکھنے کی نیکس لینے سے پہلے موکل سے پوچھا۔
”تمہیں کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے۔“

”سرکاری کام میں مداخلت کی تھی۔“
”تم نے کس کام میں مداخلت کی تھی۔“
”انگلینڈ صاحب مجھے گرفتار کرنا چاہتے تھے میں نے
مزاحمت کی تھی۔“
”کس طرح کی مزاحمت کی تھی۔ مار پیٹ یا بحث و
مباحثہ۔“

”نہ مار پیٹ نہ بحث و مباحثہ۔ بس وہ بیس ہزار ماگ
رہے تھے۔ میں نے پانچ ہزار دینے کی کوشش کی تھی۔“
مرسلہ: عمر العباس۔ کراچی

سادگی

صبح دودھ والے نے کھٹی بجائی تو شوہر کی
آنکھ کھل گئی۔ بیوی گہری نیند سو رہی تھی اس کے
شوہر نے سردی کی وجہ سے بیوی کی شال اچھی
طرح اوڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ دودھ والے
سے دودھ لے کر وہ جو بیوی مڑا، پیچھے سے اسے
دودھ والے کی آواز آئی۔ ”کیا بات ہے
ڈارلنگ، کیا آج کچھ ناراض ہو؟“
شوہر ہنستا ہوا مسہری پر جا لیٹا۔ بیوی نے نیند
بھری آواز میں پوچھا۔ ”ہنس کیوں رہے ہو؟“

شوہر نے جواب دیا۔ ”بھی بڑے مزے کی بات
ہوئی، میں تمہاری شال اوڑھ کر دودھ والے سے دودھ
لینے گیا تو اس نے پیار سے مجھے ڈارلنگ پکارا۔ میرا
خیال ہے اس کی بیوی کی شال بھی تمہاری جیسی ہے۔“
مرسلہ: محمد جواد۔ چک شہزاد

غلطی

ایک نوجوان نے اپنے دوست کو بتایا۔ ”لو بھئی
وہ حادثہ ہو ہی گیا، میری غریبی کی وجہ سے سرین نے
میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔“

دوست نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے اپنے
دولت مند چچا کے بارے میں نہیں بتایا یا جن
کے مرنے کے بعد ان کی ساری جائیداد تمہیں
ہی ملے گی؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”ہاں، بتلایا تھا اور اب
سرین میری چچی ہے۔“
مرسلہ: عامر بشیر۔ کراچی

شرط

ایک ہوٹل میں ایک صاحب نے اچانک اعلان
کیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تیس چکن سکے
ایک ساتھ کھائے گا تو وہ اسے پانچ ہزار روپے انعام
میں دیں گے۔ ہوٹل میں ایک سردار جی بھی بیٹھے
ہوئے تھے وہ یہ شرط سنتے ہی باہر چلے گئے۔ کافی دیر
بعد وہ واپس آئے اور ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔
”کیا وہ تیس سکے کھانے والی شرط ابھی تک
برقرار ہے؟ میں اس میں حصہ لینا چاہتا ہوں؟“
”ہاں، وہ شرط تو برقرار ہے لیکن آپ اچانک
کہاں چلے گئے تھے؟“

”میں دراصل ساتھ والے ہوٹل میں تیس سکے
کھانے گیا تھا تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں شرط
پوری کر سکتا ہوں یا نہیں؟“

مرسلہ: شاہناہ احمد۔ کھاریاں

گھریلو ٹکے

☆ اکثر لوگوں کی کام کرتے وقت یا زیادہ چلتے
پھرتے ہوئے سانس پھولنے لگتی ہے ان کے لیے
آزمودہ نسخہ ہے کہ کریلے کے پانی میں تھوڑا سا شہد
ملا کر کھالیں، سانس نہیں پھولے گی۔

☆ چکی پیاز کھانے سے پیپٹ کے کیڑے
مر جاتے ہیں بشرط متواتر چار پانچ روز متواتر
استعمال کی جائے۔

☆ دو لیموں کے رس میں ڈیڑھ پاؤ کھولتا ہوا
پانی ڈالیں اور اسے حسب ذائقہ شہد سے میٹھا
گر کے رات کو سوتے وقت پی لیں۔ زکام میں
اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

☆ دانت کے درد کے لیے لوگ کا سفوف ایک

چھوٹا چچہ ایک لیموں کے رس میں خوب ملا کر دانتوں
پر ملنے سے درد دور ہو جاتا ہے۔
☆ ہر ادھنیا سوکھنے سے چھینکیں آنا بند
ہو جاتی ہیں۔

مرسلہ: مسز عظمت مبارک، کراچی

نیکی

ایک منیجر نے بچے سے پوچھا۔ ”اس ہفتے تم نے
کوئی نیکی کا کام کیا؟“
بچے نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، کل میں نے
ایک موٹے آدمی کو بس پکڑنے کے لیے دوڑتے
ہوئے دیکھا، میں نے اپنا کتا اس کے پیچھے دوڑا دیا،
بس پھر وہ شخص اتنی تیزی سے بھاگا کہ کافی دور جانی
بس پر وہ چڑھ ہی گیا ورنہ بس اس سے مس ہو جاتی۔“
مرسلہ: رمشا عارف۔ حیدر آباد

اقوال زریں

☆ سب کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا ایک
طرح کی ملامت ہے۔ (حضرت علیؓ)

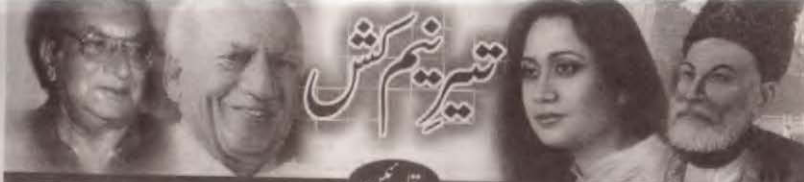
☆ جو شخص تم سے دوسروں کے عیوب بیان کرتا
ہے وہ یقیناً دوسروں کے سامنے تمہاری برائی بھی کرتا
ہوگا۔ (حضرت حسن بصریؓ)

☆ تین شخص / اشخاص تین باتوں سے پہچانے
جاتے ہیں / دانا غصے کے وقت، بہادر لڑائی کے وقت
اور دوست ضرورت کے وقت۔ (حضرت لقمان)

☆ محبت میں یہ قیاحت ہوتی ہے کہ جس سے
محبت کی جائے اسے خود سے جدا کرتے وقت بہت
تکلیف ہوتی ہے۔ (خلیل جبران)

☆ اپنے خدا سے آشنا ہو کیونکہ جب مسافر کسی
شہر میں پہنچتا ہے تو آشنا کی موجودگی اسے بہادر اور
نڈر بنا دیتی ہے۔ (کفیوشس)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو بے ذوقی ہے۔ (ایڈورڈ ہیری)
مرسلہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا



تیسرے نمبر کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شہر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

نعیم اکبر..... قصور

جگر ہو جائے گا چھلنی یہ آنکھیں خون روئیں گی
وہی بے فیض لوگوں سے نبھا کر کچھ نہیں ملتا
نگہت منیر..... ادا کا ڈھ
کاش کہ تیری آنکھوں کا پانی بن جاؤں فراز
تو کبھی نہ روئے مجھے کھونے کے ڈر سے
فہد غفار..... کراچی

نہ ہم رہے نہ خوابوں کی زندگی ہی رہی
گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی
حریم شوق کا یہ عالم بتائیں کیا تم کو
حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی
ارباب حسین..... کراچی
وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقین
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے
شجاع حسین..... ٹنڈو آدم

کچھ بتا اے مامی راتوں کی دھندلی چاندنی
بھولنے والوں کو آخر کس طرح یاد آؤں میں؟
نور فاطمہ..... ڈیرہ الہ یار
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو پل دیتے آلات
جمیلہ کنول..... کراچی

رائیگاں نہیں جاتی دل پہ جو گزرتی ہے
آدنی بکھرتا ہے شاعری نکھرتی ہے

ایم افضل آزاد..... ساہیوال

جب بکھیرتا ہے کوئی خواب خزاں آنکھوں میں
اشک بن جاتا ہے زیر آب خزاں آنکھوں میں
نائلہ غففر..... کراچی
اس نے کہا کہ ساتھ کہاں تک نبھاؤ گے؟
میں نے کہا کہ جتنی یہ سانسوں کی تار ہے
اس نے کہا کہ مجھ کو یقین آئے کس طرح؟
میں نے کہا کہ نام مرا اعتبار ہے

عامر جاوید..... ملتان

سی صحرا کو پیاسا چھوڑ جاتا ہے کبھی دریا
بھی پیاسے کو دریا کی سخاوت یاد رہتی ہے
فریحہ ناز..... لاہور
پلکوں کو بھگوتے کے زمانے نہیں آتے
لوگ بہت یاد پرانے نہیں آتے
تنہائی سے اکٹا کر طے آتے ہیں ورنہ
ہم زخمِ زمانے کو دکھانے نہیں آتے

یاسمین..... کوٹری

بیتے رشتے تلاش کرتی ہے
خوشبو غنچے تلاش کرتی ہے
جب گزرتی ہے اس گلی سے صبا
خط کے پرزے تلاش کرتی ہے
کامران احمد..... ملکی

رات کی جیب سے نکالی ہے
رات بھر چاندنی اچھالی ہے
پھر ہوا سوختی ہے دروازے
پھر کوئی بات ہونے والی ہے

اپنے ہی معاشرے میں
’یوں‘ اجنبیوں کی طرح جیے گی؟
شاعرہ: روینہ ناز رونی۔ رضا آباد، فیصل آباد

اظہار

ایک سردار راجی کو ہسپتال کی نرس سے محبت ہو گئی۔
جب وہ ہسپتال سے دسپتال ہونے لگے تو سوچا کہ جاتے
وقت اظہار محبت کر ہی دیتا چاہیے سو وہ نرس کے پاس
گئے اور بڑی ہمت کر کے بولے۔ ”آئی لو یوسر“
مرسلہ: محمود علی۔ جہلم

بے کار

ایک امریکی پالتو جانوروں کی دکان پر گیا اور بولا۔
”یہ کتابیں نے ہزار ڈالر میں خریدا تھا لیکن اسے آپ سو
ڈالر میں خرید لیں۔“
”کیوں کیا اس کتے میں کوئی عیب ہے؟“ دکان
دار نے شک سے پوچھا۔

”جی نہیں، اصل میں کچھ دنوں پہلے اس نے میری ساس کو
کات لیا تھا جس کی وجہ سے وہ مر گئیں۔ اب اس کے بعد اس
کتے کا کوئی کام ہی نہیں رہا۔ میرے لیے بے کار ہے۔“
مرسلہ: نبیلہ ویم۔ میر پور خاص

بے بسی

چڑیا گھر کی سیر کے دوران ایک صاحب نے دیکھا
کہ چڑیا گھر کا ایک ملازم خاموشی سے بیٹھا آنسو بہا رہا
ہے۔ ان صاحب نے اس سے پوچھا۔ ”بھائی! ایسے
کیوں رو رہے ہو؟“

”آج ہمارے چڑیا گھر کا ایک ہاتھی مر گیا
ہے۔“ ملازم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”اوہو! بڑا افسوس ہوا! یقیناً تمہیں اس سے بہت
محبت ہوگی۔“
”ارے صاحب! محبت گئی بھڑا میں! مجھے تو اس کی قبر
کھودنے کا حکم ملا ہے۔“ ملازم روتے ہوئے بولا۔
مرسلہ: حنا لطیف۔ کراچی

سکون قلب

سکون قلب کسی فارمولے کا نام نہیں فارمولے
تو بچوں کے لیے ہوتے ہیں کہ مٹھائی بنائی ہے لوکھا
لیکن یہ سکون قلب ہے۔ کسی کا سکون قلب برباد نہ
کرؤ! سکون قلب مل جائے گا۔ پیسوں سے محبت نہ کیا
کرؤ! سکون قلب مل جائے گا۔ دُعا پر بھی ضد نہ کرؤ!
نا منظور دُعا کا بھی اتنا ہی احترام کرنا جتنا منظور کا۔ اگر
یہ فرق سمجھ میں نہیں آتا، سکون قلب نہیں ملے گا۔ اللہ
تعالیٰ کی جانب سے جو ہو رہا ہے اگر آپ اس کو پسند
کر کے چلنا شروع ہو جاؤ، سکون قلب مل جائے گا۔
واصف علی واصف کی ”گفتگو“ سے نادیہ
طارق۔ ساہیوال کا انتخاب

بچ

چھوٹا بچہ باہر سے گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں سو
کا نوٹ تھا۔ باپ نے فوراً پوچھا۔ ”یہ تمہارے پاس
کہاں سے آیا؟“
”یہ مجھے گلی میں پڑا ملا ہے۔“ بچے نے بتلایا۔
”تم بچ بول رہے ہو نا؟“ باپ نے شکی لہجے
میں پوچھا۔

”ہاں ابو! آپ خود جا کر دیکھ لیں! ایک آدمی
ابھی تک اسے سڑک پر ڈھونڈ رہا ہے۔“
مرسلہ: شملہ اختر۔ لاہور۔

حوا کی بیٹی

یہاں حوا کی بیٹی
نا جانے ذہن کی سلاخیوں پہ
کیوں نت نئے اور نامکمل خواب غنی رہتی ہے
یہ مشرقی روایات کی پابند
اور کوئی ذات
کیوں خود فریبی کے جال میں مقید ہے!
یہ معصوم اور مظلوم ہستی
آخر کب تک

سے میکدے میں نہیں ہے تو کیا ہوا ساقی
ہمیں نظر سے پلاؤ کہ رات جاتی ہے
معاویہ عمروٹو..... ہڑپہ
موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو
عذیر شفیق..... اسلام آباد

مرا ذوق خریداری ہے اک جس گراں مایہ
کبھی پھولوں کا شیدائی، کبھی کانٹوں کا بنجارہ
نسیم شفیق..... اسلام آباد

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن، کچھ تو ادھر بھی
فرح عالم..... اسلام آباد

دریا کو نہیں خیال اپنا
پانی میں اک آسمان بھی ہے
ایم سعید انور سعید..... لاہور

بات کرتے ہیں وہ اجالوں کی
جن سے روشن دیا نہیں ہوتا
حمیمین جو نیچو..... خیر پور ناٹھن شاہ

کناہہ دوسرا دریا کا جیسے
وہ سا بھی ہے مگر محرم نہیں ہے
مبشر عالم..... سکھر

منتظر کہاں ہوں میں اب کسی بھی ساتھی کا
اپنے آپ سے ہی اب دوستی بلا کی ہے
☆☆☆☆

عابدہ بیگم..... سیالکوٹ
اک قبیلے میں تھا سردار کا بیٹا شاعر
اس قبیلے کو کبھی خون نہ بہاتے دیکھا
مصطفیٰ خان..... جہلم

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا
اشعر شقیق..... کراچی

ہو برائے شام بجران لب ناز سے فروزاں
کوئی ایک شمع پیاں کوئی اک چراغ وعدہ
عارف خان..... ایبٹ آباد

ساتھ بیٹھے ہیں جو دلدار نہ سمجھے جائیں
بس شناسا ہیں مرے یار نہ سمجھے جائیں
شازیہ رضوی..... کراچی

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے
شعبان کھوسہ..... کوئٹہ

تلاش منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورت اعتبار بن کر
نذیر جاوید..... سرگودھا

اک عمر کی جدائی میرا نصیب کر کے
وہ تو چلا گیا ہے باتیں عجیب کر کے
ایم وکیل عامر جٹ..... ساہیوال

نقاب رخ سے ہٹاؤ کہ رات جاتی ہے
کوئی تو بات سناؤ کہ رات جاتی ہے

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے

کوپن برائے

تیرنیم
کش

مارچ 2016ء

نام:

پتہ:

سچی کہانیاں 258